[illegible]
دسمبر [illegible] ۱۹۵۰ء

جلد [illegible]
[illegible]

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت فی پرچہ (۸؍)

شمارہ [illegible]

حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصول اسلام کو ان حالات پر منطبق کرکے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب و سنت پر ہوتی اور جس میں رفتار زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں، مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء اور مشائخ ہیں، انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچ سو برس سے اسلام کے لیے تن تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف ڈھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب ڈھکیل کر رہیں گے۔ دوسری طرف جدت پسند حضرات ہیں اُس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے، مسلمانوں کے سامنے اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی، اور ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ اور انقرہ سے اتری ہوئی وحی میں ہے۔ حالانکہ بیچارے اتاترک اس کے متبعین کا حال یہ ہے کہ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے، تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اس پر کئے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات

جنگ دوسرے مذاہب میں | جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد انگریزی (صہ ۱ـ) صہ ۱۲ سکہ عثمانیہ غیر مجلد (للعہ) انگریزی چار روپیہ بارہ آنے سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۴ھ۔ جلد ۷ عدد (۱)

اعلان

اسلام کی تعلیم کو اس کی صحیح فطری صورت میں حکمت اور موعظت حسنہ کے ساتھ پھیلانے کی کوشش "ترجمان القرآن" میں کی جا رہی ہے اس کا دائرہ وسیع کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ دوسری زبانوں میں بھی اسی طرز کے رسالے جاری کیے جائیں خصوصیت کے ساتھ انگریزی زبان میں ایسے ایک رسالے کی اشاعت بہت ضروری ہے تاکہ دنیائے اسلام کی نئی نسلوں اور مغربی قوموں تک بھی قرآن مجید کی ہدایت کو ایک بین الاقوامی زبان کے ذریعہ سے پہنچایا جا سکے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کام کے لیے ہمارے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب کو آمادہ کر دیا ہے جو انگریزی زبان میں ایک اعلیٰ درجہ کے انشاپرداز ہونے کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی ادارت میں عنقریب (Voice of Islam) کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہونے والا ہے جس کے مقاصد اور اصول وہی ہوں گے جو ترجمان القرآن کے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی قابلیت سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی ادارت میں یہ رسالہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ادبی حیثیت سے بھی انگریزی صحافت میں ایک بلند مرتبہ حاصل کرے گا اور اتنا باوقعت ہوگا۔ کہ اس کے ذریعہ سے جن خیالات اور علوم کی اشاعت کی جائے گی وہ انگریزی خواں پبلک کے دماغوں پر قوت اور وزن کے ساتھ اثر انداز ہو سکیں گے۔

امید ہے کہ آیندہ ماہ شوال (جنوری سنہ ۱۹۳۶ء) تک اس کی اشاعت شروع ہو جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن جن مقاصد کے لیے جاری کیا گیا ہے، وہ محض ایک اردو رسالہ کی اشاعت سے پورے نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے کم از کم ایک بین الاقوامی زبان کو ذریعہ تبلیغ و اشاعت بنانا ضروری ہے تاکہ ایک طرف دنیائے اسلام کے مختلف اقطاع میں، اور دوسری طرف غیر مسلم قوموں میں ہم اپنی دعوت کو پھیلا سکیں۔ جس مرض کا علاج ہم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ صرف ہندوستان اور ہندوستان کے بھی صرف اردو دان لوگوں تک محدود نہیں، بلکہ وہ ایک وبائے عام ہے جو ساری دنیا میں پھیل گئی ہے، اور اس نے مسلمانوں کی بھی اکثر و بیشتر قوموں کو گھیر لیا ہے۔ ایک بے چینی ہے جس سے نوع بشری کی روح مضطرب ہو رہی ہے۔ ایک تشنگی ہے جس کو سارا عالم انسانی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے۔ جو غیر مسلم ہیں وہ تو سرے سے جانتے ہی نہیں کہ وہ چشمۂ آب حیوان کہاں ہے جو ان کی پیاس کو بجھا سکتا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں وہ اس کو جانتے ہیں، مگر اس کو پیتے نہیں یا پی نہیں سکتے۔ اس کے ساقی اصل منبع کو چھوڑ کر ندیوں اور نالوں پر معتکف ہو گئے۔ اس کے دہانے کو جہالت کے پتھروں سے پاٹ دیا گیا۔ اس کے بجائے گندے اور زہریلے پانی کی نہروں کا ایک جال تمام روئے زمین پر پھیل گیا جس کو بعض نادان اب تک آب حیات سمجھ رہے ہیں اور بہت سے دانا محض اس مجبوری سے پیے جا رہے ہیں کہ ان کو آب حیات کا پتہ معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں ایک دو نہیں، بہت سے ایسے منادیوں کی ضرورت ہے جو اطراف

و اکناف عالم میں خدا کے بھٹکے ہوے بندوں کو اس چشمے کی طرف بلائیں جس کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کی سیرابی کے لیے چھوڑ گئے ہیں، اور صرف بلانے ہی پر اکتفا نہ کریں، بلکہ جو درماندگان راہ اس تک آنے کی قوت نہیں رکھتے ان کے پاس خود اس کا پانی لے کر پہنچ جائیں۔

مشرق ہو یا مغرب، مسلمان ہوں یا غیر مسلم بلا استثنا سب ایک ہی مصیبت میں گرفتار ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ان پر ایک ایسی تہذیب مسلط ہو گئی ہے جس نے سراسر مادیت کی آغوش میں پرورش پائی ہے! اس کی حکمت نظری و حکمت عملی دونوں کی عمارت غلط بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے۔ اس کا فلسفہ، اس کا سائنس، اس کے اخلاق، اس کی معیشت، اس کی معاشرت، اس کی سیاست، اس کے قوانین، غرض اس کی ہر چیز ایک غلط نقطۂ آغاز سے چل کر ایک غلط رخ پر ترقی کرتی چلی گئی ہے، اور اب اس مرحلہ پر پہنچ گئی ہے جہاں سے ہلاکت کی آخری منزل قریب نظر آ رہی ہے۔

اس تہذیب کا آغاز ایک ایسی قوم میں ہوا جس کے پاس درحقیقت حکمت الٰہی کا کوئی صاف اور پاکیزہ سرچشمہ نہ تھا۔ مذہب کے پیشوا ان کے ہاں ضرور موجود تھے، مگر ان کے پاس حکمت نہ تھی۔ ان کے پاس علم نہ تھا۔ ان کے پاس خدا کا قانون نہ تھا۔ محض ایک غلط مذہبی تخیل تھا جو فکر و عمل کی راہوں میں نوع انسانی کو سیدھے رستے پر اگر چلانا چاہتا بھی تو نہ چلا سکتا۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتا تھا کہ علم و حکمت کی ترقی میں سد راہ بن جاتا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، اور اس کی مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ترقی کرنا چاہتے تھے وہ مذہب اور مذہبیت کو ٹھوکر مار کر ایک دوسرے رستے پر چل پڑے جس میں عقل، حس، اور تجربے کے سوا کوئی اور چیز ان کی رہنما نہ تھی۔ یہ ناقابل اعتماد رہنما، جو خود ہدایت اور نور کے محتاج تھے، ان کے معتمد علیہ بن گئے، اور ان کی مدد سے انہوں نے فکر و نظر، تحقیق و اکتشاف، اور تعمیر

تنظیم کی راہ میں جتنی سعی و جہد کی، اس کو ہر میدان میں ایک غلط نقطۂ آغاز نصیب ہوا اور ان کی تمام ترقیات کا رُخ ایک غلط منزل مقصود کی طرف پھر گیا، وہ الحاد اور مادّیت کے نقطے سے چلے انہوں نے کائنات کو اس نظر سے دیکھا کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے، آفاق اور انفس میں یہ سمجھ کر نظر کی کہ حقیقت جو کچھ بھی ہے مشاہدات اور محسوسات کی ہے، اور اس ظاہری پردے کے پیچھے کچھ بھی نہیں۔ تجربہ اور قیاس سے انھوں نے قانون فطرت کو جانا اور سمجھا، مگر اس کے فاطر تک نہ پہنچ سکے انہوں نے موجودات کو اپنے لیے مسخر پایا اور ان سے کام لینا شروع کیا، لیکن اس تخیل سے ان کے ذہن خالی تھے کہ وہ بالاصل ان اشیا کے مالک اور حاکم نہیں ہیں، بلکہ اصلی مالک کے خلیفہ ہیں۔ اس جہالت و غفلت نے انھیں ذمہ داری اور جوابدہی کے بنیادی تصور سے بے گانہ کر دیا، اور اس کی وجہ سے ان کی تہذیب اور ان کے تمدن کی اساس ہی غلط ہو گئی۔ وہ خدا کو چھوڑ کر خودی کے پرستار بن گئے، اور خودی نے خدا بن کر ان کو فتنے میں ڈال دیا۔ اب یہ اسی جھوٹے خدا کی بندگی ہے جو فکر و عمل کے ہر میدان میں ان کو ایسے راستوں پر لیے جا رہی ہے جن کے درمیانی مراحل تو نہایت خوش آیند اور نظر فریب ہیں، مگر آخری منزل بجز ہلاکت کے اور کوئی نہیں۔ وہی ہے جس نے سائنس کو انسان کی تباہی کا آلہ بنا لیا۔ اخلاق کو نفسانیت، ریا، خلاعت اور بے قیدی کے سانچوں میں ڈھال دیا۔ معیشت پر سرمایہ داری اور خود غرضی کا شیطان مسلط کر دیا۔ معاشرت کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں نفس پرستی، تن آسانی، اور خودکامی کا زہر اتار دیا۔ سیاست کو قوم پرستی، وطنیت، رنگ و نسل کے امتیازات، اور خداوندی طاقت کی پرستاری سے آلودہ کر کے انسانیت کے لیے ایک بدترین لعنت بنا دیا۔ غرض کہ وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے، جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں، جس کے پھول خوشنما مگر خاردار ہیں، جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں، مگر ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی

اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کیے جا رہی ہے۔

اہل مغرب جنہوں نے اس شجر خبیث کو اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، اب خود اس سے بیزار ہیں۔ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ایسی الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر دی ہیں جن کو حل کرنے کی ہر کوشش بہت سی نئی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ جس شاخ کو کاٹتے ہیں، اس کی جگہ بہت سی خاردار شاخیں نکل آتی ہیں۔ سرمایہ داری پر تیشہ چلایا تو بالشویت نمودار ہو گئی۔ جمہوریت پر ضرب لگائی تو ڈکٹیٹرشپ پھوٹ نکلی۔ اجتماعی مشکلات کو حل کرنا چاہا تو نسوانیت (Feminism) اور برتھ کنٹرول کا ظہور ہوا۔ اخلاقی مفاسد کا علاج کرنے کے لیے قوانین سے کام لینے کی کوشش کی تو قانون شکنی اور جرائم پیشگی نے سر اٹھایا۔ غرض مفاسد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو تہذیب و تمدن کے اس درخت سے نکل رہا ہے، اور اس نے مغربی زندگی کو از سرتاپا مصائب و آلام کا ایک پھوڑا بنا دیا ہے جس کی ہر رگ میں ٹیس اور ہر ریشے میں دکھن ہے۔ مغربی قومیں درد سے بیتاب ہو رہی ہیں۔ ان کے دل بے قرار ہیں۔ ان کی روحیں کسی امرت رس کے لیے تڑپ رہی ہیں۔ مگر انھیں خبر نہیں کہ امرت رس کہاں ہے۔ ان کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مصائب کا سرچشمہ اس شجر خبیث کی محض شاخوں میں ہے، اس لیے وہ شاخیں کاٹنے میں اپنا وقت اور اپنی محنتیں ضائع کر رہی ہے، مگر نہیں سمجھتی کہ خرابی جو کچھ بھی ہے اس درخت کی جڑ میں ہے اور اصل فاسد سے فرع صالح نکلنے کی امید رکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ دوسری طرف ایک قلیل جماعت ایسے متعقل لوگوں کی بھی ہے جنہوں نے اس حقیقت کو پا لیا ہے کہ ان کے شجر تہذیب کی اصل ہی خراب ہے، مگر وہ صدیوں تک اسی درخت کے سایہ میں پرورش پاتے رہے ہیں اور اسی کے ثمرات سے ان کی ہڈی بوٹی بنی ہے، اس لیے ان کے ذہن یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس اصل کے بجائے کونسی دوسری اصل ایسی ہو سکتی ہے جو صالح برگ و بار لانے کی قوت رکھتی ہو۔ نتیجہ میں دونوں جماعتوں کا حال ایک ہی ہے۔ وہ سب کے سب بیتابی کے ع

کسی چیز کے طالب ہیں، جو ان کے درد کا درمان کرے، مگر انہیں خبر نہیں ہے کہ ان کا مطلوب کیا ہے۔ اور کہاں ہے۔

یہ وقت ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو پیش کیا جائے۔ اور انھیں بتایا جائے کہ یہ ہے وہ مطلوب جس کی طلب میں تمہاری روحیں بے قرار ہیں، یہ ہے وہ امرت رس جس کے تم پیاسے ہو، یہ ہے وہ شجر طیب جس کی اصل بھی صالح ہے اور شاخیں بھی صالح جس کے پھول خوشبودار بھی ہیں اور بے خار بھی جس کے پھل میٹھے بھی ہیں اور جاں بخش بھی جس کی ہوا لطیف بھی ہے اور روح پرور بھی یہاں تم کو حکمت ملے گی یہاں تم کو فکر و نظر کے لیے ایک صحیح نقطہ آغاز ملے گا یہاں تم کو وہ علم ملے گا جو نظری اور عملی دونوں قسم کے علوم کو ایک مستقیم و مستحکم بنیاد فراہم کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ ایمان ملے گا جو انسانی سیرت کی بہترین تشکیل کرتا ہے۔ یہاں تم کو وہ روحانیت ملے گی جو راہبوں اور سنیاسیوں کے لیے نہیں بلکہ کارزار دنیا میں جدو جہد کرنے والوں کے لیے سکون قلب اور جمعیت خاطر کا سرچشمہ ہے، یہاں تم کو اخلاق اور قانون کے وہ بلند اور پائیدار قواعد ملیں گے جو انسانی فطرت کے علم حاوی پر مبنی ہیں اور خواہشات نفس کے اتباع میں بدل نہیں سکتے، یہاں تم کو تہذیب و تمدن کے وہ صحیح اصول ملیں گے جو طبقات کے جعلی امتیازات اور اقوام کی مصنوعی تفریقوں کو مٹا کر خالص عقلی بنیادوں پر انسانی جمعیت کی تنظیم کرتے ہیں اور عدل مساوات، فیاضی اور حسن معاملت کی ایک ایسی پرامن اور مناسب فضا پیدا کر دیتے ہیں جس میں افراد اور طبقات اور فرقوں کے درمیان حقوق کی کشمکش اور مفاد و مصالح کے تصادم اور اغراض و مقاصد کی جنگ کے لیے کوئی موقع باقی ہی نہیں رہتا، اور سب کے سب باہمی تعاون کے ساتھ شخصی و اجتماعی فلاح کے لیے خوش دلی اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں، اگر تم ہلاکت سے بچنا چاہتے ہو تو قبل اس کے کہ تمہاری تہذیب ایک ہولناک صدمہ سے پاش پاش ہو کر تاریخ کی برباد شدہ تہذیبوں میں ایک کا اضافہ کرے، تم کو چاہیے کہ اسلام کے خلاف

ان تمام تعصبات کو، جو تمہیں قرونِ وسطیٰ کے مذہبی دیوانوں سے وراثۃً ملے ہیں اور جن کو تم نے اس تاریک دور کی تمام دوسری چیزوں سے قطع تعلق کرنے کے باوجود ابھی تک نہیں چھوڑا ہے، اپنے دلوں سے نکال ڈالو اور کھلے دل کے ساتھ قرآن اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو سنو، سمجھو اور قبول کرو۔

مسلمان قوموں کا حال مغربی قوموں کے حال سے مختلف ہے۔ مرض اور ہے، اسباب مرض بھی دوسرے ہیں، مگر علاج ان کا بھی وہی ہے جو اہل مغرب کا ہے یعنی اس علم و ہدایت کی طرف رجوع جس کو اللہ نے اپنی آخری کتاب اور اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔

اسلام کے ساتھ مغربی تہذیب کا تصادم جن حالات میں پیش آیا ہے وہ ان حالات سے بالکل مختلف ہیں جن میں اس سے پہلے اسلام اور دوسری تہذیبوں کے درمیان تصادم ہوئے ہیں۔ رومی فارسی ہندی اور چینی تہذیبیں اس وقت اسلام سے ٹکرائیں جب وہ اپنے متبعین کی فکری و عملی قوتوں پر پورے زور کیسا تھ حکمران تھا قرآن کا علم ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا، طریقۂ محمدی ان کی زندگی کا دستور العمل تھا، جہاد اور اجتہاد کی زبردست روح ان کے اندر کارفرما تھی، روحانی اور مادی دونوں حیثیتوں سے وہ دنیا میں ایک غالب قوم تھے اور تمام اقوام عالم کی پیشوائی کا منصب ان کو حاصل تھا۔ ایسی حالت میں کوئی تہذیب ان کی تہذیب کے مقابلہ میں ٹھیر نہ سکی انہوں نے جس طرف رخ کیا، قوموں کے خیالات، نظریات، علوم اخلاق و عادات اور طرز تمدن میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان میں تاثر کی قابلیت کم اور تاثیر کی قوت بہت زیادہ تھی، بلاشبہ انہوں نے دوسروں سے بہت کچھ لیا، مگر ان کی تہذیب کا مزاج اس قدر طاقتور اور مضبوط تھا کہ باہر سے جو چیز بھی اس میں آئی وہ اس کی طبیعت کے مطابق ڈھل گئی۔ اور کسی بیرونی اثر سے اس کا مزاج مختلف پیدا نہ ہو سکا۔ بخلاف اس کے انہوں نے جو اثرات دوسروں پر ڈالے وہ انقلاب انگیز ثابت ہوئے بعض غیر مسلم تہذیبیں تو اسلام میں جذب ہو کر اپنی انفرادیت ہی کھو بیٹھیں، اور بعض جن میں زندگی

کی طاقت زیادہ تھی وہ اسلام سے اس قدر متأثر ہوئیں کہ ان کے اصول میں بہت کچھ تغیر واقع ہوگیا مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا۔

مسلمان صدیوں تک دنیا میں قلم اور تلوار کے ساتھ فرمانروائی کرتے کرتے آخر کار تھک گئے۔ ان کی روح جہاد سرد پڑ گئی، قوت اجتہاد شل ہوگئی۔ جس کتاب نے ان کو علم کی روشنی اور عمل کی طاقت بخشی تھی اس کو انھوں نے محض ایک تبرک یادگار بنا کر غلافوں میں لپیٹ دیا، جس ہادی اعظم کی سنت نے ان کی تہذیب کو ایک مکمل فکری و عملی نظام کی صورت میں متشکل کیا تھا اس کی پیروی کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ترقی کی رفتار رک گئی۔ بہتا ہوا دریا یکایک جمود کی وادی میں ٹھیر کر تالاب بن گیا۔ امامت کے منصب سے مسلمان معزول ہوئے۔ دنیا کی قوموں پر ان کے افکار، ان کے علوم، اور ان کے تمدن اور ان کے سیاسی اقتدار نے جو قابو پا لیا تھا، اس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ پھر اسلام کے بالمقابل ایک دوسری تہذیب نے جنم لیا۔ جہاد اور اجتہاد کا جھنڈا، جس کو مسلمانوں نے پھینک دیا تھا، مغربی قوموں نے اٹھا لیا۔ مسلمان سوتے رہے اور اہل مغرب اس جھنڈے کو لے کر علم و عمل کے میدان میں آگے بڑھے، یہاں تک کہ امامت کا منصب جس سے مسلمان معزول ہو چکے تھے ان کو مل گیا۔ ان کی تلوار نے دنیا کے سواد اعظم کو فتح کیا۔ ان کے افکار و نظریات، علوم و فنون اور اصول تہذیب و تمدن دنیا پر چھا گئے۔ ان کی فرمانروائی نے صرف اجسام ہی کا نہیں، دلوں اور دماغوں کا بھی احاطہ کر لیا۔ آخر صدیوں کی نیند کے بعد جب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں تو انھوں نے دیکھا کہ میدان ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ دوسرے اس پر قابض ہو چکے ہیں۔ اب علم ہے تو ان کا ہے۔ تہذیب ہے تو ان کی ہے۔ قانون ہے تو ان کا ہے۔ حکومت ہے تو ان کی ہے۔ مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ ایک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔

اب اسلام اور مغربی تہذیب کا تصادم ایک دوسرے ڈھنگ پر ہو رہا ہے۔ یقیناً مغربی تہذیب کسی حیثیت سے بھی اسلام کے مقابلہ کی تہذیب نہیں۔ اگر تصادم اسلام سے ہو تو دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتی۔ مگر اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے، نہ اسلامی اخلاق ہیں، نہ اسلامی افکار ہیں، نہ اسلامی اسپرٹ ہے۔ اسلامی روح نہ ان کی مسجدوں میں ہے، نہ مدرسوں میں، نہ خانقاہوں میں۔ عملی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔ اسلام کا قانون نہ ان کی شخصی زندگی میں نافذ ہے نہ اجتماعی زندگی میں۔ تمدن، تہذیب، قانونی شعبہ ایسا نہیں جس کا نظم صحیح اسلامی طرز پر باقی ہو۔ ایسی حالت میں دراصل مقابلہ اسلام اور مغربی تہذیب کا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی افسردہ، جامد اور پس ماندہ تہذیب کا ایک ایسی تہذیب سے مقابلہ ہے جس میں زندگی ہے، حرکت ہے، روشنی علم ہے، گرمی عمل ہے۔ ایسے نامساوی مقابلہ کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہی ظاہر ہو رہا ہے۔ مسلمان پسپا ہو رہے ہیں، ان کی تہذیب شکست کھا رہی ہے وہ آہستہ آہستہ مغربی تہذیب میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں، ان کے دلوں اور دماغوں پر مغربیت مسلط ہو رہی ہے، ان کے ذہن مغربی سانچوں میں ڈھل رہے ہیں۔ ان کی فکری و نظری قوتیں مغربی اصولوں کے مطابق تربیت پا رہی ہیں۔ ان کے تصورات، ان کے اخلاق، ان کی معیشت، ان کی معاشرت، ان کی سیاست ہر چیز مغربی رنگ میں رنگی جا رہی ہے، اور ان کی نئی نسلیں اس تخیل کے ساتھ اٹھ رہی ہیں کہ زندگی کا حقیقی قانون وہی ہے جو مغرب سے ان کو مل رہا ہے۔ یہ شکست دراصل مسلمانوں کی شکست ہے، مگر بدقسمتی سے اس کو اسلام کی شکست سمجھا جاتا ہے۔

ایک ملک نہیں جو اس مصیبت میں گرفتار ہو۔ ایک قوم نہیں جو اس خطرے میں مبتلا ہو۔ آج تمام دنیائے اسلام اسی خوفناک انقلاب کے دور سے گذر رہی ہے۔ درحقیقت یہ علماء کا کام تھا کہ جب اس انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی اس وقت وہ بیدار ہوتے، آنے والی تہذیب کے اصول و مبانی کو سمجھتے، مغربی

ممالک کا سفر کرکے ان علوم کا مطالعہ کرتے جن کی بنیاد پر یہ تہذیب اٹھی تھی۔ اجتہاد کی قوت سے کام لے کر ان کارآمد علمی اکتشافات اور عملی طریقوں کو اخذ کرلیتے جن کے بل پر مغربی قوموں نے ترقی کی تھی، اور ان نئے کل پرزوں کو اصول اسلام کے ماتحت مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور ان کی تمدنی زندگی کی مشین میں اس طرح نصب کردیتے کہ کئی صدیوں کے جمود سے جو نقصان پہونچا تھا اس کی تلافی ہوجاتی، اور اسلام کی گاڑی پھر سے زمانہ کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی۔ مگر افسوس کہ علماء (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہوچکے تھے۔ ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی۔ ان میں تفقہ نہ تھا۔ ان میں حکمت نہ تھی ان میں عمل کی طاقت نہ تھی۔ ان میں اتنی صلاحیت ہی نہ تھی کہ خدا کی کتاب اور رسول خدا کی علمی وعملی ہدایت سے اسلام کے دائمی اور لچکدار اصول اخذ کرتے اور زمانہ کے متغیر حالات میں ان سے کام لیتے۔ ان پر تو اسلاف کی اندھی اور جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہوچکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتابوں میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتابیں نہ تھیں کہ زمانے کی قیود سے بالاتر ہوتیں۔ اور ہر معاملہ میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے کہ ان کی بصیرت اوقات اور حالات کی بندشوں سے بالکل آزاد ہوتی۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ ایسے وقت میں مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کرسکتے جب کہ زمانہ بالکل بدل چکا تھا اور علم وعمل کی دنیا میں ایسا عظیم تغیر واقع ہوچکا تھا جس کو خدا کی نظر تو دیکھ سکتی تھی مگر کسی غیر نبی انسان کی نظر میں یہ طاقت نہ تھی کہ قرنوں اور صدیوں کے پردے اٹھا کر ان تک پہنچ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ علماء نے نئی تہذیب کا مقابلہ کرنے کی کوشش ضرور کی، مگر مقابلہ کے لیے جس سروسامان کی ضرورت تھی وہ ان کے پاس نہ تھا۔ حرکت کا مقابلہ جمود سے نہیں ہوسکتا۔ رفتار زمانہ کو باتوں کے زور سے نہیں بدلا جاسکتا۔ نئے اسلحہ کے سامنے فرسودہ اور زنگ آلود ہتھیار کام نہیں دے سکتے۔ علماء نے جن طریقوں سے امت کی رہنمائی کرنی چاہی ان کا کامیاب ہونا کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ جو قوم مغربی تہذیب کے طوفان میں گھر چکی تھی، وہ آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر، اور جو اس کو معطل کرکے کب تک طوفان کے وجود سے

انکار کرتی اور اس کے اثرات سے محفوظ رہتی۔ جس قوم پر تمدن و تہذیب جدید نظام سیاسی طاقت کے ساتھ محیط ہو چکا تھا، اپنی عملی زندگی کو مغلوبی و محکومی کی حالت میں اس سے کہاں تک بچا سکتی تھی آخر کار وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ سیاست کے میدان میں شکست کھانے کے بعد مسلمانوں نے علم اور تہذیب و تمدن کے میدان میں بھی شکست کھائی اور اب ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ دنیائے اسلام کے ہر خطہ میں مغربیت کا طوفان بلا کی تیزی سے بڑھتا چلا جا رہا ہے جس کی رو میں بہتے بہتے مسلمانوں کی نئی نسلیں اسلام کے مرکز سے کوسوں دور نکل گئی ہیں۔

بدبختی یہ ہے کہ علماء اسلام کو اب تک اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے۔ قریب قریب ہر اسلامی ملک میں علماء کی جماعت اب بھی اسی روش پر قائم ہے اور اصرار و شدت کے ساتھ قائم ہے جس کی وجہ سے ابتداء میں ان کو ناکامی ہوئی تھی۔ چند مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر، علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں، ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہیے کرا لیجئے، لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لیے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیے ہیں ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے، کیوں کہ ان کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں، اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے۔ اور بسا اوقات ان کے مواعظ سن کر یا ان کی تحریروں کو پڑھ کر دل سے بے اختیار یہ دعا نکلتی ہے کہ خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔ انہوں نے اپنے اردگرد دو سو برس پرانی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اسی فضا میں

سوچتے ہیں، اسی میں رہتے ہیں اور اسی کے مناسب حال باتیں کرتے ہیں۔ بلاشبہ علوم اسلامی کے جو آج دنیا میں انہی بزرگوں کے دم سے قائم ہیں، اور جو کچھ دینی تعلیم پھیل رہی ہے انہی کے ذریعہ سے پھیل رہی ہے، لیکن دو سو برس کی جو وسیع خلیج انہوں نے اپنے اور زمانہ حال کے درمیان حائل کر رکھی ہے وہ اسلام اور جدید دنیا کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں ہونے دیتی۔ جو اسلامی تعلیم کی طرف جاتا ہے وہ دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ جو دنیا کے کام کا بننا چاہتا ہے وہ اسلامی تعلیم سے بالکل بیگانہ رہتا ہے یہی سبب ہے کہ اس وقت دنیائے اسلام میں ہر جگہ دو ایسے گروہ پائے جاتے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک گروہ اسلامی علوم اور اسلامی ثقافت کا علمبردار ہے۔ مگر زندگی کے کسی شعبے میں مسلمانوں کی رہنمائی کے قابل نہیں، دوسرا گروہ مسلمانوں کی علمی، ادبی، تمدنی اور سیاسی گاڑی کو چلا رہا ہے، مگر اسلام کے اصول و مبادی سے ناواقف ہے، اسلامی تہذیب کی اسپرٹ سے بیگانہ ہے، اسلام کے اجتماعی نظام اور تمدنی قوانین سے ناآشنا ہے، صرف دل کے ایک گوشہ میں ایمان کا تھوڑا بہت نور رکھتا ہے، باقی تمام حیثیتوں سے اس میں اور ایک غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں، مگر جو کچھ علمی و عملی طاقت جو کچھ بھی ہے اسی گروہ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے دست و بازو میں جو گاڑی چلانے کی طاقت رکھتے ہیں، اس لیے وہ ملت کی گاڑی کو لئے کر گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا چلا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کو سیدھا رستہ بتائے۔

ہم اس حالت کو دیکھ رہے ہیں اور اس کا خوفناک انجام ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اگرچہ رہنمائی کے لیے جس علم و فضل اور جامعیت کی ضرورت ہے وہ ہم کو حاصل نہیں۔ نہ اتنی قوت میسر ہے کہ ایسے بگڑے ہوئے حالات میں اتنی بڑی قوم کی اصلاح کر سکیں، لیکن اللہ نے دل میں ایک درد دیا ہے، اور وہی درد مجبور کرتا ہے کہ جو تھوڑا سا علم اور نور بصیرت اللہ تعالیٰ نے بخشا ہے، اس سے کام لیکر

مسلمانوں کے ان دونوں گروہوں کو اسلامی تعلیم کے اصل منبع اور اسلامی تہذیب کے حقیقی اساس کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیں، اور کامیابی و ناکامی سے بے پروا ہو کر اپنی سی کوشش کر دیکھیں۔ کام کی بزرگی اور اپنی کمزوری کو دیکھ کر اپنی کوششیں خود ہم کو ہیچ میرز معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کامیابی اور ناکامی جو کچھ بھی ہے اس قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا کام کوشش کرنا ہے، اور اپنی حد وسع تک ہم اپنی کوشش کے دائرے کو پھیلانا چاہتے ہیں۔ ڈھائی سال سے اس دعوت کی اشاعت صرف اردو کی تنگ دنیا میں محدود تھی۔ اب خدا کے فضل سے ایک ایسا رفیق کار مل گیا ہے جس نے انگریزی زبان کے ذریعہ سے مغرب اور مشرق کی وسیع دنیا میں اس دعوت کو پھیلانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو آگے چل کر ایسے ہی اور بہت سے رفقا بہم پہنچ جائیں گے جو دوسری زبانوں میں اس خدمت کو انجام دیں گے۔

مقالات

ورثۂ اسلامیہ کا ایک باب

تصوف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

(۲)

ترجمہ و تحشیہ جناب ذوقی شاہ صاحب

اسلام میں لوگوں کے اعمال پر حکم لگایا جاتا ہے اور جمہور کے خلاف عقائد کے کسی کے دل میں پیدا ہونے کی روک تھام عام طور پر سزاؤں کے ذریعہ سے نہیں کی جاتی۔ صوفیاء کے عقائد خواہ ظاہر شریعت سے کتنے ہی ٹکرائیں جب تک کہ صوفی اپنے دوسرے مسلمان ساتھیوں کی طرح عبادت کیے چلا جاتا ہے اسے کوئی شدید نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ حلاج ارکان مذہب کی پابندی میں بہت سخت تھا اور اس نے ان ادنیٰ منزلوں کی کبھی تحقیر نہیں کی، گو انھیں کبھی سراہا بھی نہیں جن کے ذریعہ سے انسان کو خلوص قلب اور عبدیت (جو کہ حقیقت مذہب ہے) کی بلندی پر چڑھنا پڑتا ہے۔ یہ اکثر صوفیا کی روش رہی ہے اور دو آقاؤں کی خدمت کرنے کی یہی صورت بہترین بھی معلوم ہوتی ہے مگر حلاج کا میلان اپنے ضمیر کا ساتھ دینے پر حد سے بڑھا ہوا تھا۔ فقہا اور حکومت اسلامی کے اقتدار کے مقابلہ میں اس نے اپنے ذاتی اقتدار کو پیش کر دیا جو باعتبار ولی واصل حق ہونے کے اس نے براہ راست خدا سے اخذ کیا تھا۔ وہ مثل جنید کے صاحب نظریہ ہی نہ تھا بلکہ قرامطہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کا بھی اس پر شبہ کیا گیا تھا اور اس نے اپنے عقائد کی تعلیم مومن و کافر کو یکساں طور پر دینی شروع

کر دی تھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تائید میں اس نے اپنی کرامتیں دکھلا دکھلا کر لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کر دیا تھا۔ ان وجوہ سے اس کے خلاف ٹھیک فتوی ہوا اُس کا قصور یہ نہ تھا جیسا کہ صوفیائے متاخرین کہتے ہیں کہ اس نے ربوبیت کا راز فاش کر دیا" بلکہ اس پر الزام یہ تھا کہ اس نے اپنے اندر کی آواز پر عمل کر کے ایک ایسی حقیقت کو ظاہر کر دیا اور اس پر زور دیتا رہا جس سے مذہبی، سیاسی اور تمدنی شیرازہ درہم و برہم ہو جاتا۔ دوسرے صوفیوں پر بھی وہ حقیقت منکشف ہوئی مگر حلاج اسی حقیقت کی خاطر جیا اور اسی کی خاطر مر گیا۔ یہی سبب ہے کہ حلاج کے کلام میں جس میں کہ اس نے وصل محبوب کی تمنا کی ہے اور اپنی تسلیم و رضا کا اظہار کیا ہے جذبۂ الفت اور تاثیر کا وہ رنگ ہے جو صوفیا کے کلام میں کمیاب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"کہ میرے اور تیرے درمیان 'میں' کا حائل ہونا مجھے سخت تکلیف دیتا ہے۔

اپنی مہربانی سے اس 'میں' کو درمیان سے نکال دے"

"میں وہ ہوں اور وہ میں ہے ہم دونوں دو روحیں ہیں جو ایک ہی جسم میں بستی ہیں۔

اگر تو نے مجھے دیکھا تو گویا تو نے اُسے دیکھا اور اگر تو نے اُسے دیکھا تو تو نے ہم دونوں کو دیکھ لیا۔"

یہاں ضمناً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان خیالات کا ظاہر کرنے والا یونانی فلسفیوں کا سا "ہمہ اوست" کہنے والا (Pantheist) نہیں ہو سکتا۔ اسی خیال کو جیلی (یعنی حضرت عبدالکریم جیلی رح) نے ان توحیدی الفاظ میں ظاہر کیا ہے :- "ہم ایک ہی روح ہیں جو دو جسموں میں بستے ہیں"۔ اور جلال الدین رومی کہتے ہیں کہ :- "کس مسرت کی وہ ساعت ہے جبکہ ہم دونوں یعنی تو اور میں ایک ہی محل میں بیٹھے ہوں جسم دو ہوں صورتیں دو ہوں۔ مگر روح تیری اور میری ایک ہی ہو"

حلاج کا بعض اوقات معنیٔ خاص کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ میں خدا ہو گیا ہوں اور ساتھ ہی اس کے خدا کے منزّہ و برتر و رفیع الدرجات ہونے پر بھی پوری قوت سے زور دینا ایسے شخص کو تعجب میں نہیں ڈال سکتا جس کا کہنا یہ ہو کہ بادی النظر میں منطقی محالات تصوف میں جا کر حقائق ثابتہ ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ حلاج کے ابتدائی اصول حلاج کے بعد زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہے تاہم ذہنیت مابعد کے لیے وہ بنیاد بن گئے۔ مثال کے طور پر انسان کامل کے متعلق اس تخیل کو لو جو ابن عربی کی تصانیف اور تصوف کی فارسی شاعری میں اس قدر غالب ہے۔ مگر ان چیزوں کے مطالعہ سے حلاج کی خصوصیات کا پتہ نہیں چلتا نہ اس کی اس ذاتی معصیت کا حال معلوم ہوتا ہے جس کی جانب اس نے اس مشہور اور بہت ہی مستعمل شعر میں اشارہ کیا ہے۔

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

حلاج کی وفات کے بعد کی صدی اگرچہ دیگر اعتبارات سے اس قدر نتائج خیز ثابت نہیں ہوئی تاہم اس دور میں تصوف پر باقاعدہ کتابیں تصنیف ہوئیں۔ مثلاً ابو النصر سراج کی کتاب اللمع اور ابو طالب مکی کی قوت القلوب جن کے ذریعہ بہت قیمتی معلومات جن کا ماخذ ضائع ہو چکا ہے محفوظ چلی آرہی ہیں۔ اس زمانہ میں تصوف نے فلسفہ یونانی کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر اسلام سے ہٹنا اور یونانی فلسفیوں کے ہمہ اوست (Pantheism) اور شریعت سے آزادی اور بالخصوص عقیدۂ صدور (Emanation) کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ اس کی بیّن مثال ایرانی صوفی ابو سعید ۹۶۷ء-۱۰۴۹ء کے سوانح اور کلام میں ملتی ہے۔ بعض اعتبارات سے ان کی تعلیم قابل تعریف ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ :-

"سچا ولی لوگوں میں آتا جاتا رہتا ہے، اُن کے ساتھ کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے، بازار

میں جاکر خرید و فروخت کرتا ہے، شادی بیاہ کرتا ہے، خلق سے ملا جلا رہتا ہے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے اللہ کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھولتا۔"

انہوں نے تمام مخلوق کو "خالق کی آنکھ" سے دیکھا اور فیاضی اور شفقت کے برتاؤ کو اس قدر اہمیت دی کہ ان کے نزدیک خدا تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ اس سے بہتر نہیں کہ ایک مسلمان کا دل خوش کر دیا جائے۔ انہوں نے شریعت سے ولی کے تعلق کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے اُس کا مقابلہ حلاج کے اقوال و افعال سے کیا جائے تو بلحاظ معنی و بلحاظ عمل بہت فرق معلوم ہوگا۔ حلاج نے حتی الوسع پابندی شریعت کی پوری کوشش کی یہاں تک کہ اسے اس لاینحل معرکہ سے سابقہ پڑا جس میں تعمیل شریعت کا مقابلہ ان احکام کی تعمیل سے تھا جو وہ حاکم برتر کی جانب سے اپنے دل میں محسوس کرتا تھا۔ برعکس اس کے ابو سعید کے نزدیک شریعت کی پابندی اُن کے لیے تو لازمی ہے جو درمیانی منازل میں ہوں لیکن اُن کے لیے غیر ضروری ہے جو مقصود تک رسائی پا چکے ہوں۔ اُن کے نزدیک وصول الی اللہ کبھی کبھی یا باری باری سے ہونے کی چیز نہیں بلکہ فنا فی اللہ اور بقا باللہ کا وہ ایک مستقل اور دائمی نتیجہ ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے مریدوں کو حج کعبہ سے منع کر دیا تھا اور خانہ کعبہ کو وہ صرف "ایک پتھر کا مکان" کہا تھا۔ اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ اذان سن کر انہوں نے اپنا رقص درویشی موقوف نہ کیا اور کہا کہ "ہماری یہی نماز ہے"۔ یہ واقعات حرفاً حرفاً صحیح نہ بھی ہوں تب بھی یہ نمونے کا کام دیتے ہیں۔ مشہور رسالہ قشیریہ میں جو ۴۳۸ھ میں تصنیف ہوا تھا قدیم طرز کے متبع سنت صوفیوں کے زہد و تقوی کا مقابلہ مصنف نے اپنے زمانہ کے صوفیوں کی بے شرمی اور منافقت سے کیا ہے۔ اس زمانہ کے بھی تیس سال بعد صاحب کشف المحجوب لکھتے ہیں کہ ان کے ہمعصروں نے شہوت کا نام شریعت، توہمات لایعنی کا الہام، نفسانیت و بہیمیت کا نام عشق الٰہی، بدعت کا نام فقر، شبہات کا نام تصفیہ قلب، اور مذہب اصلی سے انکار کا نام

ترک و تجرید رکھ لیا ہے۔ جب کہ اولیاء اور ان کے بے شمار معتقدین و متبعین کی جماعت تاریخ وروایات اسلامی کے لیے خطرہ بنی ہوئی تھی، علماء کے گروہ میں تنازعات باہمی پھیل رہے تھے اور وہ یا تو محض کوتاہ فہمی اور تعصب سے قرآن کے الفاظ ظاہری کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے یا فروعات فقہ میں الجھ رہے تھے یا خشک عقل کی روشنی میں اصولی عقاید کے تجزیہ کے درپے تھے اور مذہب کو حقیقتاً مذہب بنانے والی باتوں سے جو کہ مذہب کی جان ہیں سرعت کے ساتھ بے تعلق ہوتے جاتے تھے، بہت سے جوشیلے مسلمان اس وقت اپنے دل میں یہ سوال کرتے ہوں گے کہ یہ حالات کب تک قائم رہیں گے اور کوئی ایسی صورت بھی ممکن ہے جو مذہب کی اصلیت کو تو قائم رکھے مگر لوگوں میں پھوٹ نہ پڑنے دے۔ اس سوال کا جواب ایک ایسے شخص کے درمیان میں آجانے سے مل گیا جو اسلام کے سب سے بڑے لوگوں میں سے ہے اور جس کا نام ابوحامد غزالی ہے (۱۰۵۰-۱۱۱۱ء) اور جو زمانۂ وسطیٰ کے یورپ میں ابوحامد (Abubamet) اور الغزل (Algezel) کے نام سے مشہور ہے۔

غزالی کے صوفی بننے کا قصہ جو انہوں نے خود قلمبند کیا ہے اپنے طرز کی ایک نہایت ہی عالمانہ تحریر ہے۔ یہاں صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہوگا کہ وہ اپنی عمر کے ابتدائی حصہ میں شکی طبیعت کے تھے۔ تصوف کے مشاہدات نے اُن کے اس مرض کا ازالہ کر دیا۔ فلسفہ اور علم کلام میں ان کے تجربے نے انہیں اطمینان دلا دیا کہ ان علوم سے اطمینان پیدا کرنے والی روشنی مفقود ہے۔ دیگر فرقوں کی تعلیمات سے بھی مطلب براری نہ ہو سکی۔ تب انہوں نے اس تصوف کی جانب توجہ کی جو حارث محاسبی اور تیسری صدی کے صوفیائے اکابر فن لکھ گئے تھے اور اس سے ان پر حقیقت منکشف ہو گئی۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر یہ بات کھل گئی کہ جو امور صوفیا کے لیے مختص ہیں وہ کتابوں کے دیکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ عمل اور کیوف اور اندرونی انقلابات ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، یعنی بالفاظ دیگر صوفیوں کی روش اختیار کرنے اور ان کے سے اعمال پر کاربند ہونے سے وہ باتیں حاصل ہوتی ہیں[۱]۔ انہوں نے

[۱] مگر یہ وقیع نکتہ صرف کتابوں کے مطالعہ ہی سے سمجھتے ہیں کہ ان میں وہ بصیرت پیدا ہو گئی کہ صوفیاء کے اقوال و افعال پر صحیح تنقید کر سکیں

ذونی

یہ بھی دیکھا کہ ان کی نجات خطرہ میں ہے۔ دنیا کی شان و شوکت حاصل کرنے کا انہیں بہت اچھا موقع تھا۔ اس موقع کو ہاتھ سے جانے دینے میں انھیں سخت کشمکش سے سابقہ پڑا۔ اس کشمکش میں ان کی صحت تک خراب ہوگئی۔ مگر بالآخر وہ کامیاب ہوے اور مثل اس شخص کے جسے مصائب شدید میں کوئی دوسرا سہارا نہیں ملتا انہوں نے خدا کی پناہ دھونڈلی۔ ان کی عمر چالیس برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ انہوں نے بغداد اس قصد سے ترک کردیا کہ پھر کبھی وہاں واپس نہ ہوں گے۔

حاصل یہ کہ حقیقت صوفیا ہی کے پاس نکلی اور اس حقیقت کے متعلق غزالی کے ذاتی تجربہ اور ان کی تصانیف بالخصوص احیاء العلوم نے ان لوگوں میں بھی جو کہ اس وقت تک تصوف کے خلاف تھے تصوف کی موافقت میں ایک جوش عظیم پیدا کردیا، اس زمانے کے بعد سے صوفیا بھی قطعی طور سے اسلام میں داخل سمجھے جانے لگے۔ کیونکہ غزالی اور ان کے بعد بکثرت مسلمانوں کے نزدیک جو انکشافات کہ اولیا، اللہ کو ہوتے ہیں وہ پیغمبروں کے انکشافات ہی کی تائید میں ہوتے ہیں اور پیغمبروں کے انکشافات سرچشمہ ہیں جملہ علوم حقائق کے۔ مگر ساتھ ہی اس کے غزالی اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ ولایت ماخوذ ہے نبوت سے[1] اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور ان کے احکامات کی ظاہری و باطنی تعمیل سب پر فرض ہے۔ اور گو غزالی کا یہ عقیدہ کہ روح ایک آئینہ ہے جس میں قدسی چنگاری سے روشنی پیدا کی گئی ہے اور جس میں اللہ کی ذات و صفات منعکس ہیں زیادہ دلیر صوفیوں کو خلاف شرع جسارتوں پر ابھار سکتا ہے مگر غزالی اپنی ذات سے اس خطرہ سے محفوظ رہے شاید ان کے دل میں جو خیالات مخفی ہوں وہ اُن خیالات سے بڑھے ہوے ہوں جن کا انہوں نے اپنی کتاب میں اظہار کیا ہے۔ گو انہوں نے مشکوٰۃ الانوار میں اس قسم

[1] دراصل ایک نبی کی نبوت اُس کی ولایت سے ماخوذ ہوتی ہے اور دوسرے اولیاء کی ولایت اس نبی کی نبوت سے ماخوذ ہوتی ہے جس کے وہ زیر قدم ہو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجموعہ ہیں جملہ انبیا کی نبوت و ولایت کی نسبتوں کا (رزاقی)

کے فقرے بھی لکھے ہیں کہ :- "اللہ آفتاب ہے اور آفتاب کے علاوہ جو کچھ ہے وہ آفتاب ہی کی روشنی ہے" مگر اسلام میں یونانی ہمہ اوستی (Pantheistic) زبان کے استعمال سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس زبان کا استعمال کرنے والا بھی یونانی ہمہ اوستیہ (Pantheist) ہو۔ غزالی کبھی کبھی توحید کے مسئلہ کو انتہائی حدود تک لیجاتے ہیں مگر ساتھ ساتھ وہ اس کے اعادہ سے بھی نہیں چوکتے کہ خدا خالق ہے جس نے محض اپنے ارادہ سے کائنات کی تخلیق فرمائی۔ تصوف کا ان پر جتنا بڑا احسان تھا۔ اس کا حق بھی انہوں نے پوری طرح ادا کر دیا۔ اکثر صوفیا کا یہ بھی خیال ہے اور اس میں وہ حق بجانب بھی ہیں کہ غزالی اتنے زیادہ صوفی نہ تھے جتنے کہ وہ وسیع الخیال مسلمان تھے ان کے پیچھے زہد و تقوی اور اخلاقی بلندیوں اور سنت پر استحکام نے انھیں اسلام میں راسخ کر دیا تھا۔ اور گو اس بات کو وہ لوگ نہ مانیں مگر بات یہ ہے کہ اُن کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی نے انھیں پختہ بنا دیا تھا[1]۔ تصوف کو مذہب اصلی بنا دینے میں تو اُن کو اتنی زیادہ کامیابی نہ ہوی اور یہ امر مشکل بھی تھا۔ مگر اصلی مذہب کو تصوف بنا دینے میں انھیں بڑی حد تک کامیابی ہوئی انھوں نے اس تحریک میں قدامت پسند لوگوں کی ایک قوی جماعت کو گھسیٹ لیا اور اس جماعت نے اس طوفانی دور میں جو کہ آنے والا تھا بڑی روک تھام کی۔ مگر اس کے بعد اس تحریک کو چلانے والی قوت ایک اور ہی جانب سے آنی شروع ہوی اور جن خیالات نے اب ہجوم کیا اور اس تحریک کو بڑھایا اور آیندہ کے لیے تسلط پا لیا وہ غزالی کے خیالات سے مختلف تھے۔ فرقہ ہائے جدید کے متبعین رسول اس واقعہ پر پردہ نہیں ڈال سکتے کہ ان کا روحانی وطن مکہ نہیں بلکہ ایتھنس اور سکندریہ ہے[2]۔ تصوف کی تاریخ میں غزالی کے ساتھ ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس وقت تک صوفیوں کے نزدیک خدا اور روح کے درمیان الفت ذاتی کا رشتہ تھا جو اس سمی عبادت کے برعکس جو خوف و حکومت کے تحت کیجاتی ہے اس رشتۂ الفت کے ساتھ انہوں نے ان الہیات کو شامل کر لیا جو ...

---

[1] مگر امام غزالی رح تو یہ فرماتے ہیں کہ علمی تصوف نے ان میں پختگی پیدا کی فلسفیانہ نگاہ اور عالمانہ نقادی تو ان میں پہلے بھی موجود تھی مگر کسی کام نہ آئی
[2] یہ میر تمہیدی نوٹ ملاحظہ ہو۔ (ذوقی)۔

قرآن سے ماخوذ تھیں اور قدرے ارسطو اور اشراقین یا نو فلاطونیوں (Neo-Platonists)
سے جوں جوں اسلام کا تسلط کمزور ہوتا گیا خارجی عناصر قوت پکڑتے گئے حتی کہ بربادی خلافت نے اُن
خارجی عناصر کو میدان کا پورا مالک بنا دیا نتیجہ فلسفۂ ہمہ اوست یونانی (Pantheistic
Philosapy) کی صورت میں برآمد ہوا جو اب سات سو برس کے بعد بھی اسلامی دنیا کے بڑے
حصہ پر حکمران ہے اور جسے جلال الدین رومی حافظ اور دیگر ایرانی صوفی شعرا نے بیان کر کر کے بکثرت
لوگوں کو گرویدہ بنا لیا ہے گو یہ لوگ اس مسلک کے اصلی مصنف اور ابتدائی موجد ابن العربی (۱۱۶۵۔۱۲۴۰)
کی تصانیف کو سمجھ نہ سکیں۔ ان امور کے متعلق کچھ کہنے سے قبل آؤ ذرا ہم اس زمانہ کی دوسری خصوصیت پر
بھی غور کرلیں۔ بارہویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی مذہبی زندگی کی اس وسیع تحریک وتنظیم کا آغاز
ہوا جو زمانہ وسطی کی عیسائی دنیا کے راہبوں کے سلسلوں سے ملتی جلتی ہے اس سے قبل مشہور مشائخ اپنے
مریدوں کو اپنے پاس جمع کرتے تھے اور مریدین کی یہ جماعتیں بعض اوقات خانقاہوں میں سکونت
اختیار کرتی تھیں مگر ان مختلف تعلیمگاہوں میں کسی قسم کا ربط باہمی نہ ہوتا تھا۔ اور یہ خانقاہیں جلد یا
بدیر بند ہو جایا کرتی تھیں۔ طالبوں کی مفت تعلیم پانے والی ان جماعتوں کے بجائے جن میں شیخ کی ذاتی
توجہ سے فیضان پہنچایا جاتا تھا اب سلسلے قائم ہوگئے ہر سلسلہ میں اولیاء کی ایک طویل فہرست ہوتی ہے
جو پیغمبر صاحب سے شروع ہوکر بانی سلسلہ پر ختم ہوتی ہے ان مختلف سلاسل میں دستور العمل بھی مختلف
ہوتا ہے اصول بھی مختلف ہوتے ہیں اور شریعت کی جانب میلان میں بھی اختلاف ہوتا ہے۔ داخل سلسلہ
ہونے کے لیے بالعموم تجرد کی شرط نہیں ہوتی اور گو ان سلسلوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوتے ہیں مگر
زیادتی کے ساتھ بالخصوص غربا ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ ہر نیک و بد میں ان لوگوں کا دوسروں پر
بڑا اثر ہوتا ہے بعض یورپین معترضین نظری ہمہ اوست Theoretical Pantheism
اور عملی بداخلاقی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر مشرقی طبائع کو ان مبتدیانہ تطبیقات کے تحت میں نہیں

لایا جا سکتا۔ صوفیوں کا ہمہ اوست عملی زندگی میں خدا کی ہستی اور خدا کے احکام کی تعمیل کی ضرورت پر مشتمل ہے گو اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلام میں مستند مسلمات اصولی نہ ہونے کی بنا پر صوفیوں کو ایک آزادی حاصل ہے جس کا ان میں سے اکثر غلط استعمال کرتے ہیں۔[1]

محی الدین ابن عربی جو گروہ صوفیا میں پرواز تخیل کے سب سے بڑے استاد ہیں ملک اندلس کے شہر مرسیہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۴۰ء میں دمشق میں ان کا انتقال ہوا۔ اُن کا فلسفۂ کائنات ضخیم ضخیم مجلدات میں موجود ہے۔ جن میں مشہور ترین تصانیف فتوحات المکیہ اور فصوص الحکم ہیں۔ ان تصانیف کا بڑا حصہ ادق[2] اور ظنی ہے۔ تاہم ان کا مطالعہ کرنے والوں میں سے کوئی شخص بھی مصنف کی دماغی اور تخیلی قوت پر حیرت کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ گو بعض لوگوں مثلاً عبد الکریم جیلی (۱۴۱۰ء) نے ان ہی باتوں کو زیادہ وضاحت اور زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل خاکہ میں صرف چند اہم نکات ہی کو لیا جاتا ہے :-

ابن العربی پکے موحد ہیں اور ان کے مسلک کو وحدت الوجود کا جو نام دیا گیا ہے وہ صحیح طور پر اس مسلک کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جملہ اشیاء کا وجود خیالی پہلے سے علم الٰہی میں موجود تھا اور ہیں سے یہ اشیاء نکلیں اور وہیں مراجعت کریں گی یعنی محض بے خلقت وجود میں نہیں آئی بلکہ کائنات ظہور ہے اس کا جو باطناً خدا ہے۔ ہر چیز کسی نہ کسی صفت الٰہی کا مظہر ہے اور انسان عالم صغیر ہے جس میں جملہ اسماء وصفات کا اجتماع ہے اور صرف انسان ہی میں خدا پوری طرح اپنے سے باخبر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ

[1] سلاسل صوفیا اور صوفیوں کی مفروضہ آزادی عمل کے متعلق بھی پروفیسر نکلسن کو متعدد غلط فہمیاں واقع ہوئی ہیں جن کا ازالہ ایک مستقل مضمون مانگتا ہے۔ (ذ ق)۔

[2] اس کا کیا ثبوت ہے کہ محی الدین ابن عربی رح نے اپنی تصانیف میں جو کچھ لکھا وہ ظنیات اور پرواز تخیل کے تحت میں ہے؟ کیا اس کا بھی ثبوت ہے کہ کشف و الہام پروفیسر نکلسن کے فہم سے بالاتر امور ہیں؟ کیا جو چیز پروفیسر صاحب کی عقل سے ماوراء ہو اس کا وجود ہی محال ہے؟ ابن عربی رح کی تحریریں بھی پروفیسر صاحب کے فہم سے بہت ارفع ہیں چنانچہ انہوں نے اپنے مضمون میں ان کی تحریروں کا خلاصہ بالکل غلط دیا ہے اور ابن عربی رح کی تحریروں کی باریکیوں کو وہ بالکل نہیں سمجھتے (ذ ق)۔

عیسائیت) Neo-Platonism اشراقیت (Gnosticism) جیسیں کہ ناسٹک (
اور دیگر مخارج سے اجزا کو لے کر شامل کیا گیا ہے ابن العربی کے مسلک میں نہایت مرکزی حیثیت اختیار
کیے ہوئے ہے یہ لب لباب ہے اصول تخلیق کائنات کا الہیت کو ایک شئے خارجی قرار دیکر اصلی انسانی
تخیل میں ظاہر کیا گیا ہے جس کا پہلا جسدی اوتار آدم ہے۔ انسان کامل خدا کی صورت وفطرت کا
نمونہ ہے اور رحمت الٰہی اور تنظیم کائنات کے درمیان واسطہ ہے جس کے ذریعہ سے دنیا زندہ اور
قائم رکھی جاتی ہے۔ اور لازمی طور پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بدرجہ اتم انسان کامل ہیں۔ ابن العربی
سے بہت پہلے ہی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہستی کی قدامت کا عقیدہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ سب سے
پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی سمجھا جاتا ہے کہ نور محمدی ہے جو آدم میں آیا اور نسلاً بعد نسلٍ تمام پیغمبروں
میں ہوتا ہوا بالآخر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صورت میں ظاہر ہوا اور شیعوں کے عقیدہ کے مطابق
ان سے علی اور ائمہ اہل بیت میں منتقل ہوا۔ مگر صوفیا کا عقیدہ ہے کہ یہ نور جملہ اولیا میں ساوی ہے
ابن العربی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دراصل حقیقت الحقائق کہتے ہیں۔ یہ وہ فقرہ ہے جسے اوریجن
(Origen) نے اصول یا کلمہ تخلیق کائنات (امر کن) کے بیان کرنے اور ارسطو کے "عقل فعال" کی
جانب اشارہ کرنے میں استعمال کیا ہے۔ اس حیثیت سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تخلیق کائنات
کے لیے واسطہ بنے اور اس دنیا میں خدا کے خلیفہ بنے اور قطب بنے جن پر اس دنیا کا قیام منحصر ہے
اور جن کے لیے یہ دنیا بنائی گئی اور تنہا وسیلہ بنے جملہ الہامات ربانی کا کیونکہ آپ پیغمبر تھے جب کہ
آدم مٹی تھے۔ یہ سینٹ پال اور مصنف انجیل چہارم کے اقوال متعلق بہ مسیح کی کچھ آواز بازگشت سی
معلوم ہوتی ہے ممکن کہ کسی حد تک ایسا ہو بھی۔ بہر نوع ابن العربی عیسائیت کے ساتھ ایک خاص قسم کی

؎ ظنیات اور پرواز تخیل سے یہاں پروفیسر صاحب کام لے رہے ہیں یا حضرت ابن عربی کے ۹ صرف مماثلت بعض (ادارہ)
مماثلت جزوی سے ماخذ کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں ہو سکتی بلکہ محض مماثلت کلی سے بھی اس امر میں قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا

ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور لفظ "کلمہ" کا استعمال مسیح و محمدؐ (علیہما السلام) ۔ دونوں کے لیے کرتے ہیں گو مصنف ان دونوں ہی میں اسے مقید نہیں کرتے ہیں[1] خالص توحیدی تصوف تقریباً لازمی طور پر یا فلسفہ ہمہ اوست (Pantheism) کی جانب رہنمائی کرتا ہے یا اولیا پرستی کی جانب یا جیسا کہ اسلام میں پیش آیا دونوں کی جانب خالص فطرت الٰہی سے قطع نظر کر کے توجہ شخصی کے پیے صدنظر صرف پیغمبر یا ولی ہی تک پہنچ کر رہ جاتی ہے جن میں سے اور جن کی وساطت سے خدا اپنے کو ظاہر کرتا ہے تخلیق کائنات کے متعلق اس اسلامی اصول کلی کے وجود میں آنے کا سبب اس مذہبی جوش کی تسکین کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جو توحید الٰہی میں فرق آنے دینا گوارا نہیں کرتی مسیحیت نے تشخص الٰہی میں جو تفریق کی ہے اس کو چھوڑ کر یہاں تفریق حیثیات سے کام لیا گیا ہے۔ انسان کامل دُنیا میں خدا کا مظہر ہے۔ لہٰذا محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صوفیانہ عبادت[2] اکثر ان الفاظ میں جا لگتی ہے جنہیں رسول کی خدا کی شان میں گستاخی قرار دیتے مثلاً "نور محمدی کا ظہور نہ ہوتا تو زمین پر کسی اسرار کا اظہار نہ ہوتا، نہ کوئی چشمہ جاری ہوتا نہ کوئی دریا بہتا" صوفی انہیں "اللہ کا محبوب" کہتے ہیں اور وہ اللہ کے عطیات کو اُن لوگوں پر تقسیم کرتے ہیں جو ان سے محبت اور رابطۂ روحانی رکھیں۔

ابن عربی کے نزدیک پیغمبر اور اولیا کا احترام اُن بکثرت عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے جن کے ذریعہ خدا اپنا اظہار فرماتا ہے بقول ان کے سچے صوفی کے لیے خدا ہر مذہب میں ملتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ: —

"میرے دل میں ہر صورت سما سکتی ہے میرے دل میں دیر کے لیے بھی گنجائش ہے اور بتوں کے لیے بھی۔ وہ آہوؤں کی چراگاہ ہے۔ اور پاکبازوں کا کعبہ۔ توریت کی تختیاں بھی اس میں ہیں، اور قرآن بھی مشتق

[1] جب لفظ "کلمہ" کے استعمال کو وہ صرف ان دو ہی میں مقید نہیں کرتے تو تخصیص ہی کیا ہوئی پروفیسر صاحب کو اس تصنیع تان کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو نبی برحق سمجھتا ہے اور اصلی اور سچے مذہب عیسوی کے ساتھ نہ کہ بگڑی ہوئی مسیحیت کیا ہمدردی رکھتا ہے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ابن عربی رح کو اگر مسیحی عیسویت کے ساتھ ہمدردی تھی تو کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ (ذوقی)

[2] کوئی مسلمان خواہ وہ صوفی ہو یا غیر صوفی محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت نہیں کرتا۔ ہاں آپ کا احترام اور آپ سے محبت ہر مسلمان کا فرض ہے عبادت و احترام میں فرق ہے ہر عبادت محبت و احترام ہے۔ مگر ہر محبت و احترام عبادت نہیں اولاد یا باپ سے محبت یا کسی بڑے کا احترام کیا محبت و احترام عبادت ہیں پروفیسر نکلسن یہاں بھی مسلمانوں کو مسیحی نگاہ سے دیکھا ہے (ذوقی)

میرا مذہب ہے اس کے اونٹ جہاں چاہیں چریں۔ مگر میں تو اپنے سچے عقیدہ ہی پر قائم ہوں"
مذہب والوں کا خدا صوفیوں کے خدا کے مقابلہ میں محدود ہے۔ بدیں وجہ اپنے ہی مسلک کے لوگوں کی تعریف اور غیر مسلک والوں کی مذمت جہالت اور نا انصافی ہے۔ لامذہب اور بت پرست بھی خدا کے بندے ہیں اور خدا کی صورت پر پیدا کئے گئے ہیں اور اس کے بندے ہمدردی کے زیادہ مستحق ہیں گو شریعت ان کے لیے سزائے موت ہی کیوں نہ تجویز کرے بلحاظ اس کے کہ وہ ہستی حق کا ایک پہلو ہے ابن العربی یہ تقریح کرتے ہیں کہ افعال انسانی خود مختارانہ ہیں مگر ان کے مسلک میں اس اختیار کے عام فہم معنی نہیں۔ خدا خود افعال کا صدور بمقتضائے فطرت الٰہی فرماتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی لامحدود صفات لامحدود آثار مترتب ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نور و ظلمت، نیکی اور بدی، اور دیگر اضداد کا ظہور بھی یقینی ہے اور ان اضداد کے بغیر علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ چونکہ شر محض کا وجود ہی نہیں دوزخ ایک عارضی چیز ہے جس سے دوزخی بالآخر نجات پا جائیں گے۔ (باقی)

انسانیت کی تقسیم کے مختلف پہلو

(۲)

از جناب مولانا مناظر احسن گیلانی

سیاسی تقسیم جو اندر تھا جس کی ساری بلندیاں، برتریاں صرف باطنی صفات کے ساتھ وابستہ تھیں، تعریف کے وقت خواہ مخواہ لوگوں نے اس بیچارے کو اندر سے گھسیٹ کر باہر نکالا۔ ایک اور صرف ایک یہی ذہنی غلطی تھی، اگر تم نے دیکھا! کہ محض اس کی بدولت اغلاط کے کتنے ہمالیہ تھے جن کے نیچے آدم کی نسل زمین کے ہر حصہ میں دفعۃً دب گئی، اور کچھ اس طرح دبی کہ اب ان چٹانوں کا سرکانا شاید بشر کی کمزور قوت سے تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ بیرونی تقسیم کے مباحث کو صرف اسی نقطہ پر ختم کر دوں لیکن ابھی ایک مغالطہ اور باقی ہے۔ ان ہی بیرونیوں میں ایک جماعت اور ہے جو انسانی نسل کو بجائے رنگ، زبان، خون، اور وطن کے ایک اور طریقہ سے تقسیم کرتی ہے، جس کا نام انہوں نے سیاسی تقسیم قرار دیا ہے، مطلب یہ ہے کہ دنیا کی مختلف سلطنتوں اور بادشاہتوں کی رعایا کو باہم ایک دوسرے سے وہ جدا کرتے ہیں اور اس طرح جدا کرتے ہیں کہ باوجود ایک ہی نوع کے افراد ہونے کے یہ ان آبادکاروں کو جو کسی ایک سلطنت کی قلمرو میں رہتے ہیں، ان کے ان بھائیوں سے توڑنا چاہتے ہیں جو کسی دوسری حکومت کے حلقۂ اثر و اقتدار میں زندگی بسر کرتے ہیں، گویا اس تقسیم کی بنیاد سلطنتوں کی تقسیم پر مبنی کی گئی ہے، کہا جاتا ہے اور شاید یہ کہنا چنداں غلط بھی نہ ہو، کہ انسانیت کی تمام خارجی تقسیمیں دراصل اسی تقسیم کے استحکام کے لیے تراشی گئی ہیں، لیکن کیا واقعہ میں یہ انسانیت کی تقسیم ہے؟ کیا فرق پیدا ہوتا ہے ان لوگوں میں جو مثلاً الف کی حکومت میں آباد ہیں اور ان میں جو ب کے حیطۂ اقتدار میں بود و باش کرتے ہیں؟

کیا انسانوں کی ان دو جماعتوں میں کوئی واقعی امتیاز پیدا ہوا ہے، یا ہو سکتا ہے؟ یقیناً دو مختلف سلطنتوں کے رہنے والوں میں نہ کسی چیز کا اضافہ ہوتا ہے۔ اور نہ کسی چیز کی کمی ہوتی ہے، پھر ایک کو چند قرار دینے پر انھیں کیوں اصرار ہے، جو اس وحدت میں واقعی تعدد پیدا کرنے سے قاصر ہیں؟۔

پس سچ یہ ہے کہ سیاسی تقسیم دراصل انسانیت کی تقسیم ہی نہیں ہے، بلکہ انسانی مملوکات کی تقسیم ہے اور بلاشبہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے مملوکات کو ان لوگوں سے بچائے جو اس کے جائز مالک نہیں ہیں اگر زید اپنے زر، اپنی زمین کی حفاظت میں اس حد تک کوشش کرتا ہے کہ اس راہ میں وہ اپنی جان سے بھی دریغ نہیں کرتا تو یقیناً یہ اس کا منصبی فریضہ ہے۔

"مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ"

"اپنے مال کے بچانے میں جو مارا گیا وہ شہید ہے (فتویٰ نبوی صحیح مسلم)

یہ ان کا فیصلہ ہے جو اس راہ میں قتل ہونے والوں کو اس وقت بھی دیکھتے ہیں جبتک وہ قتل نہیں ہوے، اور اس وقت بھی جب قتل ہو کر وہ بجائے غائب ہونے کے شہید اور نعمتوں کی دوسری دنیا میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پس اگر اشخاص کے لیے واجب ہے کہ اپنے مملوکات کو دوسروں کی دست برد سے بچائیں، پھر کیوں تعجب کیا جائے، اگر اقوام بھی اپنی اپنی ملکیتوں، یا اپنے بادشاہ کے مملوکات ان لوگوں سے بچانا چاہتے ہیں جو اس کے مالک نہیں ہیں؟ قدرت کا فطری قانون یہی ہے، اور شرعی مسئلہ بھی یہی ہے لیکن اس سچ کے لیے جھوٹ کی پناہ ڈھونڈھنے کی کیا حاجت ہے؟ مملوکات و مقبوضات کو جدا کرنے کی خاطر خود انسانیت کی چیر پھاڑ کے لئے وہ اپنی چھری کیوں تیز کرتے ہیں؟

الحاصل اگر سیاسی تقسیم انسانی مملوکات کی تقسیم ہے تو یہ ایک واقعہ ہے اور شخصی، قومی ہر قسم کے مملوکات کے لیے تقسیم کا یہ دائرہ وسیع ہے صحیح ہے لیکن اگر اس کے ذریعہ سے خود انسانوں کی تجزی و تفریق مقصود ہے

تو یہ تقسیم بھی انہی تقسیموں میں سے ایک قرار پائے گی جس کی بنیاد کسی واقعہ پر نہیں بلکہ صرف فرض (وہم اختراع) کی ہوائی نیو پر قائم ہے۔

کیا جھنڈوں کی لکڑیوں پر جو دھجیاں لپیٹی جاتی ہیں یا بانس کے لٹھوں سے جو چیتھڑے باندھے جاتے ہیں ان کے نت نئے رنگوں - اور بوقلموں دھاریوں کو تم ان لوگوں میں دکھا سکتے ہو جن کی طرف منسوب کرکے ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ جن کا رنگ یہ نہیں ہے وہ ہم میں سے نہیں ہیں؟ ان میں سے کون پیلا اور نیلا ہوتا ہے؟ کس کے بدن پر آڑی ترچھی لکیریں ہوتی ہیں؟ سونے اور روپے یا ان جیسی معدنی دھاتوں پر جو نقشے کاٹے جاتے ہیں، یا ٹھپے ابھارے جاتے ہیں کیا ان کو ان لوگوں کی پیشانیوں اور بازوؤں پر بھی ٹٹولا جا سکتا ہے، جن کو باور کرایا گیا کہ ان سے جدا ہو جاؤ، جن میں ان بیل بوٹوں صورتوں اور مورتوں والے سکوں کا چلن نہیں ہے؟

سیدھی باتوں کو ٹیڑھی راہوں سے کیوں تلاش کیا جاتا ہے؟ مملوکات و مقبوضات کی جدائی سے ذات کی جدائی کا نظریہ آخر کس لیے پیدا کیا گیا، یقیناً اگر زمینوں کو، مالوں کو روپوں اور پیسوں کو نہ بانٹا جائے گا تو ان سے باطمینان قلب آزادی کے ساتھ نفع اٹھانے کی راہ بنی آدم پر بند ہو جائیگی۔ بانٹو! جو چیزیں بٹی ہوئی ہیں کاٹو جو چیزیں کٹی ہوئی ہیں لیکن جڑے ہوؤں کو اسی غرض اور صرف اسی غرض کے لیے کیوں توڑتے ہو؟ اس کیلئے اوہام میں واقعات کا رنگ کیوں بھرتے ہو؟ جو گھی سیدھی انگلیوں سے نکل آتا ہے اس کے لیے اپنی پوروں کو کیوں ٹیڑھا کرتے ہو؟ جائز چیزوں کو ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر تمھیں کیوں اصرار ہے؟

الحاصل انسانیت کی وہ ساری تقسیمیں جن کی بنیاد بجائے اندر کے باہر پر اور بجائے باطن کے ظاہر پر رکھی جاتی ہے دراصل یہ فطرت کے اٹل قانون سے سرکشی ہے،

انسانیت کی صحیح تقسیم | قدر و قیمت، رفعت و منزلت، افضلیت و اہمیت جیسا کہ بار بار کہا گیا جب

ہر اعتبار سے آدمی کے اندر ہی کو دیکھا جاتا ہے، اور اس کے باطن ہی کو تا یا جاتا ہے تو قسمت کے وقت
کن بدقسمتوں نے کہا کہ انسان کو باہر لایا جائے جنہوں نے یہ کیا' یا کر رہے ہیں، یا آیندہ کریں گے
ان کے نتائج ہمیشہ وہی ہوں گے . جو اب تک ہوئے ہیں اور ان کو یونہی ہونا چاہیے، ولن تجد
لسنۃ اللہ تبدیلا لیکن دنیا کی وہ جماعت جو انسانوں کی ضروریات اور حاجات سے نہیں
ان کی سواری اور روشنی سے نہیں، ان کے کپڑوں اور جوتوں سے نہیں، بلکہ خود انسانوں سے
بحث کرتی ہے اور جن کی بحث کا موضوع وہ چیزیں نہیں ہیں، جو انسان کے لیے ہیں، بلکہ جنہوں
نے اپنی نظر و فکر کا مرکز خود انسان کو بنا کر یہ سوال اٹھایا کہ خود انسان کس لیے ہے ؟ ہم جنھیں اپنی
اصطلاح میں ادیان و ملل کے بانی کہتے ہیں، اور جن کا آسمانی خطاب انبیاء و رسل ہے (صلوات اللہ
علیہم اجمعین) تقسیم کے وقت ان کی نگاہیں بجائے ظاہر کے ہمیشہ انسان کے باطن ہی پر
پڑیں اور یہی وہ میدان ہے جہاں انسان بانٹا جاتا ہے اپنے اندرونی احساسات و ادراکات
کی بنیاد پر بانٹا جاتا ہے اپنی دماغی کیفیات ذہنی تغیرات کی بنیاد پر بانٹا جاتا ہے اپنے خیالات
و عقائد کی بنیاد پر کہ انسان کی ساری دولت اندر ہے، ورنہ جیسا کہ میں چیختا چلا آ رہا ہوں کہ اس
کے باہر میں تو شاید اتنا بھی نہیں ہے، جتنا بیابان کے چرندوں، اور جنگل کے درندوں، درختوں کے
پرندوں، دریاؤں کے باشندوں کے پاس ہے۔

اور یقیناً یہی وہ تقسیم ہے کہ بآسانی اس تفریق کو جمع سے، اس افتراق کو اتفاق سے اس کثرت کو وحدت
سے بدلا جا سکتا ہے، کہ خیالات بدلے جا سکتے ہیں، اور ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں احساسات و عقائد
میں تغیر ہو سکتا ہے، اور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔

پس جو ان بنیادوں پر توڑے گئے ہیں یا ٹوٹ گئے ہیں، تھوڑی کوشش سے وہ جوڑے
جا سکتے ہیں یا جڑ سکتے ہیں وہ آنکھوں میں خاک جھونکتے ہیں عقل پر پتھر مارتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ

کسی کالے کو گورا بنانا اتنا دشوار نہیں ہے جتنا کہ کسی ہندو کو عیسائی بنانا۔ کالی کھال کو کس نے اجلا کیا؟ اور کر سکتا ہے؟ لیکن ہندوؤں کو عیسائی یا عیسائیوں کو مسلمان ہوتے ہوئے کس نے نہیں دیکھا، اور کون نہیں دیکھ رہا ہے؟ تورانی نسل کے آدمی کو آریوں کے خون میں کون شریک کر سکتا ہے؟ لیکن رومن کیتھولک کی کتنی آبادیاں تھیں جہاں اب صرف پروٹسٹنٹ آباد ہیں۔ بحال قوموں کو ایک مذہب سے علیحدہ ہو کر دوسرے مذہب کی تعلیمات قبول کرتے ہوئے کب نہیں دیکھا گیا اور کہاں نہیں دیکھا جا رہا ہے؟ لیکن چینی بولنے والی قوموں کو بنگالی زبان کے بولنے پر آمادہ ہوتے ہوئے کبھی سنا گیا؟ یا کہیں مشاہدہ کیا گیا؟ افراد کی زبانیں بدلتی ہیں، اور بدلی جا سکتی ہیں لیکن قوموں کی زبانوں کا بدلنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا کہ ان کے خیالات میں انقلاب پیدا کرنا۔ پانی کی طرح تقریباً نصف صدی سے دیکھو کہ آدمی کی کمائی ہوئی دولت صرف اس غرض سے ہندوستان میں بے دردی کے ساتھ بہائی جا رہی ہے کہ جن ہندوستانیوں کی زبان ہندوستانی (اردو) ہے وہ انگلستانی بولی بولنے لگیں کوئی دقیقہ ہے جو اس کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے؟ عمارتوں کا دھوکہ دیا جاتا ہے۔ فرنیچروں کا مغالطہ پھیلایا جا رہا ہے، ہر ہر صوبہ میں کتب خانوں کو فلک نما ایوانوں اور مدرسوں کو سحر بیا دیوانوں کی شکل تک ترقی دی گئی ہے، اور دی جا رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ قانون بھی ملک کے طول و عرض میں نافذ کیا گیا ہے کہ رزق کے وہ سارے دروازے جسے حکومت نے کھولا ہے ان پر قطعاً بند کر دیے گئے جو انگریزی نہیں جانتے، عزت کی کرسیوں سے ہندوستان میں وہ محروم کیے جاتے ہیں۔ جو جزائر برطانیہ کی زبان سے جاہل ہیں، اخباروں رسالوں کانفرنسوں، اور لیڈروں خطیبوں اور مقرروں سب کے اندر سے یہی آواز پیدا کی جا رہی ہے کہ زندگی صرف ان کے لیے ہے، جو انگریزی جانتے ہیں، موت کا انتظار وہ کریں جو اس زبان سے اب تک بیگانہ ہیں، اوپر نیچے، چپ و راست، آگے پیچھے، جدھر نظر اٹھاؤ صرف انگریزی کے حروف، انگریزی کے بورڈ، انگریزی کے تختے

الغرض آسمان بھی انگریزی بنایا گیا ہے، اور زمین بھی انگریزی ہی میں غرق ہے لیکن کاوش کی ان سرگرمیوں، اور کوشش کی ان ہنگامہ آرائیوں کے بعد نتیجہ کیا ہے؟ ملک کے دس فی صدی باشندوں نے ابھی صرف انگریزی سیکھی ہے، اور اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر اس کو اپنی زبان نہیں بنایا ہے۔ روس کے آبادکاروں نے صرف چند سالوں میں سرمایہ داری کے نظام کا انکار کر کے بولشویکی نظام کو قبول کر لیا، کیا اسی سہولت کے ساتھ زشین قبائل سے انگریزی زبان بلوائی جا سکتی ہے؟ پھر جو ہمالیہ میں بستے ہیں۔ ان کو تم ہندوستانی کس طرح بنا لوگے؟ کس کا بوتا ہے، کہ گنگا، جمنا، گوداوری اور کرشنا کی وادیوں میں، ان برفستانی زمینوں کو مدغم کر دے جسے جغرافیہ والے سائبریا کا خطہ کہتے ہیں؟ وہ جو تقسیم کی ایک بھدی اور غلط شکل سیاسی بھی بالفرض اگر یہ تقسیم انسانیت ہی کی تقسیم ہو، تو کیا دنیا کے سلاطین اور حکومتوں کو کوئی وحدت کے اس نقطہ پر لا سکتا ہے کہ ان میں ہر ایک اپنے اپنے مملوکات سے دست کش ہو کر چند حکومتوں کو صرف ایک حکومت کی شکل میں بدل دے؟ اگر یہ ممکن تھا یا ہے، تو ہوائی جہازوں کی یہ قطاریں کس لیے منڈلا رہی ہیں، زہر بھرے ہوئے گیسوں کا ذخیرہ کیوں اکٹھا کیا جا رہا ہے، توپوں اور بندوقوں کے لیے پہاڑ کس لیے گلائے جا رہے ہیں، خون کی ان ندیوں اور نالوں، بلکہ دریاؤں اور سمندروں کی کھدائی کس لیے ہو رہی ہے جن میں صرف انسان کی لاشیں پیرائی جائیں گی؟

تتبعها الرادفہ

حقوق الزوجین

(۲)

اصول قانون | قانون کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ اسلامی قانون ازدواج کی تدوین کن اصول پر کی گئی ہے، اس لیے کہ جب تک اصول ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہوں جزئی مسائل میں قانون کے احکام کو صحیح طریقہ سے نافذ کرنا مشکل ہے۔

اصل اول | اصول قانون میں پہلی اصل جس پر بہت سے احکام متفرع ہوتے ہیں، یہ ہے کہ ازدواجی زندگی میں مرد کو عورت سے ایک درجہ زائد دیا گیا ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ اس درجہ کی تشریح ہم کو اس آیت میں ملتی ہے:۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ (ع ۶)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔ اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔ پس جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی اور ان کی غیر موجودگی میں بتوفیق الٰہی ان کے حقوق کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

یہاں اس بحث کا موقع نہیں کہ مرد کو عورت پر فضیلت کس بنا پر ہے اور اس کو قوام کیوں بنایا گیا ہے؟ یہ قانون کی نہیں کلام کی بحث ہے، اپنے موضوع کے دائرے میں رہ کر ہم یہاں صرف اس امر کی صراحت کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ کہ خانگی زندگی کے نظم کو برقرار رکھنے کے لیے بہر حال زوجین میں سے ایک کا قوّام اور صاحب امر ہونا ضروری ہے۔ اگر دونوں بالکل مساوی درجہ اور مساوی

[illegible] رکھنے والے ہوں تو بدنظمی کا پیدا ہونا یقینی ہے، جیسی کہ فی الواقع ان قوموں میں رونما ہو رہی ہے جنہوں نے عملاً زوجین کے درمیان مساوات پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لیے اس نے انسانی فطرت کا لحاظ کر کے زوجین میں سے ایک کو قوام اور صاحب امر اور دوسرے کو مطیع و ماتحت بنانا ضروری سمجھا، اور قوامیت کے لیے اس فریق کا انتخاب کیا جو فطرۃً اس درجہ کے لیے پیدا ہوا ہے۔

[illegible] اسلامی قانون کے ماتحت ازدواجی زندگی کا جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں [illegible] قوام کی ہے، اور اس حیثیت میں اس پر حسب ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں۔

[illegible] ت کا مہر ادا کرے، کیونکہ اس کو عورت پر جو حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں وہ [illegible] میں۔ اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگرچہ اصل فطرت کے لحاظ [illegible] قوامیت کا مستحق ہے، مگر بالفعل یہ مرتبہ اس کو اس مال کے معاوضہ میں ملتا ہے جو وہ مہر کی [illegible] خرچ کرتا ہے۔ اس کی تشریح دوسری آیات میں بھی کی گئی ہے، مثلاً۔

وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (۴: ۴) — اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ ادا کرو۔

وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم ... فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (۴: ۴)۔ — محرمات کے سوا باقی سب عورتیں تمہارے لیے حلال کی گئیں کہ اپنے اموال کے بدلے تم ان کو نکاح میں لاؤ ... پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے میں قرارداد کے مطابق تم ان کے مہر ادا کرو۔

فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (۴: ۴)۔ — پس لونڈیوں سے ان کے مالکوں کی اجازت پر نکاح کر لو اور اقتصاد و احسان کے ساتھ ان کے مہر ادا کرو

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ — اور حلال کی گئیں تمہارے لیے عزت دار عورتیں مسلمانوں

مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ　　میں سے اور عزت دار عورتیں ان لوگوں میں سے
إِذَا آتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ (۵:۱)۔　　جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی ہے جب کہ تم
ان کے مہر ادا کرو۔

پس نکاح کے وقت عورت اور مرد کے درمیان مہر کی جو قرارداد ہوئی ہو اس کو ادا کرنا مرد پر لازم ہے۔ اور اگر وہ اس قرارداد کو پورا کرنے سے انکار کرے تو عورت کو حق ہے کہ اپنے نفس کو اس سے روک لے۔ یہ ایسی ذمہ داری ہے جس سے سبکدوش ہونے کی کوئی صورت مرد کے لیے بجز اس کے نہیں ہے کہ عورت یا تو اس کو مہلت دے یا اس کی ناداری کا لحاظ کر کے بخوشی معاف کر دے، یا اس پر احسان کر کے برضا و رغبت اپنے حق سے دست بردار ہو جائے۔

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ　　پھر اگر وہ خوش دلی کے ساتھ مہر کا کچھ حصہ معاف
هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا۔ (۴:۱)　　کر دیں تو اس کو مزے سے کھا سکتے ہو۔
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ　　اور اگر تم قرارداد کے بعد آپس میں کمی بیشی پر
بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ (۴:۴)۔　　رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔

۲۔ نفقہ: شوہر کا دوسرا فرض نفقہ ہے۔ قانون اسلام نے زوجین کے حدود عمل الگ الگ مقرر کر دیے ہیں۔ عورت کا کام گھر میں بیٹھنا اور خانگی زندگی کے فرائض انجام دینا ہے۔ (وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ) اور مرد کا کام کمانا اور اپنے اہل کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرنا ہے۔ یہ دوسری چیز ہے جس کی بنا پر مرد کو اپنی بیوی پر فضیلت کا ایک درجہ دیا گیا ہے۔ اور یہ چیز قوامیت کے معنی میں داخل ہے۔ قوام لغت میں اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی شے کی نگہبانی اور خبرگیری کرنے والا ہو اور اسی حیثیت سے اس شے پر اقتدار

لہ اسی کو مہر مؤجل کہتے ہیں مگر آج کل مہر مؤجل کا مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ وقت پر ہزاروں لاکھوں کی رقم باندھ دی جاتی ہے اور اس کا ادا کرنا محض ایک رسمی خیال کیا جاتا ہے گویا ابتدا ہی سے ادا کرنے کی نیت نہیں ہوتی حالانکہ اس نیت کے ساتھ نکاح کیا جائے وہ عند اللہ زنا ہے۔

رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی آیت الرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ الخ میں وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ سے جس طرح مہر کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اُسی طرح نفقہ کا وجوب بھی ثابت ہوتا ہے۔ اگر شوہر اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو قانون اس کو ادا کرنے پر مجبور کرے گا۔ اور بصورت انکار یا بصورت عدم استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دے گا لیکن نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہشات پر مبنی نہیں ہے، بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ قرآن مجید نے اس بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے کہ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۔ مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور مفلس پر اس کی استطاعت کے مطابق یہ نہیں کہ غریب آدمی سے وہ نفقہ وصول کیا جائے جو اس کی حیثیت سے زیادہ ہو یا مالدار آدمی وہ نفقہ دے جو اس کی حیثیت سے کم ہو۔

۳ ظلم سے اجتناب | مرد کا تیسرا فرض یہ ہے کہ اس کو عورت پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات دیے گئے ہیں ان کو ظالمانہ طریقہ سے استعمال نہ کرے۔ ظلم کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً :۔

ایلاء | عورت کے داعیات نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائز[1] کے بغیر اعراض کرنا، جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو۔ اس کے لیے قانون اسلام نے زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی ہے۔ اس مدت کے اندر مرد پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلق زن و شو قائم کرے۔ ورنہ انقضائے مدت کے بعد اس کو مجبور کیا جائے گا کہ عورت کو چھوڑ دے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ	جو لوگ اپنی عورتوں سے ایلا کرتے ہیں۔ ان کے لیے چار
اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	مہینے کی مہلت ہے۔ اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا
رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ	والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا عزم کرلیں تو اللہ سننے

[1] عذر جائز سے مراد مرد یا عورت کی بیماری یا مرد کا حالت سفر میں ہونا، یا کوئی اور ایسی صورت پیش آجائے جس میں مرد اپنی بیوی کی طرف رغبت رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے پر قادر نہ ہو۔

سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (۲: ۲۲۸)۔ اور جاننے والا ہے۔

اس مسئلہ میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے یعنی اگر مرد نے اپنی عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے تب تو ایلاء ہوگا۔ اور یہ حکم جاری کیا جائے گا، لیکن اگر قسم نہیں کھائی ہے تو خواہ وہ دس برس بھی اس سے علیحدہ رہے۔ اس پر ایلاء کا اطلاق نہ ہوگا لیکن یہ بات قانون اسلامی کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ اس قاعدہ کلیہ کے ماتحت قرآن مجید میں عورت کی فطری قوت برداشت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر سزا کے طور پر عورت کو صحبت سے محروم کیا جائے تو یہ سزا صرف اتنی مدت کے لیے ہونی چاہیے جس کو وہ برداشت کر سکتی ہے۔ اس مدت سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالایطاق ہے، اور اس کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائے جس سے مرد و عورت کو محفوظ رکھنا اسلامی قانون کا اولین مقصد ہے پس آیت مذکورالصدر کا اصل مدعا نص یہ ہے کہ عورت کو ترک صحبت کی تکلیف چار مہینے سے زیادہ مدت کے لیے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا، تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، اور قسم کھا لینے سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام میں سے جو لوگ تفقہ فی الدین کا شرف رکھتے تھے (مثلاً سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبد اللہ ابن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر) ان کی رائے اس باب میں یہی تھی کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑ دینا ایلاء ہے، خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو (احکام القرآن للجصاص الحنفی ج ۱۔ ص ۴۲۰)

فان عزموا الطلاق کی تفسیر میں بھی اختلاف ہوا ہے۔ حضرات عثمان ابن عفان، زید بن ثابت، ابن مسعود، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہ ہے کہ چار مہینہ کی مدت کا گذر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے، لہٰذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کا حق باقی

نہیں رہتا حضرات علی و ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے مگر ایک دوسرا قول جو مذکورالذکر دونوں بزرگوں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پہنچا ہے، یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر کو نوٹس دیا جائے گا کہ یا اپنی بیوی سے رجوع کر یا اس کو طلاق دے دو۔ لیکن جب ہم آیت کے الفاظ پر غور کرتے ہیں تو پہلا قول ہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ تعالیٰ نے مُولی کو بالفاظ صریح صرف چار مہینہ کی مہلت دی ہے۔ اس کو رجوع کا حق اس مہلت کے اندر ہے، اور اس کے ختم ہوجانے پر دوسری صورت بجز عزیمت طلاق کے اور کوئی نہیں ہے اب اگر کوئی شخص چار مہینہ کے بعد اس کو رجوع کا حق دیتا ہے تو گویا وہ اس کی مہلت میں اضافہ کرتا ہے، جو کتاب اللہ کی مقرر کی ہوئی حد سے صریح تجاوز ہے۔

ضرار اور تعدی؛ عورت سے رغبت نہ ہو اس کو رکھنا نہ چاہے اگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے اس کو نہ چھوڑے بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسرے طلاق سے پہلے رجوع کرے۔ قرآن مجید میں اس کو نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ	اور ان کو ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے نہ روک رکھو
ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ	جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرے گا۔ اللہ کی
اللَّهِ هُزُوًا (۱۴۲)	آیات کو ٹھٹھا نہ بنالو۔

ضرار اور تعدی کے الفاظ نہایت وسیع ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ستانے اور زیادتی کرنے کی نیت سے کسی عورت کو روک رکھے گا وہ ہر طرح سے اس کو آزار پہنچائے گا، روحانی اور جسمانی تکلیفیں دے گا، ادنی الطبقہ کا ہوگا تو مار پیٹ اور گالم گلوچ کرے گا۔ اونچے طبقے کا ہوگا تو تذلیل اور ایذارسانی کے دوسرے طریقے اختیار کرے گا۔ ضرار اور تعدی کے الفاظ ان سب پر حاوی ہیں، اور قرآن مجید کی رو سے یہ سب افعال ممنوع ہیں۔ جو شوہر اپنی بیوی کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرتا ہے وہ اپنی جائز

حد سے تجاوز کا مرتکب ہوتا ہے اور ایسی صورت میں عورت اس کی مستحق ہے کہ قانون کی مدد لے کر اس مرد سے چھٹکارا حاصل کرے۔

ازواج میں عدل نہ کرنا | متعدد بیویاں ہونے کی صورت میں عدل نہ کرنا، اور کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا۔ یہ بھی قرآن کی رو سے ممنوع ہے۔

فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (۴ : ۱۹)۔ — کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق رکھ چھوڑو۔

قرآن میں تعدد ازواج کی اجازت عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر عدل نہ ہو تو اجازت آپ سے آپ منسوخ ہو جاتی ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے، یہ صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (۴ : ۱)۔ — پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا لونڈی جو تمہارے قبضہ میں ہو۔ یہ زیادہ قرین مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔

امام شافعی رحمۃ اللہ نے اَلَّا تعولوا کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں عول کے معنی میل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے:-

بمیزان صدق لا یخس شعیرۃ　　وو زان قسط و زنہ غیر عائل

یہاں عائل یعنی مائل مستعمل ہوا ہے۔ اسی اصل سے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، چنانچہ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی، عکرمہ اور قتادہ

وغیرہم نے لا تعولوا کے معنی لا تمیلوا عن الحق کیے ہیں۔ لہٰذا قرآن مجید کی مذکورۂ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا، اور ایک کی طرف جھک کر دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے، تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ قانون ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرے گا۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہوگا۔

عدل کے باب میں قرآن کریم نے تصریح کر دی ہے کہ دلی محبت کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس میں مساوات برتنے پر انسان قادر نہیں، اور نہ اس کے لیے مکلف ہے (وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ) البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ نفقہ اور معاشرت اور تعلقات زن و شو میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔

مرد کے امتیاز کی یہ تین صورتیں ایسی ہیں جن میں قانون مداخلت کر سکتا ہے۔ ان کے علاوہ زوجین کے باہمی تعلقات میں بہت سے ایسے معاملات بھی پیش آسکتے ہیں اور آتے رہتے ہیں جو مودت و رحمت کے منافی ہیں۔ مگر ان میں قانون کے لیے مداخلت کی گنجائش نہیں ہے قرآن مجید نے ایسے معاملات کے لیے شوہروں کو عام اخلاقی ہدایات دی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورت کے ساتھ مرد کا برتاؤ فیاضانہ اور محبت آمیز ہونا چاہیے۔ رات دن کی ٹھکا فضیحتی کے ساتھ زندگی گذارنا حماقت ہے اگر عورت کو رکھنا ہے تو سیدھی طرح سے رکھو۔ نہ بنے تو سیدھی طرح رخصت کر دو۔ قرآن کی ان ہدایات کو قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کیا جا سکتا، اور نہ یہ ممکن ہے کہ میاں بیوی کے ہر جھگڑے میں قانون مداخلت کیا کرے، لیکن اس سے قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عدل و انصاف اور رحمت و مودت کے برتاؤ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کرتا ہے۔

مرد کے حقوق | مرد کو قوامیت کا مرتبہ جن ذمہ داریوں کے ساتھ دیا گیا ہے وہ اوپر بیان ہوئیں۔ اب دیکھنا

چاہیے کہ قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کے حقوق کیا ہیں۔

حفظ للغیب | عورت پر مرد کا پہلا حق قرآن مجید نے ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے جن کا بدل کسی دوسری زبان میں مہیا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ کہتا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ ..... حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔ (۴ : ۶)۔	جو نیک عورتیں ہیں وہ غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ماتحت۔

یہاں حفظ للغیب سے مراد ہر اس چیز کی حفاظت کرنا ہے جو شوہر کی ہو اور اس کی غیر موجودگی میں بطور امانت عورت کے پاس رہے۔ اس میں اس کے نسب کی حفاظت اس کے نطفہ کی حفاظت اس کے مال کی حفاظت، اس کے رازوں کی حفاظت، غرض سب ہی کچھ آجاتا ہے اگر عورت ان حقوق میں سے کسی حق کو ادا کرنے میں کوتاہی کرے تو مرد کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

شوہر کی اطاعت | مرد کا دوسرا حق یہ ہے کہ عورت اس کی اطاعت کرے۔ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (۴: ۶) جو نیک عورتیں ہیں وہ شوہروں کی اطاعت کرنے والی ہیں۔ یہ ایک عام حکم ہے جس کی تشریح میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد چیزیں بیان فرمائی ہیں :۔ مثلاً۔

ان لکم علیھن ان لا یوطئن فرشکم احدًا تکرھونہٗ۔	تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ تمہارے ہاں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کو تم ناپسند کرتے ہو۔
لاتصدق بشیءٍ من بیتہٖ الا باذنہٖ فان فعلت کان لہ الاجر وعلیھا الوزر ولا تخرج من بیتہٖ الا باذنہٖ۔	وہ اس کے گھر میں سے کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ نہ کرسکے اگر ایسا کرے گی تو اجر شوہر کو ملے گا اور گناہ عورت پر ہوگا نیز وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر سے نہ نکلے۔

لا تصوم المرأة یوماً وزوجها شاهد من غیر رمضان الا باذنہ۔ عورت اپنے شوہر کی موجودگی میں رمضان کے سوا کوئی نفل روزہ اس کی اجازت کے بغیر ایک دن بھی نہ رکھے۔

خیر النساء امرأة اذا نظرت الیها سرتك واذا امرتھا اطاعتك واذا غبت عنھا حفظتك فی مالك ونفسھا۔ بہترین عورت وہ ہے کہ جب تو اس کو دیکھے تو تیرا دل خوش ہوجائے اور جب تو اس کو کوئی حکم دے تو وہ تیری اطاعت کرے اور جب تو اس کے پاس موجود نہ ہو تو وہ تیرے مال اور اپنے نفس میں تیرے حق کی حفاظت کرے۔

اس عام حکم اطاعت میں صرف ایک استثنا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر عورت سے اس کا شوہر اللہ کی معصیت کا مطالبہ کرے تو وہ اس حکم کو ماننے سے انکار کرسکتی ہے۔ مثلاً وہ فرض نماز اور روزے سے منع کرے، یا شراب پینے کا حکم دے، یا پردہ شرعی ترک کرائے، یا فواحش کا ارتکاب اس سے کرانا چاہے تو عورت نہ صرف اس کی مجاز ہے، بلکہ اس کا فرض ہے کہ شوہر کے ایسے حکم کو ٹھکرادے، اس لیے کہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ اس صورت خاص کے سوا باقی تمام صورتوں میں شوہر کی اطاعت عورت کا فرض ہے۔ اگر نہ کرے تو ناشزہ ہوگی اور شوہر کو وہ اختیارات استعمال کرنے کا حق ہوگا جن کی تفصیل آگے آتی ہے۔

مرد کے اختیارات قانون اسلام نے چونکہ مرد کو قوام بنایا ہے، اور اس پر عورت کے مہر، نفقہ، اور نگہبانی وخبرگیری کی ذمہ داری عائد کی ہے، اس لیے وہ مرد کو عورت پر چند ایسے اختیارات عطا کرتا ہے جو خانگی زندگی کا نظم برقرار رکھنے، اور اپنے گھر کے اخلاق اور حسن معاشرت کی حفاظت کرنے، اور خود اپنے حقوق کو اتلاف سے بچانے کے لیے اس کو حاصل ہونے ضروری ہیں۔ قانون اسلام میں ان اختیارات کو بوضوح بیان کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ وہ حدود بھی متعین کردی گئی ہیں جن کے اندر یہ اختیارات استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

نصیحت، تادیب اور تعزیر اگر عورت اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے، یا اس کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرے تو ایسی صورت میں مرد پر لازم ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کرے، نہ مانے تو اس کو اختیار ہے کہ اپنے بناؤ میں حسب ضرورت اس کے ساتھ سختی کرے، اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو وہ اس کو مار سکتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس کی اطاعت کرنے لگے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ	اور جن عورتوں سے تم نشوز[1] دیکھو ان کو نصیحت کرو،
وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ	اور بستروں پر ان کو چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ اگر وہ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا	تمہاری اطاعت کریں تو پھر ان پر سختی کرنے کا کوئی
(۴:۶)۔	طریقہ نہ ڈھونڈو۔

اس آیت میں واهجروهن فی المضاجع (یعنی بستروں پر ان کو چھوڑ دو) سے سزا کے طور پر ترک مباشرت کی اجازت دی گئی ہے، مگر آیت ایلاء نے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اس کے لیے ایک فطری حد مقرر کر دی ہے۔ ہجر فی المضاجع کی حد چار مہینے کی ہے۔ جو عورت اتنی نافرمان اور شوریدہ سر ہو کہ شوہر ناراض ہو کر اس کے ساتھ سونا چھوڑ دے، اور وہ جانتی ہو کہ چار مہینے تک یہ حالت قائم رہنے کے بعد شوہر از روئے احکام الٰہی اس کو طلاق دیدے گا، اور پھر بھی وہ اپنے نشوز سے باز نہ آئے، وہ اسی قابل ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔ چار مہینے کی مدت اس کو ادب سکھانے کے لیے کافی ہے۔ اس سے زیادہ مدت تک یہ سزا دینا غیر ضروری ہوگا، کیونکہ اتنے دن تک اس کا نشوز پر قائم رہنا یہ جانتے ہوئے کہ اس کا نتیجہ طلاق ہے، اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں ادب سیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے، یا وہ حسن معاشرت کے ساتھ کم از کم اپنے اس شوہر سے نباہ نہیں سکتی۔ نیز اس سے وہ مقاصد بھی فوت ہونے کا اندیشہ ہے جن کے لیے ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ رشتہ مناکحت میں باندھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ

[1] نشوز کے معنی ارتفاع کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد ادائے حق سے اعراض ہے خواہ وہ عورت کی طرف سے ہو یا مرد کی طرف سے

ایسی حالت میں شوہر اپنی خواہشات نفس پوری کرنے کے لیے کسی ناجائز طریقہ کی طرف مائل ہو جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عورت کسی اخلاقی فتنہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ بھی اندیشہ ہے کہ جہاں احد الزوجین اس قدر ضدی اور شوریدہ سر ہو وہاں زوجین میں مودت و رحمت قائم نہ ہو سکے گی۔

امام سفیان ثوری سے واھجروھن فی المضاجع کے معنی میں ایک دوسرا قول منقول ہے۔ وہ کلام عرب سے استدلال کرکے کہتے ہیں کہ ہجر کے معنی باندھنے کے ہیں۔ ھجر البعیر اذا ربطه صاحبه بالھجاد۔ ہجار اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی پیٹھ اور ٹانگوں کو ملا کر باندھی جاتی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب وہ نصیحت نہ قبول کریں تو گھر میں ان کو باندھ کر ڈال دو۔

دوسری سزا جس کی اجازت زیادہ شدید حالات میں دی گئی ہے، مارنے کی سزا ہے مگر اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرب غیر مبرح کی قید لگا دی ہے۔ یعنی ضرب شدید نہ ہونی چاہیے

اضربوھن اذا عصینکم فی المعروف۔ اگر وہ تمہارے کسی جائز حکم کی نافرمانی کریں

ضربا غیر مبرح۔ تو ان کو ایسی مار مارو جو زیادہ تکلیف دہ نہ ہو۔

ولا یضرب الوجه ولا یقبح۔ منہ پر نہ مارے اور گالم گلوچ نہ کرے۔

یہ دو سزائیں دینے کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے، مگر جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، سزا اس نافرمانی پر دی جا سکتی ہے جو "معروف" میں ہو۔ یعنی ایسے احکام میں جو مرد کے جائز حقوق سے متعلق ہوں، نہ یہ کہ ہر جا و بے جا حکم کی اطاعت پر اصرار کیا جائے۔ اور عورت نہ مانے تو اس کو سزا دی جائے۔ پھر قصور اور سزا کے درمیان بھی تناسب ہونا چاہیے۔ اسلامی قانون کے کلیات میں سے ایک کلیہ یہ بھی ہے کہ فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم جو کوئی

تم پر زیادتی کرے اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی ہے۔ زیادتی کی نسبت سے زیادہ سزا دینا ظلم ہے۔ جس قصور پر نصیحت کافی ہے اس پر ترک کلام۔ اور جس پر ترک کلام کافی ہے اس پر ہجر فی المضاجع، اور جس پر ہجر فی المضاجع کافی ہے اس پر مارنا ظلم میں شمار ہوگا۔ مار ایک آخری سزا ہے جو صرف شدید اور ناقابلِ برداشت قصور پر دی جا سکتی ہے۔ اور اس میں بھی وہ حد ملحوظ رکھنی ضروری ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔ اس سے تجاوز کرنے کی صورت میں مرد کا نشوز ہوگا، اور عورت کو حق ہو جائے گا کہ اس کے خلاف قانون سے استمداد کرے۔

طلاق | دوسرا اختیار مرد کو یہ دیا گیا ہے کہ جس عورت کے ساتھ وہ نباہ نہ کر سکتا ہو اس کو طلاق دیدے چونکہ مرد اپنا مال خرچ کر کے حقوق زوجیت حاصل کرتا ہے، اس لیے ان حقوق سے دستبردار ہونے کا اختیار بھی اسی کو دیا گیا ہے۔ عورت کو یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا تھا، کیونکہ اگر وہ طلاق کی مختار ہوتی تو مرد کا حق ضائع کرنے پر دلیر ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ صرف کر کے کوئی چیز حاصل کرے گا وہ اس کو آخری حد تک رکھنے کی کوشش کرے گا، اور صرف اس وقت اسے چھوڑے گا جب اس کے لئے چھوڑنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا لیکن اگر مال صرف کرنے والا ایک ہو، اور ضائع کرنے کا اختیار دوسرے کو مل جائے تو اس دوسرے شخص سے یہ امید کم کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے اس اختیار کے استعمال میں اس شخص کے مفاد کا لحاظ کرے گا جس نے مال صرف کیا ہے۔ پس مرد کو طلاق کا اختیار دینا نہ صرف اس کے جائز حق کی حفاظت ہے، بلکہ اس میں یہ بھی مصلحت مضمر ہے کہ طلاق کی کثرت نہ ہو۔

اصل دوم | اسلامی قانون ازدواج کی دوسری اصل یہ ہے کہ مناکحت کے تعلق کو امکانی حد تک مستحکم بنایا جائے، اور جو مرد و زن ایک مرتبہ اس رشتہ میں بندھ چکے ہوں ان کو باہم جمع رکھنے کی انتہائی کوشش کی جائے، مگر جب ان کے درمیان محبت اور موافقت کی کوئی صورت باقی نہ رہے

اور رشتہ مناکحت میں ان کے بندھے رہنے سے قانون کے اصل مقاصد فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ان کو نفرت و کراہیت اور طبایع کی ناموافقت کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رکھنے سے بہتر یہ ہے کہ ان کے لیے علیحدگی کا راستہ کھول دیا جائے اس معاملہ میں اسلامی قانون نے فطرت انسانی کی رعایت اور تمدنی مصالح کی حفاظت کے درمیان ایسا صحیح توازن قائم کیا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی قانون میں نہیں ملسکتی ایک طرف وہ رشتہ نکاح کو مستحکم بنانا چاہتا ہے مگر نہ اتنا مستحکم جتنا ہندو مذہب اور عیسائیت میں ہے کہ زوجین کے لیے مناکحت کی زندگی خواہ کتنی ہی شدید مصیبت بن جائے بہر حال وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہ ہوسکیں۔ دوسری طرف وہ علیحدگی کے راستے کھولتا ہے۔ مگر نہ اتنے آسان جتنے روس، امریکہ اور مغرب کے اکثر ممالک میں ہیں کہ ازدواجی تعلق میں سرے سے کوئی پائیداری ہی باقی نہ رہے، اور رشتہ ازدواج کی کمزوری سے عائلی زندگی کا سارا نظم درہم برہم ہو جائے

اس مسئلہ کے ماتحت علیحدگی کی جو صورتیں رکھی گئی ہیں وہ تین ہیں:- طلاق، خلع، اور قضائے قاضی

طلاق اور اس کی شرائط: اصطلاح شرع میں طلاق سے مراد وہ علیحدگی ہے جس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے مرد کو اس اختیار میں آزاد ہے۔ وہ جب چاہے اپنے ان حقوق زوجیت سے دست بردار ہوسکتا ہے جن کو اس نے مہر کے معاوضہ میں حاصل کیا تھا مگر شریعت اسلامی طلاق کو پسند نہیں کرتی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ تعالی الطلاق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے) اور تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات (شادیاں کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا) اس لیے مرد کو طلاق کا آزادانہ اختیار دینے کے ساتھ ایسی شرائط کا پابند کر دیا گیا ہے جن کے ماتحت وہ اس اختیار کو محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر ہی استعمال کر سکتا ہے

قرآن مجید کی تعلیم یہ ہے کہ اگر عورت تم کو ناپسند بھی ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کے ساتھ نباہنے کی کوشش کرو وعاشروھن بالمعروف فان کرھتموھن ان کے ساتھ سلوک نیک کے ساتھ رہو اگر وہ تم کو ناپسند

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْــٴًـا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا كَثِیْرًا (۴: ۳)۔ — بھی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اسی میں بہت کچھ بھلائی رکھ دے۔

لیکن اگر نباہ نہ کر سکتے ہو تو تم کو حق ہے کہ اس کو طلاق دے دو، مگر یک لخت چھوڑ دینا درست نہیں ہے۔ ایک ایک مہینہ کے فاصلہ سے ایک ایک طلاق دو۔ تیسرے مہینے کے اختتام تک تم کو سوچنے سمجھنے کا موقع حاصل رہے گا۔ ممکن ہے کہ اصلاح کی کوئی صورت نکل آئے، یا عورت کے رویہ میں کوئی خوش آیند تغیر ہو، یا خود تمہارا ہی دل بدل جائے۔ البتہ اگر اس مہلت میں سوچنے اور سمجھنے کے باوجود تمہارا فیصلہ یہی ہو کہ اس عورت کو چھوڑ دینا چاہیے تو پھر تیسرے مہینے کے ختم پر آخری طلاق دے دو جو تم کو عورت سے قطعی طور پر جدا کر دے گی۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ (۲: ۲۹)۔ — طلاق دو مرتبہ ہے، پھر یا تو نیکی کے ساتھ روک لیا جائے یا پھر احسان کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔

وَ الْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۔ ۔ ۔ ۔ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْۤا اِصْلَاحًا (۲: ۲۸) — مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیضوں تک انتظار میں رکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ان کے شوہر اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں تو اس مدت میں وہ ان کو پھیر لینے کے زیادہ حق دار ہو گئے۔

اس کے ساتھ حکم یہ ہے کہ تین مہینوں کی اس مدت میں عورت کو اپنے گھر سے نہ بھیج دو بلکہ اپنے ساتھ رکھو۔ ممکن ہے کہ ساتھ رہنے سہنے سے دل ملنے کی کوئی صورت نکل آئے۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَ اَحْصُوا الْعِدَّةَ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُیُوْتِهِنَّ وَ لَا یَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ وَ تِلْكَ — جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے شروع میں طلاق دو اور عدت کا زمانہ گنتے رہو اور اللہ سے ڈرو اور ان کو گھروں سے نکال نہ دو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس صورت کے کہ وہ کسی کھلی

حُدُوْدُ اللّٰہِ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ (۶۵: ۱، ۲)

بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ تجھ کو کیا خبر کہ اللہ اس کے بعد کوئی (اصلاح کی) صورت پیدا کر دے پھر جب وہ مدت مقررہ کے اختتام کو پہنچنے لگیں تو یا ان کو نیکی کے ساتھ روک لو یا نہیں تو نیکی کے ساتھ جدائی اختیار کر لو (یعنی آخری طلاق دیدو جو بائن ہوگی)۔

پھر حالت حیض میں بھی طلاق دینے سے منع کیا گیا، اور حکم دیا گیا کہ طلاق دینا ہو تو طہر کی حالت میں دو، کیونکہ حیض کی حالت میں مرد اپنی بیوی سے رکا ہوا ہوتا ہے، اگر یہ رکاوٹ نہ رہے تو امید کی جا سکتی ہے کہ جذبات لطیف شاید اس کو بیوی کی طرف راغب کر دیں اور طلاق کا ارادہ بدل جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ سن کر برہم ہوئے اور فرمایا کہ اسے حکم دو کہ رجوع کرے اور جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تب طلاق دے، ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عمرؓ کو اس فعل پر توبیخ فرمائی، اور طلاق کے طریقے کی تعلیم اس طرح دی:—

> "اے ابن عمر تو نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ طہر کا انتظار کرے پھر ایک ایک طہر پر ایک ایک طلاق دے، پھر جب وہ تیسری مرتبہ طاہر ہو تو اس وقت یا طلاق دے دے یا اس کو روک لے"۔

حضرت ابن عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اَرَأَیْتَ لَوْ کُنْتُ طَلَّقْتُھَا ثَلَاثًا اَکَانَ لِیْ اَنْ اُرَاجِعَھَا؟ اگر میں اس کو تین طلاق دے دیتا تو کیا مجھے رجوع کا حق باقی رہتا؟ حضور نے فرمایا

(۶) کانت تبین وتکون معصیۃ۔ نہیں وہ جدا ہو جاتی اور یہ گناہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیک وقت تین طلاق دینا گناہ ہے شرع اسلامی کی اہم مصلحتوں کے خلاف ہے، اور اس سے اللہ کی حدود ٹوٹتی ہیں جن کے احترام کا سورۂ طلاق میں سخت تاکیدی حکم دیا گیا ہے حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ جو شخص مجلس واحد میں تین طلاق دینے والا ان کے پاس آتا، وہ اس کو مارتے تھے اور اس کے بعد زوجین کو جدا کر دیتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دی ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا انَّہٗ قدْ عصٰی ربَّہٗ وبانت امرأتُہٗ۔ اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی، اور اس کی عورت اس سے جدا ہو گئی۔ حضرت علی فرماتے ہیں۔ لو ان الناس اصابوا حد الطلاق ما ندم احد علی امرأۃٍ۔ اگر لوگ طلاق کی ٹھیک ٹھیک حدود کا لحاظ کرتے تو کسی شخص کو اپنی بیوی کے جدا ہونے پر نادم نہ ہونا پڑتا۔

طلاق میں اتنی رکاوٹیں ڈالنے کے بعد آخری اور سخت رکاوٹ یہ ڈالی گئی کہ جو شخص کسی عورت کو طلاق بائن دے چکا ہو وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا، تاوقتیکہ وہ عورت ایک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور وہ دوسرا مرد اس سے لطف اندوز ہو چکنے کے بعد برضا ورغبت اسے طلاق نہ دے۔

فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ (۲: ۲۹)۔ پھر اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ عورت ایک دوسرے مرد سے نکاح نہ کرلے۔

یہ ایسی کڑی شرط ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا اور اس وقت تک طلاق نہ دے گا جب تک وہ اس امر کا قطعی فیصلہ نہ کر لیگا کہ اسے اس عورت سے

ساتھ نباہ کرنا نہیں ہے بعض لوگوں نے اس شرط سے بچنے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے کہ جس عورت کو طلاق دینے کے بعد کوئی شخص نادم ہو اور اس سے پھر نکاح کرنا چاہیے تو وہ اس عورت کا نکاح کسی دوسرے شخص سے کرادے اور پھر کچھ دے دلا کر اس کو خلوت سے پہلے طلاق دلوا دے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف تصریح فرما دی ہے کہ تحلیل کے لیے نکاح تزویج کافی نہیں بلکہ عورت اس وقت تک پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ دوسرا شوہر اس سے لطف صحبت نہ حاصل کرے لاتحل لزوجها الاول حتٰی یذوق الاخر عسیلتها وتذوق عسیلته۔ پھر جو شخص اپنی مطلقہ عورت کو اپنے لیے حلال کرانے کی خاطر کسی سے اس کا نکاح کرائے، اور جو اس غرض سے نکاح کرے، ان دونوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے۔ لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المحلل والمحلل له (ترمذی) (باقی)

مراۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ۔

مثنوی مولنا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولنا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کیٹی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جن کی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب سے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ کاغذ کتابت طباعت بہترین۔ جلد نہایت اعلیٰ قیمت ۵ سکہ انگریزی ۵ سکہ عثمانیہ۔ دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجیے۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

مصنفہ:- استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ صاحب تفسیر نظام القرآن

مترجمہ جناب مولنا امین احسن صاحب اصلاحی۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ	(۱) ہم نے تجھے بخشا کوثر۔
فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ	(۲) پس اپنے خداوند ہی کی نماز پڑھ، اور اسی کیلئے قربانی کر
إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ	(۳) تیرا دشمن خود ہی منقطع ہے۔

سورۃ کا عمود اور ماقبل و مابعد کے ربط (۱) اگلی سورۃ (سورۃ الماعون) کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بیان میں ہے جنہوں نے خانۂ کعبہ کے اہتمام میں خیانت کی، کیونکہ انہوں نے حج اور اس کے تمام مراسم بگاڑ دیے اور توحید اور غربا پروری مٹا کر نماز اور قربانی کی اصل حقیقت باطل کر دی، جن کی وجہ سے ان پر لعنت کی گئی اور اس بات کے سزاوار ہوے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دستور کے مطابق، اس نعمت کو ان سے چھین کر ان کے سپرد کرے جو اہل ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔

وَإِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُمْ۔ (سورہ محمد) اگر تم برگشتہ ہو جاوگے تو خدا تمہاری جگہ دوسری قوم چن لے گا، پھر وہ لوگ تمہاری طرح نہ ہوں گے۔

اس سے پہلے جو جماعتیں خیانت و بدعہدی کی مرتکب ہوئیں وہ ولایت بیت اللہ کے منصب سے محروم کر دی گئیں۔ اسی دستور کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ (کوثر) کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی کہ بیت اللہ مسکن ابراہیم خلیل اور ان کی ذریت کی ولایت کے لیے

خدا نے تم کو اور تمہاری امت کو منتخب کیا۔ اس ذریت کے ذریعہ خدا تمام قوموں کو برکت دے گا جیسا کہ توراۃ میں وعدہ کیا ہے۔ اور اسی لیے بیت اللہ کو مُبٰرَکًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ" سرچشمہ برکت اور لوگوں کے لیے ہدایت کہا۔

یہ عظیم الشان عطیہ الٰہی یقیناً سب سے بڑی کامیابی اور خیر کثیر ہے۔ یہی عطیہ اس حوض کوثر کا ضامن ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت میں عطا فرمائے گا۔ ان اعتبارات سے یہ سورۃ ماقبل کے بعد اسی طرح آئی ہے جس طرح عذاب کے بعد رحمت، سلب کے بعد بخشش، اور اہل دوزخ کے بعد اہل جنت کا تذکرہ آتا ہے۔ یہ اسلوب قرآن مجید میں عام ہے۔

نیز چونکہ سورۂ ما بعد میں جوار بیت اللہ سے ہجرت کا اعلان تھا، اس لیے نظم کلام مقتضی ہوا کہ پہلے اشارت اور تسلی کی سورۃ ہو تاکہ نظم قرآن ہی سے یہ واضح ہو جائے کہ خداوند تعالیٰ نے پہلے سے پہلے راحت کا فیصلہ کر لیا ہے، اگرچہ اس کا ظہور بعد میں ہو۔ اسی وجہ سے سورۃ کافرون جس میں اعلان تبرّی ہے، دو مبشر سورتوں یعنی سورہ کوثر اور سورۃ نصر کے درمیان رکھی گئی۔ اس کے علاوہ اس سورۃ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی بھی بشارت دی گئی تھی کہ آپ کی امت زیادہ ہوگی اور آپ کے اعداء بیت اللہ کی برکتوں سے محروم ہوں گے۔ اس لیے سورۃ کافرون میں اس محرومی کی اصل علت یعنی توحید کا بیان ہوا جو بیت اللہ کا حقیقی سنگ بنیاد ہے۔

یہ سورۃ کے عمود اور اس کے ربط پر ایک اجمالی نظر تھی تشفی بخش تفصیلات بعد میں آئیں گی۔

لفظ کوثر کی تفسیر تاویل (۲) اس سورۃ کی صحیح تاویل لفظ "کوثر" میں چھپی ہوئی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے اس لفظ کی تحقیق کی جائے۔ اس کے متعلق سلف سے مختلف اقوال منقول ہیں، اس لیے ٹھیک معنی کی تعیین کے لیے کسی قدر تفصیل ناگزیر ہے۔

یہ معلوم ہے کہ "کوثر" کثیر کا مبالغہ ہے، کثر کے معنی دولت و ثروت کے ہیں۔ اس لیے کوثر کے

معنی ہوں گے د۔ بڑی کثرت اور برکت وثروت والا۔ کثیر اور کُثیر کی طرح کوثر بھی تسمیہ کے لیے مستعمل ہے۔ بطریق صفت بھی اس کا استعمال عام ہے۔ لبید کا شعر ہے ؎

وصاحب ملحوب فجعنا بموته　　　وعند الرداع بيت آخر كوثر

اور ملحوب کا سوار جس کی موت کے غم نے ہم کو محزون کیا　　　اور رداع کے پاس ایک اور سدا آباد سردار کی قبر ہے

امیۃ بن ابی عائذ الہذلی کہتا ہے۔ ؎

يحامي الحقيق اذا ما احتدمن　　　وحمن في كوثر كالجلال

وہ حرمت کی حفاظت کرتا ہے، جب وہ گرم ہوتی ہیں، اور ہنہناتی ہیں بادبان کی طرح پھیلے ہوئے غبار میں

اس میں موصوف مقدر ہے یعنی "فی غبار کوثر"۔ اس سے فعل بھی مستعمل ہے۔ حسان بن نشبۃ کا شعر ہے

ابوا ان يبيحوا جارهم لعدوهم　　　وقد ثار نقع الموت حتى تكوثرا

انھوں نے اپنے پڑوسیوں کو دشمنوں کے لیے چھوڑ دینے سے انکار کر دیا، اور حال یہ تھا کہ موت کے غبار نے ابھر کر تمام چھا لیا تھا۔

اس لیے از روئے لغت یہاں کوثر کی تین تاویلیں ممکن ہیں:-

۱۔ یہ اسمیت کی طرف منقول ہو کر کسی خاص چیز کے لیے مخصوص ہو گیا ہو، جس کا نام اللہ تعالیٰ نے 'کوثر' رکھا ہو۔

۲۔ اس کو ایسے موصوف مقدر کی صفت مانا جائے، جس کے ساتھ اس کو خصوصیت ہو۔ مثلاً کہتے ہیں "مرد علی جرد" یعنی رجال مرد علی خیل جرد۔ نوخیز نوجوان اصیل گھوڑوں پر۔ یا قرآن مجید میں ہے۔ "والذاریت" یعنی الریاح الذاریات (غبار اڑانے والی ہواؤں کی قسم) "ذات الواح ودسر" یعنی فلک ذات الواح ودسر (تختوں اور کانٹوں والی کشتی) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں لیکن ایسا صرف اسی صورت میں جائز ہے جب صفۃ اس موصوف کے لیے مخصوص ہو اکہ مجرد ذکر صفت بموصوف پر دلالت کرے

یا کوئی واضح قرینہ اس کی طرف اشارہ کردے۔

۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ اس کو اسمائے صنف کی طرح اس کے عموم پر باقی رکھا جائے، جو قلیل و کثیر پر یکساں دلالت کرتے ہیں اور کسی کے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔ اس صورت میں اس کی حیثیت جوامع الکلم کی ہوگی۔ وہ ہر اس چیز پر اس کی دلالت یکساں ہوگی جس میں خیر کثیر ہو البتہ قرآن کے اشارہ سے بعض افراد صنف پر اس کی دلالت زیادہ واضح ہوگی۔

یہ تین احتمالات ہیں لیکن ہم اس کی تاویل میں، جیساکہ ساتویں فصل کے بعد معلوم ہوگا جس اصل پر نظر رکھیں گے وہ نظم سورت، سیاق آیات، ربط معنی اور حسن تاویل کی رعایت ہے رہا دوسرے وجوہ کا تذکرہ اور روایات کی تطبیق تو اس سے ہم محض اس لیے تعرض کریں گے کہ جو لوگ محاسن نظم اور حسن تاویل کی صحیح قدر وقیمت سے واقف نہیں ہیں ان کے شبہات کا ازالہ ہوسکے۔ اس تمہید کے بعد ہم کوثر کی تاویل میں سلف سے جو اقوال منقول ہیں، ان کو نقل کرتے ہیں۔

کوثر کی تاویل میں سلف کے اقوال | ۳۔ علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے کوثر کی تاویل میں تین قول نقل کئے ہیں۔

۱۔ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، انسؓ، مجاہد اور ابو العالیہ رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۲۔ کوثر سے مراد خیر کثیر ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؓ، عکرمہؒ، قتادہ اور مجاہد رحمہم اللہ سے مروی ہے۔

۳۔ کوثر جنت میں ایک حوض ہے، یہ عطاء رحمہ اللہ سے مروی ہے۔

میرے نزدیک پہلے اور تیسرے قول میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کو موقف کا حوض اور جنت کی نہر بھی کہا گیا ہے۔ اس لیے یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حوض اسی نہر جاری کا ہو۔ پھر حضرت عکرمہ سے، جو کہتے ہیں

کہ کوثر سے خیر کثیر مراد ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ کوثر سے مراد نبوت ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کوثر قرآن ہے اسی طرح حکمت اور اسلام کی روایتیں بھی ہیں۔

ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ان تمام روایات کو نقل کرکے یہ روایت اختیار کی ہے کہ جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔ انہوں نے حضرت انس رض کی روایت پر اعتماد کر لیا، جو آنحضرت سے مروی ہے اور ان اقوال میں باہم تطبیق کی زحمت نہیں اٹھائی ہے، حالانکہ جو جماعت دوسری بات کہتی ہے، انہی میں سے بعض پہلی بات بھی کہتے ہیں۔ اور اسی طرح پہلی بات کے کہنے والوں میں سے بعض دوسرے قول میں بھی شریک ہیں پھر یہی لوگ ہیں جن سے قرآن، حکمت، اسلام اور نبوت کی روایتیں بھی ہیں۔ نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے، اور آنحضرت صلعم نے اس کی کیفیت بیان کر دی تھی، پھر اس علم کے بعد، سمجھ میں نہیں آتا کہ ان لوگوں نے اختلاف کیوں کیا؟ خصوصاً حبر الامۃ اور ترجمان القرآن اور ان کے شاگرد عکرمۃ! اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اقوال پر غور کیا جائے۔ تاکہ اصل حقیقت غیر مشتبہ صورت میں سامنے آجائے۔

ان اقوال کا ماخذ اور اس امر کا بیان کہ ان سب کا مرجع ایک جامع حقیقت ہے

(۴) جن لوگوں نے کوثر سے، جنت کی ایک نہر یا موقف کا حوض مراد لیا ہے، انہوں نے اس کو اسم مانا ہے، جو صفت سے منقول ہو گیا ہے، اور اس روایت پر اعتماد کیا ہے جس میں آنحضرت صلعم نے اس حوض کے متعلق خبر دی ہے جو اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں عطا فرمائے گا۔ اور جو لوگ اس سے "خیر کثیر" مراد لیتے ہیں وہ یا تو اس کا موصوف یعنی خیر محذوف مانتے ہیں کہ موقع ذکر نعمت کا ہے، یا خود صفت ہی کو خیر کثیر کے مفہوم میں لیتے ہیں اور دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہے ان کا اعتماد مندرجہ ذیل دلائل پر ہے، ۔

۱۔ اگر لفظ کوثر صفت سے اسمیت کی طرف منقول ہوتا تو اس کو نکرہ آنا چاہیے تھا مثلاً

سلسبیل، تسنیم، علیین، سجین، غسلین۔ اور قرآن چونکہ عربی مبین میں ہے اس لیے وہ اس کی شرح کرتا کیونکہ تسمیہ ایک وضع جدید ہے۔ اس لیے کوثر کو لام تعریف کے ساتھ استعمال کرنا، درانحالیکہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے جس سے لوگ واقف نہیں ہیں، قرآن کے عربی مبین ہونے کے منافی ہے۔ اس لیے بطریق نص وہ کسی خاص چیز کا نام نہیں ہو سکتا البتہ بطریق تاویل اس سے کوئی ایسی چیز مراد لے سکتے ہیں جس میں خیر کثیر ہو۔

۲۔ قرآن مجید کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ آخرت کی بخششوں کو یا تو بصیغہ مستقبل ذکر کرتا ہے یا ایسے قرآئن کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے مستقبل مفہوم ہو سکے۔ مثلاً

ولسوف یعطیك ربك فترضی۔ (الضحیٰ) اور جلد تیرا خدا، اپنی بخشش سے تجھے خوش کر دے گا۔

یبعثك ربك مقاماً محموداً۔ (بنی اسرائیل) کہ تیرا رب تجھے مقام محمود میں کھڑا کرے۔

۳۔ لفظ اپنے عموم پر باقی رہنے کی صورت میں زیادہ وسعت و جامعیت رکھتا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ قرآن دریائے معانی ہے۔ پھر لفظ کوثر خود وسعت کا مقتضی ہے، تحدید و اقتصار اس کے مزاج کے خلاف ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ اس سے خیر کثیر مراد لیتے ہیں، وہ اس خبر کا انکار نہیں کرتے جو آخرت کے کوثر کے متعلق وارد ہے۔ وہ لفظ کو اس کی وسعت و عمومیت پر باقی رکھتے ہیں۔ جس کے دائرہ میں آخرت کی بخششوں سے یہ جنت کی نہر بھی داخل ہے اور موجودہ نعمتوں میں سے قرآن، حکمت، نبوت اور اسلام بھی۔ وہ ان سب پر اس کا اطلاق بطریق تسمیہ و تعیین نہیں بلکہ بطریق تفصیل کرتے ہیں۔ یعنی لفظ کو اس کے عموم پر باقی رکھ کر اس کے مختلف معانی میں سے اس فرد پر اس کا اطلاق کر دیا جو سب سے زیادہ جامع اور اکمل ہے۔

ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرتے تھے، اس لیے کوثر سے قرآن بھی مراد لیا

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مبارک (سرچشمۂ خیر و برکت) کہا ہے۔ اسی طرح حکمت بھی مراد لیا کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔ مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ جس کو حکمت بخشی گئی اس کو خیر کثیر بخشا گیا۔ اور یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں کیونکہ قرآن تمام جواہر حکمت کا خزانہ ہے۔ اسی اصول کے مطابق نبوت بھی اس کے دائرہ میں آگئی کہ فرمایا گیا ہے: ۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۔ نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر۔ اسی طرح اسلام بھی اس میں داخل ہے۔ بلکہ اسلام کی وسعت و ہمہ گیری کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہے کہ تمام کائنات اس میں سما گئی ہے وَلَہٗ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ　　آسمانوں اور زمین میں جو ہیں سب اس کے سامنے سرفگندہ ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ یہ تمام اقوال قرآن سے ماخوذ و مستنبط ہیں، اور اگرچہ الفاظ مختلف ہو گئے ہیں، لیکن حقیقت ایک ہی ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ذیل میں اولاد کی کثرت، علما ؤ اتباع کی زیادتی، فضائل اخلاق، حسن شہرت، خلق حسن، مقام محمود، خود اس سورۃ اور تمام انعامات خداوندی کا بھی تذکرہ کیا ہے، اور اس کو ابن عباس کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سے بعض چیزیں مذکورہ عمومیت میں داخل ہیں لیکن بعض لفظ کوثر کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتیں، تاہم لفظ کا عموم ان سب پر حاوی ہے۔ مگر ہمارے نزدیک استنباط کے لحاظ سے سلف کی تفسیر زیادہ صاف اور جچی تلی ہے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس میں بہت سے مذہب نہیں ہیں، جیسا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ صرف دو مذہب ہیں۔ ایک یہ کہ کوثر سے کوئی خاص چیز مراد لی جائے یعنی حوض موقف یا نہر جنت یا حکمت یا قرآن یا اسی قسم کی کوئی اور چیز۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ یہ عام ہے، ہر چیز جس میں خیر کثیر ہو اس کے دائرہ میں داخل ہے۔ جو لوگ اس کو کسی معین چیز کا نام قرار دیتے ہیں،

اُن کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلعم نے نہر جنت کا ذکر کوثر کے نام سے فرمایا ہے۔ اور جو لوگ اس کو نہر اور نہر کے علاوہ دوسری چیزوں کے لیے عام مانتے ہیں، وہ حدیث اور قرآن میں تطبیق دینا چاہتے ہیں انھوں نے قرآن کی تاویل، اس کی عبارت کے اقتضار کے مطابق کی اور حدیث کی تاویل، اس طرح کر دی کہ وہ قرآن کے خلاف نہیں پڑتی۔ اس لیے یہ اختلاف نہ ہوا بلکہ دو تاویلوں میں جمع کی شکل ہوئی، کیونکہ عام اور خاص میں کوئی تباین نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس کے دو مختلف قولوں میں اسی قسم کی تطبیق حضرت سعید بن جبیر نے دی ہے چنانچہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت یہ کی ہے۔

حدثنا ابو کریب قال حدثنا عمر	.... سعید بن جبیر
بن عبید عن عطاء عن سعید بن	ابن عباس رض سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا
جبیر عن ابن عباس قال الکوثر نهر فی	کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے۔ اس کے کنارے سونے
الجنة حافتاه من ذهب وفضة یجری	اور چاندی کے ہیں، اور وہ در و یاقوت پر بہتی
علی الیاقوت والدر ماءه ابیض من	ہے اس کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے
الثلج واحلی من العسل	زیادہ شیریں ہے۔

دوسری روایت یہ ہے اور اسی قسم کی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے۔

قال حدثنی یعقوب قال حدثنی هشیم	کہا مجھ سے حدیث بیان کی یعقوب نے، کہا مجھ سے
قال اخبرنا ابو بشر وعطاء بن السائب	حدیث بیان کی ہشیم نے، کہا ہم کو خبر دی ابو بشر اور
عن سعید بن جبیر عن ابن عباس انه	عطاء ابن سائب نے ان دونوں نے روایت
قال الکوثر هو الخیر الکثیر الذی اعطاه	کی ابن عباس سے کہ انھوں نے کہا کہ کوثر خیر کثیر
الله ایاه قال ابو بشر نقلت لسعید بن	ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو بخشا۔ ابو بشر کہتے ہیں

جبیر فانا سا یزعمون انه نهر فی الجنة　　کہ میں نے سعید بن جبیر سے کہا کہ کچھ لوگوں کا خیال
قال فقال سعید النهر الذی فی الجنة　　ہے کہ جنت کی ایک نہر ہے، تو سعید نے جواب دیا
من الخیر الذی اعطاہ اللہ ایاہ　　کہ یہ جنت کی نہر اسی خیر کثیر میں سے ہے، جو اللہ تعالے
نے آپ کو بخشا ہے۔

یہ دو قولوں کے درمیان تطبیق کی شکل ہے۔ یعنی خاص اور عام میں توفیق پیدا کر دی گئی ہے۔

پھر اگر قرآن اور حدیث کے درمیان کامل تطبیق کے لیے یہ کہا جائے کہ جو کوثر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلعم کو دنیا میں عطا فرمایا ہے وہی اپنی حقیقی شکل میں موقف کا حوض اور جنت کی نہر ہے تو یہ تطبیق زیادہ بہتر ہو گی، اور بہ اعتبار تاویل بھی، زیادہ مناسب اور خوبصورت ہے۔ ہم آیندہ فصلوں میں اسی اجمال کی شرح کریں گے۔

چند اشارات کہ کوثر خانۂ کعبہ اور اس کا ماحول ہے | پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے کہ سلف نے کوثر آخرت کے بارہ میں اختلاف نہیں کیا ہے بلکہ لفظ کے عموم اور صیغۂ ماضی کی رعایت سے ان چیزوں کو بھی اس کے دائرہ میں داخل کیا ہے جو داخل ہو سکتی ہیں۔ تاکہ لفظ عام، وسیع اور اپنی دلالت میں اسم بامسمیٰ (کوثر) ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کے مفسرین نے اس میں مزید جستجو اور کاوش جائز سمجھی۔ اگر اس کے متعلق کچھ کہنا بدعت و ضلالت ہوتا تو وہ خاموش رہتے اور سلف بھی کسی قسم کا اختلاف نہ کرتے اس لیے اگر میں کسی ایسی تاویل کا سراغ لگاؤں جو دونوں کوثروں کو ایک کر دے، تو جس طرح میں سلف کو اس باب میں ایک دوسرے کے خلاف نہیں پاتا، اسی طرح اپنے کو بھی ان کے خلاف نہ سمجھوں گا۔ البتہ یہ فرق ہوگا کہ انھوں نے اس کو عام قرار دیکر، اس سے حوض یا نہر جنت سمجھا، اور ان کے ماسوا ہر وہ چیز جس میں خیر کثیر ہو، مثلاً قرآن، حکمت، اسلام، نبوت، جن کو حوض یا نہر سے کوئی مناسبت نہیں۔ مگر میں اس سے وہ چیز مراد لیتا ہوں جس کو اس حوض یا نہر سے نہایت واضح مشابہت ہے،

جس کی کیفیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں، اور جس کی حقیقت و روحانیت شب معراج میں آپ کے سامنے بے نقاب ہوئی۔ کیونکہ یہ ثابت ہے کہ اس میمون رات میں، جب پروردگار عالم نے اس عالم آب و گل کی بہت سی چیزوں کے حقائق آپ کے لیے بے حجاب کیے تو اس کوثر کی روحانیت کا بھی آپ کو مشاہدہ کرایا جو اس دنیا میں آپ کو بخشا گیا۔

اس عالم کے جو اسرار آپ پر بے نقاب ہوتے تھے، آپ کبھی ان کا ذکر تصریحاً فرماتے تھے مثلاً سورہ بقرہ اور آل عمران کے متعلق فرمایا:- وہ دونوں بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی" دنیا کی بابت فرمایا: "وہ بڑھیا کی شکل میں آئے گی" موت کی نسبت فرمایا:" وہ ایک مینڈھے کی صورت میں آئے گی" اور کبھی صرف اشارہ فرما دیتے تھے کہ لوگ اس پر تدبر کریں، اور ان کے ذہن وعقل کی تربیت ہو۔ اس لیے یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ آنحضرت صلعم نے تصریحاً یہ نہیں فرمایا کہ خانہ کعبہ قیامت کے دن حوض کوثر کی شکل میں نمودار ہوگا، کیوں کہ آپ نے اس کی طرف اشارات فرمائے ہیں اور ہم کو ان پر غور و فکر کی ترغیب دی ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان اشارات کی تفصیل کرتے ہیں جو ہمارے دعوی پر حجت ہیں۔

۱- یہ ایک حقیقت ہے کہ نفوس کے اندر خدا کی طرف ایک فطری شوق و رغبت موجود ہے اور نفس انسانی اس سے محروم رہکر تسلی نہیں پا سکتا۔ انسان کی یہی فطرت مذاہب و ادیان کے وجود کا سرچشمہ ہے۔ اسی طرح اشتیاق و بیقراری کا یہ نتیجہ ہے کہ تم دنیا کی کوئی قوم مذہب سے خالی نہیں پاتے۔

اب سوچو! اس فطری اشتیاق اور چاہ کی سب سے زیادہ موزوں تعبیر "پیاس" کے سوا کس چیز سے ہوسکتی ہے؟ زبور میں یہی تمثیل اکثر استعمال ہوئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کو پیش نظر رکھکر ان موحدین کے حال پر غور کرو جو حج کے ایام میں بیت اللہ کے پاس سرتاپا اشتیاق و آرزو

ہو کر جمع ہوتے ہیں۔ کیا ان کی مثال، ان خشک لب پیاسوں کی سی نہیں ہے جو شدید تشنگی سے مضطر ہو کر کسی حوض کے پاس جمع ہوگئے ہوں؟ اگر یہ مشابہت واضح ہے تو خانہ کعبہ ان کے لیے دنیا میں اس حوض کوثر کی مثال ہے، جس پر میدان حشر میں وہ یکجا ہوں گے۔

۲۔ آنحضرت صلعم نے ہماری مسجدوں کو نہر سے تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ نے فرمایا:-

ارأیتم لو ان نھرا بباب احدکم یغتسل فیہ کل یوم خمساً الخ... بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر ایک نہر جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو....

یہ تمثیل ایک دوسرے پہلو سے پانی ہی کی ہے جس طرح پانی سیرابی کا ذریعہ ہے، اسی طرح طہارت کا ذریعہ ہے۔ اور معلوم ہے کہ ہماری تمام نمازوں کا سرچشمہ بیت اللہ ہے، اس اعتبار سے ہماری تمام مسجدیں گویا اسی سرچشمہ کی نہریں ہیں، جن سے ہم سیرابی اور پاکی حاصل کرتے ہیں۔

۳۔ خانہ کعبہ کے اجتماع سے جس طرح دوسری امتوں کے مقابل میں اس امت کی کثرت کا اظہار ہوتا ہے، اسی طرح حوض کوثر پر اس کا اجتماع اس کی کثرت کے اظہار کا سبب ہوگا۔ اس کثرت کے ظاہر کرنے کی بہترین صورت یہی تھی کہ کسی ایک مخصوص مقام پر اس کا اجتماع ہو۔ دوسری امتیں اس اجتماع سے اندازہ کرتی ہیں کہ زائرین بیت اللہ کا یہ متلاطم سمندر اس بحر بیکراں کا صرف ایک قطرہ ہے، جو پوری سطح ارض کو محیط ہے۔ پس جس طرح حوض کوثر پر اس امت کے اجتماع سے دوسرے انبیاء کی امتوں پر اس کی کثرت واضح ہوگی، اسی طرح موسم حج میں خانہ کعبہ کے پاس اس کا اجتماع اظہار کثرت کا ایک جلوہ ہے۔ غور کرو لفظ کوثر ان دونوں کی مطابقت کو کس طرح واضح کرتا ہے۔

۴۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی امت کو حوض کوثر پر وضو کے آثار سے پہچانیں گے

یہ اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ خلوص قلب کے ساتھ اس گھر کی زیارت کریں گے، وہی لوگ آخرت میں اس حوض پر آئیں گے جو اس گھر کی حقیقت ہے۔

۵. فتح مکہ کو خدا نے امت کی کثرت کا سبب بنایا چنانچہ حج اکبر کے بعد لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہوئے۔

۶. مسجد حرام کو خدا نے "مبارک" (سرچشمہ خیر و برکت) کہا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ (آل عمران ۹۵) بلاشبہ خدا کا پہلا گھر جو لوگوں کے لیے تعمیر ہوا، وہ ہے جو مکہ میں سرچشمہ خیر و برکت اور لوگوں کیلئے ہدایت ہے

اس گھر کو خدا نے ایسی برکت سے نوازا کہ تمام عالم اس کی برکتوں سے مالامال ہوا، اور جیسا کہ ابراہیم خلیل سے وعدہ کیا گیا تھا حضرت اسمٰعیل کی ذریت میں خدا کی برکت حضرت اسحٰق کی ذریت سے زیادہ ہوئی اس اجمال کی تفصیل سورۂ فیل میں گذر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام برکتیں اسی بیت اللہ اور نماز و قربانی کا ثمرہ ہیں۔

یہاں شبہہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے قرآن کو بھی مبارک کہا ہے، اس لیے حوض کوثر کے ساتھ اس کی مشابہت بھی واضح ہے لیکن یہ شبہہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن کو مبارک دوسرے پہلو سے کہا گیا ہے، جس طرح بارش کو خدا نے مبارک کہا ہے، اسی طرح قرآن کو بھی مبارک کہا، کیونکہ بارش آسمان سے برس کر مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے، اور قرآن نے آسمان سے نازل ہو کر مردہ دلوں کو زندہ کر دیا۔ قرآن کو مبارک کہنے میں حوض سے مشابہت کا کوئی پہلو نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن کی عظمت اور بے پایاں وسعت کے اعتبار سے یہ تشبیہ بلاغت کے خلاف ہوگی۔

۷. یہ سورۃ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکہ، حج، نماز، قربانی، غلبہ اسلام اور کثرت امت کا فتح باب ہے۔ یہاں تک کہ خدا نے اس صلح کو "فتح مبین" سے تعبیر کیا۔ سورۃ کے زمانۂ نزول پر

چودھویں فصل میں مفصل گفتگو ہوگی۔

۸۔ آنحضرت صلعم نے اس حوض کے ایک گوشہ کے متعلق خبر دیکر باقی کی طرف اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں مروی ہے:۔

قال علیہ السلام ما بین بیتی ومنبری روضۃ من ریاض الجنۃ ومنبری علی حوضی۔

آنحضرت صلعم نے فرمایا میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے، اور میرا منبر میرے حوض کے اوپر ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی مبارک سرزمین، جس میں حجاج یکجا ہوتے ہیں، اس حوض کوثر کی شکل اختیار کرے گی، جس کی آنحضرت صلعم نے خبر دی ہے، اور میرے نزدیک بخاری کی مندرجہ ذیل روایت (مذکورہ نمبر ۹) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

۹۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن نکلے، ایک شخص کے جنازہ کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لائے (یعنی منبر مسجد پر) اور فرمایا۔

انی فرط لکم وانا شہید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الآن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض او مفاتیح الارض وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیھا۔

میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں، اور میں تمہارے لیے شہادت دوں گا، اور قسم خدا کی میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں اور مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، یا (راوی کو شبہ ہے) آپ نے یہ فرمایا کہ زمین کی کنجیاں دی گئی ہیں اور مجھے خدا کی قسم تم سے اس بات کا ڈر نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرو گے لیکن اس بات کا ڈر ہے کہ تمہاری بھاگ دوڑ طلب دنیا کی راہ میں ہو جائے۔

" فرطاً عربی میں، اس شخص کو کہتے ہیں جو حوض پر پہلے سے پہنچ کر قافلہ کے لیے ڈول اور رسی وغیرہ کا

انتظام کرکے حوض کو بھر رکھتا ہے۔ "شَہید علیکم" سے یہ مطلب ہے کہ آپ اپنی امت کو پہچانیں گے، اور لوگوں سے متعلق اپنی امت میں سے ہونے کی گواہی دیں گے۔ یہ آپ کی طرف سے شفاعت ہوگی۔

ان لفظوں میں آپ نے ان حالات کو بیان فرمایا ہے جو آخرت میں پیش آئیں گے، پھر آپنے اشارہ فرما دیا کہ اس حوض کوثر کی ظاہری مثال آپ کے سامنے ہے، کیونکہ، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، آپ کا منبر آپ کے حوض کے اوپر ہے۔ اور یہ جو آپ نے فرمایا: مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں، تو اس سے فتح مکہ کے اس وعدہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا، چنانچہ فتح مکہ تمام زمین اور اس کے خزانوں کی فتح کا دیباچہ ثابت ہوا۔

۱۰۔ آنحضرت صلعم نے ظاہر فرما دیا ہے کہ آپ کے حوض کا طول مکہ اور مدینہ کے مابین مسافت جتنا ہے اس لطیف اشارہ سے ارض حرم اور آپ کے حوض کی مطابقت بھی واضح ہوگئی۔

لیکن اس جگہ ایک شخص کے دل میں خدشہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مراد یہی تھی تو اس کو کھول کر کیوں نہیں فرما دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس مقام کی تعبیر کے لیے قرآن مجید نے جو لفظ انتخاب کیا ہے، وہ بے شمار حقائق و معارف کا گنجینہ اور ہمارے لیے دعوت تفکر ہے۔ یہ ایک لفظ امت کی کثرت، مکہ کی فتح، ایام حج میں خانۂ کعبہ کے پاس، اور محشر میں حوض کوثر پر امت کے اژدہام، ان تمام حقائق کی طرف ایک ساتھ انگلی اٹھا کر اشارہ کرتا ہے۔

یہ تمام اشارات، ہم نے اس مقصد کی تمہید و تائید کے لیے یکجا کیے ہیں جو نظم کلام سے واضح ہوتا ہے اور جس کی تفصیل انشاء اللہ اگلی فصلوں میں آئے گی اب تھوڑی دیر توقف کرکے حوض کوثر کی شکل و ہیئت پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے بھی ہمارے مذکورہ نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ کوثر آخرت درحقیقت خانۂ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی تصویر ہے۔ بعد کی فصل میں اس اجمال کی تفصیل ہے۔ (باقی)۔

تفسیر سورۂ لہب

از جناب مولانا عبدالقدیر صدیقی

تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ

تَبَّ، ہلاک ہوا، برباد ہوا، رائیگاں گیا۔ تباب مصدر۔

یدان دونوں ہاتھ۔ اضافت کی وجہ سے نون گر گیا یدا رہ گیا ید کا لفظ عربی زبان میں ہاتھ، قوت، کوشش، کام کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

ابو لھب۔ اصلی نام عبد العزیٰ تھا۔ چونکہ وہ بہت گورا اور سرخ رنگ تھا، اس لئے اس کی کنیت ابو لہب یعنی پدر شعلہ رکھی گئی۔ عبد العزیٰ میں بت کی طرف نسبت تھی لہذا یہاں اس کا نام لیا گیا، اور ابو لہب میں ملازمت آتش یعنی دوزخی ہونے کا ایہام بھی پیدا ہوتا تھا، اس لیے یہ کنیت اختیار کی گئی۔ "ابو لہب کی ہر طرح کی کوشش ناکام رہی اور خود بھی برباد ہوا"۔

مَآ اَغْنٰی عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ۔

اغنیٰ عنہٗ۔ کام آیا۔ نفع دیا۔ ما اغنیٰ عنہٗ کچھ کام نہ آیا۔ کچھ بھی نفع نہ ہوا۔ مالہٗ۔ نہ اس کا مال، روپیہ پیسہ۔ وما کسب، اور نہ اس کی کمائی۔

سَیَصْلٰی نَارًا ذَاتَ لَھَبٍ۔

یَصْلٰی: اس کے مادہ میں قرب کے معنی ساری ہیں۔ صلوین، سرین کی دو ملی ہوئی ہڈیاں مُصَلّی، مجلی یعنی اول آنے والے گھوڑے کے قریب کا گھوڑا، صلوٰۃ دعائے رحمت۔ قرب الٰہی کا

موجب صلوٰۃ نماز، ارکان مخصوص جو دربار الٰہی میں تقرب کا ذریعہ ہے۔ سَیَصۡلیٰ الخ "عنقریب داخل ہوگا یہ ابولہب آتش شعلہ زن میں"۔ ابولہب اور ذات لہب میں کے لہب میں تجنیس ہے۔

وَامۡرَاَتُہٗ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ

امرأۃ، عورت، جورو۔ ابولہب کی جورو کا نام ام جمیل ہے۔

حمالہ، بوجھ اٹھانے والی۔ الحطب، جلانے کی لکڑی۔ حَمَّالَۃَ الۡحَطَبِ، ہیزم کش چغل خور لگائی بجھائی کرنے والی شرانگیز باتیں لگانے والی جلتی آگ میں لکڑیاں ڈال کر اس کو بھڑکانے والی۔ فرمایا کہ ابولہب کے ساتھ اس کی شرانگیز جورو بھی شعلہ زن آگ میں داخل ہوگی۔

فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ۔

جید۔ گردن، خوبصورت گردن حَبۡل، رسی۔ مَسَد۔ کھجور کے نارے کی رسی جو مضبوط اور سخت ہوتی ہے۔ فِیۡ جِیۡدِہَا حَبۡلٌ مِّنۡ مَّسَدٍ۔ اس کے گلے میں کھجور کے نارے کی رسی پڑیگی۔ وہ اپنی کوشش میں آپ پھنسے گی، اس کی شرارت اس کے گلے کی پھانسی بن جائے گی۔

ابولہب حضرت کا چچا تھا۔ اسلام کی مخالفت میں وہ اور اس کی جورو ام جمیل دونوں پیش پیش تھے روز نیا فتنہ برپا کرتے اور لوگوں کو بھڑکاتے۔ مگر ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ سب تدبیریں ناکام ہوئیں اسلام برابر ترقی کرتا گیا، اور ان کی فتنہ انگیزی انہی کے گلے میں پھانسی بن کر پڑی۔

ابولہب کے ایک بیٹے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صاحبزادی بیاہی گئی تھیں ان کو اس کے لڑکے نے طلاق دے دی۔ بہت ستایا، حضرت نے دعا کی اللّٰھم سلط علیہ کلبًا من کلابك۔ خدایا اپنے درندوں میں سے ایک درندہ اس پر مسلط کر دے، اس بددعا کے اثر سے بچنے کی انہوں نے لاکھ تدبیریں کیں۔ سفر کرتے تو پہلے سپاہیوں کا حلقہ ہوتا، پھر سامان کا حلقہ ہوتا بیچ میں اس لڑکے کو سلاتے مگر ایک مرتبہ شیر بیچ میں سے اس کے لڑکے کو اڑا لیا۔ نہ تدبیریں کام آئیں۔ نہ دھن دولت۔ رسول خدا کا چھوڑا ہوا تیر کیسے خطا کرتا۔ ٹھیک نشانے پر لگا۔ ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب

حاملانِ قرآن

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ

صفا و صدق عماد لقائے جاوید است
رہِ لقائے ابد جوئے و بے عماد مباش

از

جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی اے ایس سی علیگ

عہد جاہلیت کی تاریخ عربوں کے اس فخر کا رہ رہ کے تذکرہ کرتی اور بار بار اس کے مزے لیتی کہ

اِذا مُضَرُ الحمراءِ کانت اُرومتی		وقام بنصری خازمٌ وابن خازم

(جب میرا خاندان قبیلہ مُضر ہوا جن کے سرخ رنگ کے خیمے ہیں، اور خازم و فرزند خازم میری مدد کو اٹھے)۔

عطست بانفٍ شامخٍ اذ تناولت		بدایَ الثریّا قاعِدًا غیر قائم

(تو فرط غرور سے میرا سر بلند ہوگیا، اس لیے کہ میرے دونوں ہاتھوں نے بیٹھے ہی بیٹھے ثریا کو پالیا، کھڑے ہونے کی نوبت تک نہ آئی)

حضرت شیخ عماد رضی اللہ عنہ کی سیرت پاک میں یہ فخر اس خاندان میں نمایاں ہوتا ہے:۔

اذا دولۃُ القرآن کانت ارومتی		وقام مقامی عالمٌ بعد عالم

حب کلام اللہ میرا قبیلہ و خاندان ہوا، اور ہمیشہ خاندان میں ایک عالم کے بعد دوسرا عالم

میرا قائم مقام ہوتا رہا)۔

تواضعتُ للّٰہِ الکریمِ اذ تناولت   یدایَ الثریا قاعدًا غیر قائمِ

(تو میں اللہ کے لیے اور بھی جھک گیا، تواضع اختیار کر لی کہ اس نے اتنی بڑی نعمت بخشی کہ میرے ہاتھوں نے بیٹھے بیٹھے ثریا کو پا لیا، کھڑے ہونے کی نوبت تک نہ آئی)۔

الحمد للہ کہ آلِ عماد میں یہ نعمت آج تک مستقیم اور یہ انداز اب تک قائم ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است

خم و خمخانہ با نام و نشان است

مجالسِ ذکر میں حضرت نے آیاتِ الٰہی کے وقتاً فوقتاً جو مطالب متعین فرمائے ہیں مستفیدین ان کا املا کرتے رہے، اور ان امالی کے اجزا آج بھی چشمِ تحقیق کے لیے بصیرت افروزی کے روشن ترین جلوے اپنے اندر رکھتے ہیں۔ حضرت کی زبان عربی تھی، یہ امالی بھی عربی ہی میں ہیں۔ اردو میں یہ پہلی تلخیص ہے جو ترجمان القرآن کے لیے کی جا رہی ہے۔ امتداد نے اس طومار کو جا بجا کرم خوردہ کر رکھا ہے، ایسے مقامات پر بجائے نقلِ عبارت کے سیاق سے جو مفہوم متعین ہو سکتا تھا اسی پر قناعت کرنی پڑی۔

مبادا کہ ایں گوہر آید بسر

الاستقامۃ فوق الکرامۃ | استقامت کیا ہے، اور کیوں اس کو فوق الکرامۃ کہا گیا ہے؟ اس باب میں حضرت نے سورۂ حم السجدہ (ن ۳۱) آیۃ کریمہ کی تفسیر فرمائی:-

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا	جن لوگوں نے اقرار کر لیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے
تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَنْ لَّا تَخَافُوْا	پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے، کہ تم اندیشہ نہ کرو
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ	اور نہ رنجیدہ ہو، خوش رہو کہ اُس بہشت کی تمہیں بشارت
کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ، نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ	ہوئی جس کے وعدے تم سے ہوا کرتے تھے، دنیا و آخرت

فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ، وَلَكُمْ فِیْهَا مَا	ان دونوں زندگیوں میں ہم تمہارے ساتھی ہیں،
تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ	یہاں جو تمہارا جی چاہے حاضر اور جو مانگو مہیا ہے،
نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔	یہ ایک طرح کی ضیافت ہے ایک غفور الرحیم کی جانب سے
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ	کون اس سے بہتر اور کس کی بات اس سے اچھی ہو سکتی
صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔	ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اچھے اچھے کام کئے، اور
	اقرار کیا کہ میں اہل اسلام میں سے ہوں
اصناف کمال | فرمایا۔	
اِنَّ الکمالات علی ثلاثة اقسام:۔	کمال کی تین قسمیں ہیں۔
النفسانية وهی اشرفها	کمال روحانی، اس کا سب سے اونچا درجہ ہے۔
والبدنية وهی اوسطها	کمال جسمانی، اس کا درمیانی مرتبہ ہے۔
والخارجية وهی ادونها	کمال خارجی، اس کی بالمقابل ادنیٰ حیثیت ہے۔
تمیزِ نفس | والکمالات النفسانية علی نوعین:	کمال روحانی کی بھی دو قسمیں ہیں،
علم الیقین۔	وہ علم جو مفید یقین ہو۔
والعمل الصالح	اور وہ عمل جو صالح ہو۔
فان کمال الانسان ان یعرف الحق لذاته	انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ "حق" کو محض حق ہی کے لئے پہچانے
والخیر لاجل العمل به	اور "خیر" کو اس لیے پہچانے کہ ویسا ہی کام کرے۔
معرفت الٰہی | ورأس المعارف معرفة الله،	سب سے بڑی اور سب سے اچھی پہچان اللہ کو پہچاننا ہے؛
والیه الاشارة بقوله اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا	آیت "حقیقت میں جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار
رَبُّنَا اللّٰهُ۔	اللہ ہی ہے" اسی جانب اشارہ ہے۔

میانہ روی

وراس الاعمال الصالحة ان تستقيم في الوسط فلا تميل الى طرفيه الافراط والتفريط، واليه الاشارة في هذه الاية بقوله: ثم استقاموا

سب سے بڑا اور سب سے اچھا عمل صالح یہ ہے کہ تم بیچوں بیچ ٹھیک طریق سے قائم رہو، اس کے دونوں کناروں افراط و تفریط میں ان میں سے کسی کی طرف رخ نہ کرو۔ اس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ "پھر وہ لوگ قائم رہے"

خدا کے اقرار کے ساتھ یقین اور معرفت لازم ہے

ولما كان قوله تعالى: ان الذين قالوا ربنا الله يمكن حمله على القول باللسان فقط عقبه بقوله: ثم استقاموا، علما ان ذلك لا بد له من ان يكون مقرونا باليقين التام والمعرفة الحقيقة

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اس بات کو صرف زبان سے بھی کہہ دینے پر محمول کر سکتے تھے، لہٰذا اس کے بعد فرمایا پھر وہ اس پر مستقیم بھی ہو گئے، اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ زبان سے جو کچھ کہا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ یقین کامل اور معرفت حقیقی کے ساتھ کہا جائے۔

شان نزول

وقد نزلت هذه الاية في جدنا ابي بكر رضي الله عنه حينما وقع في انواع شديدة من البلاء والمحنة ولم يتغير عن دينه۔

یہ آیت ہمارے جد بزرگوار ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب آپ طرح طرح کی بلاؤں اور مصیبتوں میں پڑے اور پھر بھی ذرہ برابر اپنے دین سے نہ ہٹے۔

فكان هو الذي قال: ربنا الله، وبقي مستقيما عليه لم يتغير بسبب من الاسباب

گویا ابو بکر صدیقؓ ہی نے یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، اور پھر اس بات پر ایسے مستقیم اور ثابت رہے کہ کسی طرح بھی اس اعتقاد اور اس پر عمل میں کوئی تغیر نہ ہونے دیا

غلو سے بچنا

فمن اقر بالله يجب عليه ان لا يتوغل جانب النفي ولا في الاثبات بل يبقى

جس نے اللہ کے پروردگار ہونے کا اقرار کیا اس پر لازم ہے کہ نفی و اثبات دونوں میں حد سے نہ بڑھے بلکہ خط

على الخط المستقيم الفاصل بين طرفي التعطيل والتشبيه والجبر والقدر والرجاء والقنوط ونحوه۔

مستقیم پر قائم رہے جو تعطیل (یعنی اللہ تعالیٰ کو کوئی ایک صفت میں مخلوقات کے مشابہ سمجھنا) اور جبر و اختیار اور امید و ناامیدی وغیرہ کے درمیان ایک حد فاصل ہے۔

اقرار ربوبیت و عمل صالح

والاستقامة محمولة على الاتیان بالاعمال الصالحة فقوله تعالیٰ۔ ان الذین قالوا ربنا الله متناولٌ للقول والاعتقاد

استقامت کو اعمال صالحہ پر محمول کرنا چاہیے کہ اچھے اچھے کام کریں کرتے رہیں، اور کبھی اس میں تغیر نہ ہونے دیں۔ آیۂ شریف "جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہی ہے" اس میں کہنے کی بات قول و اعتقاد دونوں کو شامل ہے۔

وقوله: ثم استقاموا متناول للاعمال الصالحة۔

"پھر اس پر قائم رہے" یہ تمام اعمال صالحہ پر حاوی ہے۔

رعایت مصلحت | فرمایا:۔

ان الغاية في رعاية المصالح دفع المضار وجلب المنافع ودفع المضرة اولى بالرعاية من جلب المنفعة۔

مصلحت بینی و مصلحت شناسی میں خاص بات یہ ہے کہ مضرتیں دفع ہوں اور منفعتیں حاصل کی جائیں؟ حصول منفعت پر بھی دفع مضرت مقدم ہے۔

والمضرة اما ان تكون حاصلة في المستقبل او في الحال او في الماضي۔

حصول مضرت کا امکان یا تو زمانہ مستقبل میں ہے۔ یا حال میں یا ماضی میں۔

والمستقبل المقدمُ على الحاضر والحاضر مقدمٌ على الماضي۔

مستقبل حال پر مقدم ہے اور حال کو زمانہ ماضی پر تقدم حاصل ہے۔

فان الشئ الذي لم يوجد ويتوقع

کوئی شئے جب تک موجود نہیں مگر ہونے کی توقع ہے۔

حدوثه یکون مستقبلاً، فاذا وُجد	ہنوز زمانہ مستقبل میں ہے جب موجود ہوگئی تو زمانہ
یصیر حاضراً فاذا انعدم یصیر ماضیاً	حال میں آگئی اور جب جاتی رہی تو ماضی بن گئی۔
فالمضار التی یتوقع حصولها فی المستقبل	جو مضرتیں زمانہ مستقبل میں حاصل ہونے والی ہوں ان کو
اولیٰ بالدفع من المضار الماضیة	دفع کرنا زمانہ ماضی کی مضرتوں کے دفع کرنے پر مقدم ہے
خوف و حزن | والخوف عبارةٌ عن تألم القلب	خوف یہ ہے کہ کسی آیندہ ضرر ہونے کی توقع سے دل
بسبب توقع حصول مضرة فی المستقبل و	کو رنج پہونچے، اور حزن یہ ہے کہ کوئی نفع جو زمانہ ماضی
الحزن عبارةٌ عن تألم القلب بسبب فوت	میں حاصل تھا۔ اس کے فوت ہوجانے سے قلب رنجیدہ
نفع کان موجوداً فی الماضی فدفع الخوف	ہو، اس بنا پر خوف کا دفع کرنا حزن کے دفع کرنے
اولیٰ من دفع الحزن۔	پر مقدم ہے۔
آیت کے مدارج ترتیبی | وذلک اخبر الله عن	اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کی نسبت آگاہ فرمایا ہے
ملائکته انهم فی الاول الامر یخبرون	کہ وہ پہلے پہل مسلمانوں کو یہ خبر دیں گے کہ آگے چل کر
بانه لا خوف علیکم بسبب ما تستقبلون	قیامت میں جو حالات پیش آنے والے ہیں تم ان کا
من احوال القیامة	خوف نہ کرو۔
ثم یخبرون بانه لا حزن علیکم بسبب	پھر یہ کہیں گے کہ دنیا کے جو حالات فوت ہوگئے وہ تمہارے
ما فاتکم من احوال الدنیا۔	حق میں حزن کا سبب نہیں۔
وعند حصول هذین الامرین زالت	جہاں یہ دونوں باتیں حاصل ہوئیں کہ تمام مضرتیں
المضار والمتاعب کلها۔	اور اذیتیں جاتی رہیں۔
وبعد الفراغ منه یبشرون بحصول	اس سے فراغت ہونے پر حصول منفعت کی بشارت
المنافع وهو قوله تعالیٰ: وابشروا	دیں گے، یہی مدعا آیۂ کریمہ کا ہے کہ "تمہیں اس جنت

بالجنۃ التی کنتم توعدون۔ کی بشارت ہو جس کے وعدے تم سے ہوتے تھے

اللہ ہی مولیٰ ہے | فرمایا۔

نحن اولیاؤکم۔ ہم تمہارے ولی ہیں، مفسرین اس قول کو فرشتوں سے منسوب کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے وہ اس طرح خطاب کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے۔

انما ولیکم اللہ — تم سب کا ولی اور والی اللہ ہی ہے۔

اللہ ولی الذین آمنوا۔ — جو ایمان لائے ان کا ولی اور والی تو اللہ ہی ہے

ذلک بان اللہ مولی الذین آمنوا و ان الکفرین — یہ اس لیے کہ جو ایمان لائے ان کا والی تو اللہ ہی ہے

لا مولی لھم۔ — اور کافروں کا تو کوئی بھی والی نہیں۔

اللہ جن کا والی ہو، فرشتے اپنے آپ کو ان کے ولی کی حیثیت میں کیوں کر پیش کر سکتے ہیں ؟

فرشتوں کی بات گذر چکی، یہاں سے اللہ کی بابت شروع ہوتی ہے۔

مسلمان کی دنیا و آخرت | فرمایا :۔

نزول ملائکہ لوگوں کی رائے میں پیغمبروں ہی تک محدود ہے بے شبہ یہ تحدید ایک حد تک صحیح ہے[1] فرشتے پیغمبروں کے پاس آتے ہیں تو اللہ کی جانب سے وحی اور شریعت لاتے ہیں، عامۂ مومنین اس شرف میں شریک نہیں۔

لیکن مومنین مخلصین میں جو مستقیم الحال ہیں ان پر بھی فرشتے نازل ہوتے ہیں، انھیں خوف و حزن سے تسکین و تسلی دلاتے ہیں، اور بہشت موعود کی بشارت دیتے ہیں ملائکہ ان پر اترتے ہیں کہ خوف نہ کرو[2] محزون نہ رہو، تو تمھیں اس جنت کی بشارت ہے جس کے وعدے تم سے ہوا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔

---

[1] کاغذ کرم خوردہ، عبارت جابجا غیر مقرر درا، سوق کلام مبنی بر سیاق ہے۔

[2] کاغذ کرم خوردہ، عبارت جابجا غیر مقرر درا، سوق کلام مبنی بر سیاق ہے۔

یہاں جو تمہارا جی چاہے حاضر اور جو مانگو مہیا ہے" مفسرین اس وعدے کو بہشت آخرت سے موعود سمجھتے ہیں، لیکن جب اس سے پہلے حیاۃ دنیا و آخرۃ دونوں کا تذکرہ ہے تو کیا یہ وعدہ دونوں کی نسبت نہیں ہو سکتا؟

ممکن ہے اس دنیا میں ایک انسان کی تمام آرزوئیں پوری نہ ہوں، لیکن حقیقت ہے کہ ایک مسلمان کی تمنائیں بر آتی ہیں۔

[illegible] فرمایا۔

ان جوهر النفس كالشعلة بالنسبة الى الشمس، والقطرة الى البحر	جوہر روح کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب کی نسبت سے ایک شعلہ اور سمندر کی نسبت سے ایک قطرہ۔
[illegible] الجسمانية هي التي تحول بينها [illegible] قال صلى الله عليه وسلم [illegible] الشياطين [illegible] على قلوب [illegible] لنظروا الى ملكوت السموات	آسمان تک روح کے عروج کرنے میں جسمانی تعلقات حائل ہیں، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں "بنی آدم کے دل کے آس پاس شیطان پھرا نہ کرتے تو آسمانوں کی بادشاہی انسانوں کو بھی نظر آتی"۔
[illegible] العلائق الجسمانية والتدبيرات البدنية [illegible] الغطاء	جسم کے علاقے اور بدن کی تدبیریں جہاں زائل ہوئیں کہ یہ حجاب حائل بھی اٹھ گیا۔
[illegible] القطرة بالبحر [illegible] الشمس	اس حالت میں اثر اپنے موثر سے، قطرہ دریا سے اور شعلہ آفتاب سے جا ملے گا۔
[illegible] المراد من قوله: نحن اولياءكم في الحيوة الدنيا وفي الآخرة۔	"اس دنیاوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی تمہارے ولی ہیں،" اس آیت سے یہی مراد ہے۔
[illegible] الله تعالى نزلا من غفور رحيم	اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد فرمایا ہے کہ یہ سب ایک طرح

والنزل رزق النزيل وهو الضيف فكل هذه السعادات المذكورة جارية مجرى النزل والكريم إذا أعطى النزل يتبعه بالخلع من بعده وهي رضوانه جل شانه ورضوان الله أكبر.

کی ضیافت ہے ایک غفور الرحیم کی طرف سے" نزل" مہمان کو اور نزل اس کی تواضع اور ضیافت کو کہتے ہیں یہ تمام سعادتیں جن کا بیان اس آیت میں ہے ایک طرح کی ضیافت کا حکم رکھتی ہیں، شریف جب کسی کی ضیافت کرتے ہیں تو اس کے بعد خلعت سے بھی سرفراز فرماتے ہیں، یہاں رضائے الٰہی کا خلعت ہوگا کہ یہی سب سے بڑھ چڑھ کے ہے۔

مرتبۂ سعادت | فرمایا :-

مراتب السعادت اثنان — سعادت کے دو درجے ہیں :

التام — وہ جو کامل ہو۔

وفوق التام — وہ جو اس سے بھی بڑھ کے ہو۔

اما التام فهو ان يكتسب من الصفات الفاضلة ما لاجلها يصير كاملا في ذاته فإذا صعد الى هذه الدرجة اشتغل بتكميل الناقصين وهو فوق التام.

کامل سعادت یہ ہے کہ ایسی فضیلت کے اوصاف حاصل کیے جائیں جن سے انسان بذاتہ کامل ہو جائے جب اس درجہ پر انسان پہنچ گیا تو ناقصوں کو کامل بنانے کی جانب مشغول ہونے کا وقت آیا کامل سعادت سے بھی یہ سعادت بڑھی ہوئی ہے۔

اپنے آپ کو کامل بنانا | فقوله: ان الذين قالوا ربنا الله ثم استقاموا: اشارة الى المرتبة الاولى وهي اكتساب الاحوال التي تفيد كمال النفس في جوهرها،

آیۂ کریمہ "جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے"، اس میں پہلے مرتبہ کی جانب اشارہ ہے یعنی ایسے حالات کا حاصل کرنا جن سے جوہر روح کامل ہو سکے،

قوم کو درجہ کمال پر پہونچانا	فاذا التصفت	جب یہ مرتبہ حاصل ہوگیا تو اس سے آگے
	النفس بها وجب الانتقال الى المرتبة	مرتبہ حاصل کرنے کی لازمی ضرورت پیش آ
	الثانية وهي الاشتغال بتكميل الناقصين	کو کامل بنانے کا کام۔
دعوت اسلام کے یہی معنی ہیں	وذلك انما	یہ دوسرا درجہ اس طرح حاصل ہوتا ہے
	يكون بدعوة الخلق الى الدين الحق	دین حق کی دعوت دیجائے، آیۂ کریمہ
	وهو المراد من قوله: ومن احسن	کون ہے اور اس کی بات سے کس کی با
	قولا ممن دعا الى الله۔	جس نے اللہ کی جانب دعوت دی اس

تقریظ و انتقاد

"اسلام اور اشتراکیت"

یہ ۱۲ صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے جس کو حاجی محمد یوسف صاحب احمد پائی، دہلی نے چھپوا کر مفت تقسیم کیا ہے، اس کے مصنف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کوئی ایسا شخص ہے جس نے اشتراکیت (کمیونزم) کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کے ساتھ اسلام کے اصول دین اور اس کے سیاسی تمدنی اور معاشی نظام کو بھی خوب سمجھا ہے۔ درحقیقت یہ بحث اس قابل تھی کہ اس پر ایسا ہی شخص قلم اٹھاتا کیونکہ جو لوگ اسلام کے اصول سے ناواقف ہیں وہ اشتراکیت کے خوشنما پہلوؤں سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور چند سطحی مشابہتیں دیکھ کر رائے قائم کر لیتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں، بلکہ اسلام خود بھی "اشتراکی" ہے، اور اشتراکیت بہت قریب کی راہ سے اسلام کی طرف آرہی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اسلام کا علم تو رکھتے ہیں، مگر اشتراکیت سے اچھی طرح واقف نہیں، وہ صحیح طور سے نہیں بتا سکتے کہ ان دونوں مذہبوں میں اصولی اختلافات کیا ہیں، اور کن وجوہ سے اشتراکیت ایک مردود مذہب ہے۔ پروپیگنڈا کی طاقت، اور اس عملی کامیابی نے جو اشتراکی مذہب کو بظاہر روس میں حاصل ہوئی ہے، اس کو جدت پسند نگاہوں کے لیے اتنا مزین بنا دیا ہے کہ ہر وہ شخص جو سوسائٹی کے موجودہ نظام سے غیر مطمئن ہے، اشتراکیت پر فریفتہ ہو رہا ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی اشتراکی خیالات تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں کیونکہ عام تعلیم یافتہ حضرات تو اسلام اور اشتراکیت دونوں پر کوئی عمیق نظر نہیں رکھتے، اور خواص اگرچہ اشتراکیت کی حقیقت اور اس کی فاسد بنیادوں کو جانتے ہیں، مگر اسلام سے ناواقف ہیں، اس لیے اس غلط

فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ تمدن و معیشت کی موجودہ مشکلات کا کوئی حل اشتراکیت سے بہتر نہیں۔ اس بڑھتی
رو سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ کہیں اشتراکی مذہب جس کو محض ایک معاشی و اقتصادی مذہب سمجھا جا رہا ہے
اصول و قواعد کے ساتھ مسلمانوں میں بھی جڑ نہ پکڑ لے، جو کلیتہً دہریت، مادہ پرستی اور لادینیت پر مبنی ہ
اخلاق و انسانیت کی تمام صالح بنیادوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ علمائے اسلام نے اس خطر
تک محسوس نہیں کیا ہے، اور یہ فتنہ غیر محسوس طور پر پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں اسلام اور اشتراکی
کی یہ کوشش ہمارے دلی شکریہ کی مستحق ہے کہ انہوں نے ایک ایسا مرقع تیار کر دیا جس میں لوگ بیک
اور اشتراکیت کی حقیقی تصویریں پہلو بہ پہلو دیکھ سکتے ہیں اور خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں
کونسی تصویر اس قابل ہے کہ ایک صاحب عقل انسان اس کا گرویدہ ہو۔

مصنف نے پہلے مختصراً اشتراکیت کی تاریخ بیان کی ہے۔ اس کے بعد وہ اصول بیان
جن پر یہ مذہب قائم ہوا ہے اور اس سلسلہ میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح کر دی ہے کہ اشتراکی مذہب بالک
سلبی اور تخریبی مذہب ہے۔ دین، اخلاق، معاشرت، معیشت اور حکومت، ہر چیز کے نظام کو درہم
اس کا اصل مقصود ہے، اور ان سب چیزوں کو مٹا کر وہ انسان کو ایک ایسی حالت کی طرف لے
جس میں انسانیت سراسر حیوانیت اور بہیمیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پھر انہوں نے اسلام کے معاشی، تمدنی، اخلاق
کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اشتراکیت کے اصولوں سے اس کا مقابلہ کرکے ثابت کیا ہے کہ ان دونوں مذ
بنیادی اختلافات ہیں جن کی بنا پر نہ کوئی مسلمان جب تک وہ مسلمان ہے اشتراکی ہو سکتا ہے،
اشتراکی، مارکس اور لینن کے نظریات پر ایمان رکھتے ہوئے مسلمان بن سکتا ہے۔ اشتراکیت اور اسلا
موازنہ سے یہ حقیقت بھی روشن ہو جاتی ہے کہ تمدن اور معیشت و سیاست کی جن خرابیوں کو
کے لیے اشتراکی مذہب ایجاد کیا گیا ہے، اسلام ان سب کا علاج کر دیتا ہے، مگر فرق یہ ہے کہ اسلام نے
و تعمیر کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور اشتراکیت سراسر افساد و تخریب کے طریقوں سے کام لیتی ہے۔ اسلا

علاج اس طرح کرتا ہے کہ مریض تندرست ہو جائے۔ اور اشتراکیت اس کا علاج اس طرح کرتی ہے کہ نہ مرض رہے نہ مریض۔ اسلام سوسائٹی کے بگڑے ہوئے نظام کو حکمت کے ساتھ مٹاتا ہے، اور اس کی جگہ ایک صالح نظام قائم کر دیتا ہے، مگر اشتراکیت اس کو ظلم و جور سے مٹاتی ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا فاسد نظام قائم کرتی ہے جو سرمایہ داری، پادشاہی، اور پاپائیت کی بدترین خرابیوں سے زیادہ خرابیاں اپنے اندر رکھتا ہے۔

فی الجملہ یہ مختصر رسالہ ان لوگوں کے لیے مفید ہے جو اشتراکیت کو محض دور سے دیکھ کر اس کی ظاہر فریب صورت پر مائل ہو رہے ہیں لیکن جن لوگوں نے اس نئے مذہب کا زیادہ گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے ان کے خیالات کی اصلاح کے لیے اتنی سرسری بحث کافی نہیں ہو سکتی۔ اس غرض کے لیے ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں اشتراکیت کی اس کے فلسفہ، اور اس کے نفسیات کا کھوج لگایا گیا ہے اور ان اسباب کی تحقیق کی جائے، جنہوں نے اشتراکی مذہب کو بیک وقت مذہب اور اس سرمایہ داری کے ساتھ ساتھ دیانت، اخلاق اور نظم اجتماعی کا بھی دشمن بنا دیا پھر اشتراکی اصولوں پر نہ صرف عقلی اور علمی حیثیت سے تنقید کی جائے، بلکہ عملی زندگی میں ان اصولوں کے نفاذ سے جو نتائج رونما ہوئے ہیں ان پر بھی ایک تفصیلی نظر ڈال کر دکھایا جائے کہ یہ اصول کس حد تک ناقابل عمل ہیں؟ اور اگر کسی حد تک قابل عمل ہیں بھی تو انسانیت کے لیے کس قدر نقصان رسان ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جو مسئلہ سب سے زیادہ توضیح کا طالب ہے وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کی بنیاد میں دہریت اور مادہ پرستی کس طرح داخل ہو گئی، حالانکہ ابتدا میں یہ تحریک صرف نظام سرمایہ داری کے خلاف ایک بغاوت تھی، اور اس کا مقصد محض معاشی مشکلات کو حل کرنا تھا؟ اس کے لیے مصنف کو مغرب کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ پر ایک عمیق نظر ڈالنی ہوگی اور ان خطوط کا سراغ لگانا پڑے گا جن پر گذشتہ تین چار صدیوں سے مغربی تہذیب ترقی کرتی رہی ہے۔ اس تحقیق و تفتیش سے یہ راز منکشف ہو جائے گا کہ مذہب و سائنس کا جو معرکہ سولھویں صدی عیسوی میں شروع ہوا تھا، اور جس نے ترقی کر کے انیسویں صدی میں شدید نیچریت Naturalism اور مادیت Materialism کی شکل اختیار کر لی تھی، اس کا فطری نتیجہ وہی افکار و نظریات ہیں جن سے بولشوزم کا خمیر تیار ہوا ہے۔ بولشوزم

محض ایک معاشی مذہب نہیں ہے، بلکہ وہ تہذیب جدید کے شجر خبیث کا پختہ ثمرہے۔ یورپ میں اس درخت کے جو ثمرات نمودار ہوئے ہیں وہ ابھی پختگی کو نہیں پہنچے ہیں۔ یورپ والوں کے دل و دماغ میں ابھی تک وہ اعتقادات اور اخلاقی اصول اور تمدنی نظریات بسے ہوئے ہیں جو ان کو مسیحیت سے ورثتاً ملے ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنی خالص مادی تہذیب میں بھی مذہبیت، اخلاق اور معاشرت کی قدیم خصوصیات کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، دراں حالیکہ دونوں کے مزاج میں بنیادی اختلاف ہے، اور ان دونوں کا امتزاج ان کی عین فطرت کے خلاف ہے۔ اشتراکی روس نے اس غیر فطری امتزاج کا کلیتہً خاتمہ کر دیا، اور وہاں وہ تہذیب اپنے کمال طبیعی کو پہنچ گئی جس کی تعمیر سراسر مادہ پرستی اور نیچریت کی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ نیچریت خدا پرستی کی ضد ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی حیثیت ایک مستقل بالذات مشین سے زیادہ نہیں ہے۔ اخلاقی تصور کے لیے اس کے حدود میں کوئی گنجائش نہیں۔ انسانیت کی لطیف خصوصیات سب کی سب اس کے نزدیک بے معنی ہیں۔ صدق و کذب حسن و قبح اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معیار اس کے پاس نہیں۔ وہ اعمال کو محض ان کے محسوس نتائج کے اعتبار سے جانچتی ہے، اور اسی لحاظ سے ان کی قدر متعین کرتی ہے، کامیابی اور حیوانی اغراض کا حصول اس کا منتہائے مقصود ہے اور اس کے لیے وسائل میں جائز و ناجائز کے درمیان فرق کرنا نیچری اصول کے مطابق کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ اس دائرہ میں جواز و عدم جواز کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیات ہر اس تہذیب میں ضرور پائی جانی چاہئیں جس کی بنیاد نیچریت اور مادہ پرستی پر رکھی گئی ہو۔ یورپ میں یہ تہذیب ابھی خام ہے۔ روس میں اسے پختگی حاصل ہو گئی ہے، اور پندرہ بیس سال کی مختصر مدت ہی میں اس نے ثابت کر دیا ہے کہ جو نظام تمدن خالص نیچری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے وہ انسان کے لیے دنیا کو کس طرح دوزخ بنا دیتا ہے۔

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کیلئے تبدیل کریں انھیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ متصل نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر ابو الاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ عظیم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

جلد (۷) عدد (۲)
شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

چندہ سالانہ (عہ)
قیمت فی پرچہ ۵ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف

ابو الاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم جہاد کن اہم حقایق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مدلل جواب جو اسلامی جنگ پر کئے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ اور دوسرے مذاہب | جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بدھ مت، مسیحیت اور عیسائیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

ضخامت (۵۰۰ صفحات) قیمت مجلد انگریزی (للعہ) ۔۔۔ سکہ عثمانیہ غیر مجلد (للعہ) انگریزی چار روپیہ بارہ آنہ سکہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ شعبان ۱۳۵۴ھ۔ جلد ۷۔ عدد ۲۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

جمادی الاولیٰ کے اشارات میں نماز کے متعلق "حق گو" صاحب کے نتائج افکار پر جو بحث کی گئی تھی اس کو دیکھ کر ایک صاحب لکھتے ہیں۔

جہاں تک اوقات نماز کا تعلق ہے، آپ نے "حق گو" کے شبہات کو اس طرح دور کر دیا ہے کہ کسی بحث و کلام کی گنجایش باقی نہیں رہی لیکن جہاں آپ نے یہ بتایا ہے کہ انسان کی عملی زندگی پر نماز کا کیا اثر مترتب ہوتا ہے، اور نماز کس طرح انسان کو اطاعت احکام آلٰہی کا خوگر بناتی اور اس میں فرض شناسی کا مادہ پیدا کرتی، اور اسے زندگی کے معاملات میں اسلام کے ڈسپلن کی پابندی کرنے کے قابل بناتی ہے، وہاں ایک شبہہ پیدا ہوتا ہے جس کا کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ نظریہ کی حد تک میں مانتا ہوں کہ نماز، اور صرف نماز ہی نہیں، اسلام کی دوسری فرض عبادات بھی اسی غرض کے لیے رکھی گئی ہیں کہ انسان کی عملی زندگی پر ان کا اثر مترتب ہو، اور ان کے لئے جو صورت مقرر کی گئی ہے، وہ یقیناً ایسی ہے کہ اس کا وہی اثر اخلاق، سیرت اور کردار پر مترتب ہونا چاہئے جو مقصود ہے، مگر اس کی کیا وجہ ہے کہ آج ہم اس اثر کو مسلمانوں کی عملی زندگی میں مفقود پاتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ نماز پڑھنے والے، روزہ رکھنے والے، حج اور زکوٰۃ ادا کرنے والے مسلمان اسلامی اخلاق کے نمونے ہوتے، صداقت، امانت، تقویٰ و طہارت کے پتلے ہوتے

مگر واقعہ اس کے خلاف نظر آتا ہے۔ نمازیوں روزہ داروں اور حاجیوں کو ہم باعتبار اخلاق و معاملات ان لوگوں سے کچھ بھی مختلف نہیں پاتے جو نماز روزہ اور دوسری عبادات کے تارک ہیں۔ بلکہ بہت سے عبادت گذار لوگوں کا حال تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی عبادت گذاری کو اپنے معاملات کی خرابی کے لیے سپر بنا رکھا ہے اور ان کے اعمال کی خرابیوں کو دیکھ دیکھ اکثر نئے تعلیم یافتہ حضرات خود نماز روزے کی طرف سے بدگمان ہوتے جاتے ہیں۔"

معترض نے جو شبہہ ظاہر کیا ہے وہ ایک عام شبہہ ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک حد تک واقعات پر مبنی ہے۔ مگر اس میں کوئی ایسا اشکال نہیں جس کے حل میں دشواری ہو۔ معترض خود تسلیم کرتا ہے کہ اسلامی عبادات کا نظریہ اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ عقل حکم لگاتی ہے کہ جس غرض کے لیے یہ عبادات فرض کی گئی ہیں، وہ ان سے بدرجۂ اتم پوری ہونی چاہیے کیونکہ انسان کے نفس کو خدا کی طرف متوجہ کرنے اور احکام خداوندی کی اطاعت کا خوگر بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی عملی طریقہ نہیں ہوسکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ عالم واقعہ میں بھی اس نظریہ کی صحت ثابت ہوچکی ہے، قرون اولیٰ میں اسی نماز روزے اور حج و زکوٰۃ نے اسلام کے نصب العین کے مطابق عرب و عجم کے لاکھوں کروروں انسانوں کی روحانی و اخلاقی تربیت کی ہے، اور ان کے اخلاق، سیرت اور کردار پر وہی اثر ڈالا ہے جو اسلام کا مقصود تھا۔ اب اگر ہم کسی شخص یا جماعت کی عملی زندگی میں ان عبادات کے وہ اثرات نہیں دیکھتے، تو عبادات کی قوت تاثیر میں شبہہ کرنے کے بجائے ہم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ نفوس کی قوت تاثر ماؤف ہوگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آگ لکڑی کو جلادیتی ہے۔ تجربہ و مشاہدہ کی تکرار نے اس امر میں کسی شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی ہے کہ آگ کا کام جلانا اور لکڑی کا کام جل جانا ہے۔ اس یقینی علم کے بعد اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی لکڑی کو آگ پر رکھا جاتا ہے اور وہ نہیں جلتی تو ہم کو یہ گمان نہیں ہوتا کہ آگ میں جلانے کی قوت نہیں ہے، بلکہ ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ لکڑی گیلی ہے؛

اس میں آگ کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طریق تربیت وہدایت کے متعلق
از روئے عقل ہم جانتے ہیں کہ نفوس پر اس سے ایک خاص اثر مترتب ہونا چاہیے اور اس کی عین فطرت
اس کی مقتضی ہے کہ اس سے نفوس پر وہی اثر مترتب ہو، اور تجربے سے ثابت بھی ہو چکا ہے کہ مختلف زمانوں
اور مختلف حالات میں بے شمار نفوس پر فی الواقع وہی اثر مترتب ہوا ہے۔ اس کی تاثیر کو اگر ہم بعض نفوس
کے حق میں ناکام دیکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہمارے دل میں اس کی تاثیر کے متعلق کوئی شک پیدا ہو؟
کیوں نہ ہم سمجھیں کہ گیلی لکڑی کی طرح ان نفوس میں بھی اثر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہے؟

نماز اپنی ظاہری صورت میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ اوقات مقررہ پر چند جسمانی حرکات کا اعادہ
اور چند مقرر الفاظ کی تکرار ہے۔ یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے۔ ایک خاص مہینے میں صبح سے
شام تک اکل وشرب اور صحبت سے مجتنب رہے، اس کا نام روزہ ہو گیا۔ سال میں ایک مرتبہ اپنے مال
میں سے ایک مقرر مقدار کو مخصوص مصارف کے لئے نکال دیا۔ یہ زکوٰۃ ہو گئی۔ ایک خاص زمانہ میں
حجاز کا سفر کیا اور مخصوص مقامات پر چند مناسک ادا کر دیے، یہ حج ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ بجائے خود ان افعال
میں کوئی ایسی چیز نہیں جو انسان کے نفس پر اثر انداز ہو سکتی ہو۔ مجرد افعال ہونے کے لحاظ سے نماز اور
ایک جسمانی ورزش، روزے اور فاقے، زکوٰۃ اور سرکاری ٹیکس، حج اور عام سفروں کے درمیان
کچھ بھی فرق نہیں، اور کوئی صاحب عقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ ورزش جسمانی سے روح میں لطافت پیدا ہوتی
ہے، یا فاقہ کرنے سے اخلاقی تربیت ہوتی ہے، یا ٹیکس ادا کرنے اور کسی مقام کا سفر کر آنے سے انسان میں اعلیٰ
درجہ کے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر جو چیز ان اعمال کو دوسرے افعال سے ممتاز کرتی اور ان کو
تہذیب اخلاق و تزکیۂ نفس و تصفیۂ روح کا ایک بہترین ذریعہ بناتی ہے وہ ایمان ہے۔ ایمان ہی
رکوع وسجود اور قیام وقعود کو "نماز" بناتا ہے۔ وہی فاقے کو "روزے" میں تبدیل کر دیتا ہے۔ وہ

نیکی کی ماہیت میں انقلاب پیدا کرکے اسے "زکوٰۃ" کا بلند مرتبہ بخشتا ہے۔ وہی ایک خاص قسم کے سفر کو سیر و سیاحت کے ادنیٰ مقام سے اٹھا کر "حج" کے اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ وہ درحقیقت تمام عبادات کی روح اور ان کا جوہر ہے۔ اسی سے ارکان عبادت میں معنویت پیدا ہوتی ہے، وہی ان ارکان کو تاثیر کی قوت بخشتا ہے اور نفس میں ان سے متاثر ہونے کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص خدا اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہو، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول مانتا ہو، اور ان کی لائی ہوئی تعلیم کو خدا کی تعلیم سمجھتا ہو، تو ممکن نہیں کہ وہ دن میں پانچ وقت خدا کو یاد کرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھائے ہوئے سبق کو دہرائے اور پھر بھی اس کی لوح دل اس یاد کے اثر سے یکسر خالی رہے، اور اس کی روزمرہ کی زندگی میں خوف خدا اور اطاعت احکام الٰہی کا کوئی نشان بھی نمایاں نہ ہو۔ ہر سال پورے ایک مہینے تک سخت ضوابط کے ماتحت تقویٰ اور خشیت الٰہی کی تربیت پاتا رہے۔ اور پھر بھی اس کی زندگی میں قطعاً کوئی انقلاب نہ ہو حتیٰ کہ وہ بالکل ایسا رہے گویا اس نے یہ تربیت پائی ہی نہیں۔ خالص ایمان بالغیب کی تحریک پر ہر سال اپنے محبوب مال کی قربانی کرتا رہے اور پھر بھی اسی شُحِّ نفس اور قساوت قلب اور حرام خوری و خود غرضی کے عرض میں مبتلا رہے جو ایک بے ایمان زر پرست انسان میں پائی جاتی ہے۔ اپنے رب کی پکار پر لبیک کہتا ہوا اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنے مفید و محبوب مشاغل ترک کرکے فقیرانہ لباس پہن کر نکلے، ایک مدت دراز تک اسی شوق اور عشق کی لگن دل میں لیے ہوئے سفر کرے، یہاں تک کہ مرکز اسلام میں پہنچ کر اپنی آنکھوں سے اللہ کی ان روشن نشانیوں کا مشاہدہ کرلے جو خدا کے سچے اور مطیع فرمان بندوں کی سرفرازیوں، اور سرکشوں کی نامرادیوں پر کھلی گواہی دے رہی ہیں، اور پھر بھی جب واپس آئے تو اس سفر کے آثار اور ان نتائج سے اس کی سیرت ایسی معرا ہو کہ گویا وہ کہیں گیا ہی نہیں اور اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے ہر نفس پر ان عبادات کی تاثیرات یکساں نہیں ہو سکتیں۔ نفوس کی استعدادات اور قوت ایمانی کی شدت و ضعف کے لحاظ سے ان کا

کم و بیش اور شدید و ضعیف ہونا ایک امر فطری ہے لیکن ایمان کے ساتھ جو عبادت کی جائے اس کا بالکلیہ بے اثر ہونا تو یقیناً غیر ممکن ہے، اور ہم قطعیت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص نماز کو فحشاء کے ساتھ جمع کرے، جس کی زندگی میں روزہ اور فسق ایک ساتھ پائے جائیں جس کی سیرت میں حرام خوری یا زکوٰۃ اور شحّ نفس دونوں باہم ہوں، جو حج اور ہتک حرمات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دے، وہ درحقیقت مومن نہیں، منافق ہے۔ اس کی نماز "نماز" ہی نہیں ایک عادی حرکت ہے۔ اس کا روزہ "روزہ" نہیں فاقہ ہے، اس کی زکوٰۃ "زکوٰۃ" نہیں چندہ یا ٹیکس ہے۔ اس کا حج "حج" نہیں بلکہ اس کے لیے ویسا ہی ایک سفر ہے جیسا پیرس اور لندن کا سفر۔

یہ جو کچھ کہا گیا، اس کے مصداق صرف وہی لوگ ہیں جن کی سیرت اور کردار پر، معترض کے مطابق عبادات اسلامی کا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے سے انکار ہے کہ مسلمان جتنے نمازی روزہ دار، زکوٰۃ کے پابند، اور حج ادا کرنے والے ہیں سب کے سب ایسے ہی ہیں ممکن ہے کہ ایک قلیل تعداد منافقین پر بھی مشتمل ہو، لیکن الحمد للہ کہ اکثریت کا یہ حال نہیں ہے۔ اکثریت جس مرض میں مبتلا ہے وہ نفاق نہیں ضعف ایمانی ہے، اور اسی ضعف کا یہ نتیجہ ہے کہ عبادات کی تاثیر بھی ضعیف ہو گئی ہے۔ نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، حج بھی کرتے ہیں مگر یہ سب چیزیں دلوں کو مس کرتی ہوئی اس طرح گذر جاتی ہیں، جیسے بھاپ آئینے کی سطح پر ایک ہلکی سی نمی چھوڑ کر گذر جاتی ہے اور چند لمحوں میں اس نمی کا بھی کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ یہ تاثیر کا عدم نہیں بلکہ اس کا ضعف ہے۔ ایمان کی چنگاریاں دلوں میں دبی چھپی اب بھی موجود ہیں، اور ان کی حرارت سے عبادتیں کچھ نہ کچھ اثر ضرور کرتی ہیں لیکن یہ اثر اتنا کمزور ہوتا ہے کہ عبادت گذاروں کی سیرت اور کردار میں اس کے نشانات زیادہ نمایاں نہیں ہوتے۔ ان کے اخلاق و معاملات اور عبادت نہ کرنے والوں کے اخلاق و معاملات میں بہت

خفیف سا فرق ہوتا ہے مگر دیکھنے والوں کی نگاہوں میں عبادت گذاروں کی برائیاں زیادہ کھٹکتی ہیں۔ ایک تارک صوم وصلوٰۃ کی بد سیرتی و بد معاملگی اتنی زیادہ بری نہیں معلوم ہوتی جتنی ایک پابند صوم وصلوٰۃ کی بد سیرتی و بد معاملگی کیونکہ تارک کی زندگی میں صرف تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے اس لیے وہ نمایاں نہیں ہوتی۔ اور عامل کی زندگی میں تاریکی کے پہلو بہ پہلو نور بھی ہوتا ہے جو اس کو نمایاں کر دیتا ہے۔ تارک سے دنیا کسی بلندی اخلاق پاکیزگی سیرت اور حسن معاملت کی توقع ہی نہیں رکھتی اس لیے اگر اس سے برے اخلاق و اعمال کا ظہور ہو تو اس کو زیادہ بُری نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا لیکن جب ایک نمازی روزہ دار شخص برے افعال کا ارتکاب کرتا ہے تو دیکھنے والوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ اس کی نماز اور اس کے روزے کو دیکھ کر دنیا اس سے فضائل وحسنات کے صدور کی توقع رکھتی ہے۔

ایک اور چیز جس کا ہماری عبادتوں کو ضعیف الاثر بنانے میں بڑا حصہ ہے دین اور دنیا کی علیحدگی کا تخیل ہے۔ یہ دراصل جاہلیت کا اعتقاد تھا جس کو اسلام نے بالکل مٹا دیا تھا، مگر نہ معلوم اس نے کس طرح مسلمانوں میں راہ پائی۔ جاہلیین یہ سمجھتے تھے کہ دین انسانی زندگی کے شعبوں میں سے محض ایک شعبہ ہے جس کا دوسرے شعبوں سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہبی رسوم، عبادات اور قربانیاں محض اس لیے ضروری ہیں کہ خدا یا دیوتاؤں کو خوش کیا جائے، اور زندگی کے معاملات میں ان کی تائید حاصل کی جائے۔ ان فرائض کو انجام دے کے جب انسان عبادت گاہوں سے باہر نکلے تو مذہب کی طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور وہ مختار ہوتا ہے کہ دنیا کے معاملات جس ڈھنگ پر چاہے چلائے۔

اسلام نے اس غلط حد بندی کو مٹایا، دین کو زندگی کا ایک شعبہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا نظام اکمل قرار دیا۔ عقاید اور اخلاق، ایمان اور سیرت، عبادات اور معاملات، مذہبی اعمال اور دنیوی اعمال کے درمیان ایک گہرا ربط قائم کیا۔ اور انسان کی دنیوی زندگی ہی کو بالکلیہ دینی زندگی بنا دیا۔

اس کے نقطۂ نظر سے دین اس دنیا کے معاملات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ اسی دنیا کے کاروبار
میں اللہ کے قانون کی پیروی، اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی، اور اس کے مرضات کے
اتباع کا نام دین ہے۔ عبادات اور معاملات دو مختلف چیزیں نہیں ہیں، بلکہ معاملات ہی میں حدود اللہ
کی پابندی اور خوشنودی الٰہی کی طلب اور تقرب الی اللہ کی سعی کا نام عبادت ہے۔ نماز روزے اور
حج و زکوٰۃ کو عبادت اور فرض قرار دینے کا یہ مقصد نہیں کہ عبادت کو انہی اعمال میں منحصر کر دیا جائے
بلکہ یہ اعمال دراصل انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے مستعد کرنے والے ہیں جس کا دائرہ اس کی
زندگی پر وسیع ہے۔ مسلمان کی عبادت گاہ پوری کائنات ہے، اس کی ساری زندگی عبادت ہے، اس
پر آن خدا کا عبادت گذار بندہ ہونا چاہیے۔ اس کا معبد صرف اس کی مسجد تک محدود نہیں بلکہ مسجد
کی تربیت گاہ ہے جہاں وہ عبادت کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔ اگر اس کی نماز اور اس کے روزے
اور اس کی دوسری عبادتوں کا ربط اس کے معاملات سے منقطع ہو جائے اور وہ اپنی زندگی کے
میں قانون الٰہی کے اتباع سے آزاد ہو تو محض صوم و صلوٰۃ کی پابندی سے وہ دین دار اور عبادت گزار
بندہ نہیں بن سکتا۔

افسوس ہے کہ دین کا یہ تصور رفتہ رفتہ مسلمانوں کے ذہن سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ اور دین و دنیا
علیحدگی کا وہی جاہلی تصور اس کی جگہ لے رہا ہے جس کو اسلام نے مٹا دیا تھا۔ یہ اسی غلط تصور کا نتیجہ
کہ عبادات اور معاملات کا باہمی تعلق منقطع ہو گیا، عملی زندگی سے نمازوں کا ربط ٹوٹ گیا، معاشیات
کی فرمانروائی باقی نہ رہی، سال کے گیارہ مہینے رمضان کی حکومت سے آزاد ہو گئے بلکہ رمضان غریب
اپنے حدود میں بھی محض حلق کا دربان بنا کر بٹھا دیا گیا۔ حج کی حیثیت ہندوؤں کی جاترا اور
(Pilgrimage) سے زیادہ نہ رہی، اور یہ سمجھ لیا گیا کہ نماز اور فحشا و منکر، روزے اور
زکوٰۃ اور حرام خوری، حج اور معصیت ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔

مقالات

ورثۂ اسلامیہ کا ایک باب

تصوف اسلام ڈاکٹر نکلسن کی نگاہ میں

(۲)

ترجمہ و تحشیہ جناب ذوقی شاہ صاحب

ابن العربی کی تصنیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو اسپینوزا (Spinoza) کی یاد دل میں لاتی ہیں مگر اس نتیجہ پر آنا ذرا اندوشناک ہوگا کہ اندلسی یہودی کو اندلسی مسلم کے خیالات پر آگاہی تھی کیوں کہ اندلسی یہودی کی باطنی تفسیر توریت کے مبالغوں نے اس امر کو مخفی کر دیا ہے کہ وہ خود بھی ایک سنجیدہ اور جدت پسند غور و خوض کرنے والا شخص تھا۔ تاہم ابن العربی نے زمانہ متوسطہ کے بعض عیسائی علماء کو ضرور متاثر کیا اور جیسا کہ پروفیسر آسین پلیسیو (Professor Asin Palacios) نے حال ہی میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے ان کے دوزخ جنت اور عالم بالا کے نقشوں میں جو خصوصیات تھیں ان کو ڈانٹے Dante نے اپنی تحریروں میں اس قدر ملتا جلتا بیان کیا ہے کہ اسے محض توارد قرار دینا دشوار ہو گیا ہے۔ عوالم سفلیٰ، افلاک النجوم، دوائر روحانی، مرکز نور قدسی کے گرد ملائکہ کے حلقے، اور تثلیث کی جانب اشارہ کرنے والے دوائر ثلاثہ جو ڈانٹے (Dante) نے بیان کئے ہیں۔ وہ بعینہٖ وہی ہیں جو ابن العربی نے بیان کیے ہیں۔ ڈانٹے (Dante) بیان کرتا ہے کہ جیسے جیسے وہ جنت کے بلند سے بلند تر مقامات پر چڑھتا گیا اس کی محبوبہ کے حسن و جمال میں اضافہ ہوتا گیا جسے دیکھ کر ڈانٹے کی

بصیرت تیز ہوتی گئی اور عشق قوی ہوتا گیا۔ یہی خیال ابن العربی کی نظم میں بھی موجود ہے جو انھوں نے ڈانٹے سے تقریباً ایک صدی قبل ترجمان الاشواق (نمبر ۴۰) میں لکھی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ "محبوب کی ملاقات سے مجھ میں وہ باتیں پیدا ہوگئیں جو میرے وہم میں بھی نہ آتی تھیں۔ کیونکہ میں نے ایسی صورت دیکھی جس کا حسن و جمال ہر ملاقات کے ساتھ ترقی کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا ایسے عشق سے کبھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا جو محبوب کی حسن افزائی کے ساتھ برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہو"۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ابن العربی کی بھی ایک محبوبہ تھی جو مکین الدین کی حسین اور شایستہ بیٹی تھی اور نظام کے نام سے موسوم تھی اس کے عشق میں انھوں نے جو صوفیانہ غزلیں کہی تھیں ان کا جب چرچا شروع ہوا اور ان سے بدنامی ہونے لگی تب انہوں نے ان غزلیات پر ایک شرح لکھی تاکہ معترضین کو یقین ہو جائے کہ وہ لوگ غلطی پر تھے۔ اسی طرح ڈانٹے نے بھی کانوٹو (Convito) میں اُن اسرار باطنی کی شرح لکھنے کا قصد ظاہر کیا ہے جو اس کے چودہ عشقیہ گیتوں کی تہ میں مخفی ہیں۔ ان گیتوں کو اس نے کسی قبل کے زمانہ میں تصنیف کیا تھا۔ اور ان کے مضامین سے یہ غلط خیال پھیل گیا تھا کہ یہ اشعار خالص اور پاک محبت سے نہیں بلکہ شہوانی محبت سے متعلق ہیں مختصر یہ ہے کہ ان دونوں میں کُلی اور جزوی مماثلت اس حد تک پہنچی ہوئی ہے کہ صرف ایک ہی نتیجہ پر آنا ممکن ہے اسلامی خصوصیات مثلاً معراج اور حیات بعد الممات کا عام اور فلسفیانہ تخیل مسلمان محدثین اور فارابی۔ بوعلی سینا غزالی اور ابن عربی جیسے مصنفین کے ذریعہ مشترکہ علمی ذخیروں میں داخل ہو کر تیرھویں صدی عیسوی کے بہترین دماغوں تک یقیناً پہونچا ہوگا۔ اسپین اور سسلی کے عرب فاتحوں نے وہی فیضان مفتوحین پر کیا جو ایران اور شام کے یونانی تمدن سے خود انھوں نے حاصل کیا تھا گو مفتوحین پر اس فیضان کا اثر نسبتاً کمزور ہی کے ساتھ کیوں نہ پڑا ہو۔ ان دونوں صورتوں میں اس قبولیت تاثرات کی بین شہادت کا ملنا اگر بیشتر دشوار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے جب دو قومیں روزمرہ کی زندگی میں باہم مل جل کر رہتی ہیں اور یہ میل جول طویل مدت تک قائم رہتا ہے تو دونوں قوموں کی ذہنیت کا باہم ایک دوسرے سے متاثر

ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس کا تفصیلی ذکر تحریروں میں محفوظ رہ سکے۔

آؤ اب مشرق پر بھی نگاہ ڈالیں جہاں ایرانی تصوف کا عہد زرین شروع ہوچکا تھا جس طرح بون کے بعد رات آتی ہے اسی طرح وحشی مغلوں کے ایشیا پر سیلاب سے تباہی بربادی، بدحواسی، مصیبت اور بدنظمی کا جب دور ختم ہوا تو تصوف میں چمک پیدا ہوی۔ افراد کی طرح اقوام بھی مصائب طویلہ کے بعد تسکین حالت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ ایران بھی بوجہ اس کے کہ کثرت نقصان سے اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ رہا تھا اپنی آسائش و راحت کے لئے ان لوگوں کی جانب مائل ہوگیا جو ایک طرف تو ان چیزوں کو پیش کر رہے تھے جو اپنے فقدان کے باعث زیادہ قیمتی ہوگئی تھیں مثلاً حسن انتظام، امن، انصاف، امور منفعت عامہ، تمدنی خوبیاں، اور وہ مراسم و روایات جن پر قومی تنظیم کا دارومدار ہے، اور دوسری طرف سلامتی و مسرت ابدی کے وہ صوفیانہ نقشے پیش کر رہے تھے جو ان اہل صفا ہی کو میسر آسکتے ہیں جن کے نزدیک عالم ارواح ہی حقیقی اور دائمی چیز ہے۔ ان نقشوں کا کھینچنا صوفی شعرا ہی کا کام تھا۔ اور جس خوبی سے انہوں نے اس کام کو انجام دیا۔ اس نے تصوف کی فارسی شاعری کو ان ممالک میں بھی مشہور کر دیا جن میں فارسی زبان سمجھی جاتی ہے

ان نقشوں کی عقلی بنیاد ابن العربی نے مہیا کی ہم دیکھیں گے کہ ان کے اثر کی بدولت تصوف کو قلب و ضمیر سے اتنا تعلق نہ رہا جتنا کہ پرواز عقلی اور فلسفۂ ظنی سے اس کا تعلق ہوگیا اور یہ بات صوفیائے متقدمین کے اخلاقی اور مذہبی جذبات سے بیگانہ ہے اب مستند ولی وہ نہیں رہا جس نے خدا کو دعاؤں اور مناجاتوں سے طلب کیا ہو اور ریاضت شدیدہ کے بعد فنائیت کا جام پی کر محض ناقابل اظہار فضل ربی سے اسے پایا ہو بلکہ اب مستند ولی وہ ہے جو عارف کامل ہو، واقف رموز خفی و جلی ہو، انسان کامل ہو، خدا سے عینیت رکھتا ہو یا اس کا "امر کن" ہو اور یہ کہتا ہو کہ ؎

من آن روز بودم کہ اسما نبود   نشان از وجود مسمٰی نہ بود

زیں گشت اسم و مسمی پدید دراں روز کانجا من و ما نبود

اس نوعیت کی شاعری کی خصوصیات پر غور کرنے سے قبل اس فلسفیانہ نظریہ کو بیان کر دینا مناسب ہے جو کہ اس کی بنیاد ہے صرف ذات خدا ہی کا وجود ہے۔ اس کی صفات اس سے اعتباری غیریت رکھتی ہیں مگر حقیقتاً اس سے جدا نہیں۔ صفات الٰہی کے مجموعہ کو ہم کائنات کہتے ہیں، اور کائنات متغیر ہوتی رہتی ہے اور اس میں اللہ اپنا اظہار فرماتا ہے۔ کائنات کو بقا نہیں۔ اس ظہور ہی کے حقیقت میں حصہ ہے۔ جو چیزیں کو نظر آتی ہیں اپنا ذاتی وجود نہیں رکھتیں بلکہ ذات مطلق کے پرتو کی وجہ سے وجود اعتباری اختیار کرتی ہیں۔ نظام عالم میں مرتبہ انسانی کے متعلق اور تفصیل کی گئی ہے۔ عالم ارواح اور عالم اجسام کا اس میں اجتماع ہے۔ وہ کائنات کی روح ہے اور کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ سمت ظہور کی جانب اس کے ظلمت عدمی ہے۔ چونکہ تقید جسمانی نے اسے گرفتار کر رکھا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا سے جدا سمجھتا ہے۔ یہ نظری مغالطہ گو فہم و براہین کے مطابق ہے مگر فلسفۂ تصوف کے اس پہلے اصول کے خلاف ہے کہ جملہ ہستی اور جملہ افعال قدرت الٰہی کا مظہر ہیں۔ اس حقیقت کا انکشاف صوفیائے پر آہستہ آہستہ ہوتا ہے اور وہ اسے دوسروں تک اپنے ہی اشارات و اصطلاحات کی مدد سے پہنچا سکتے ہیں۔ جو عشقیہ شاعری میں ان باتوں کی جانب اشارہ کیا جاتا ہے وہ ان امور کو جن تک عقل کی رسائی نہیں نہایت خوبی سے پیش کر دیا کرتی ہے۔ علاوہ بریں جذبات عشق کو ان کیفیات و احوال سے بہت مشابہت ہے جو معرفت و ولایت سے متعلق ہیں۔ دور اول میں ان کیفیات کو پیدا کرنے کے لیے تلاوت قرآن سے کام لیا جاتا تھا۔ مگر بہت جلد یہ کام ان عشقیہ نظموں سے لیا جانے لگا جنہیں ابتداً اس تصوف سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کبھی مزامیر کے ساتھ اور کبھی بلا مزامیر اس نوع کی غزلیں حال پیدا کرنے کے لیے بکثرت گائی جانے لگیں۔ بعض صورتوں میں غزلیں اس مقصد کے لیے تصنیف بھی کی جاتیں۔ ان شعراء کا منشا صرف یہی نہیں ہوتا تھا کہ اپنے کلام میں حقائق کا اظہار کریں بلکہ اپنی شاعری

کے ذریعہ سے وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ ایک ایسا حسین وجمیل تخیل پیش کریں جو لامحدود اور ناقابلِ انتہا حقیقت کی جانب رہنمائی کرے اور روح میں عالمِ بالا سے ایک مناسبت پیدا کرکے اسے انتہائی انکشافاتِ روحانی کے لئے تیار کرے۔ مندرجہ مثالوں میں سے پہلی مثال ابن الفارض کے عربی دیوان سے لی گئی ہے اور دوسری مثال جلال الدین رومی کی فارسی غزل کا ایک حصہ ہے۔

(۱) میں ہی اپنے محبوب کے ساتھ تنہا تھا جب کہ ہم دونوں میں خاص راز و نیاز جاری تھے۔ میری مرضی کے مطابق مجھ پر تجلیات خاص ہوتی تھیں اور مجھکو نوازا جاتا تھا۔ شہرت لامحدود میں گم تھا۔ اس کے حسن اور اس کی شان کے درمیان مسرت خاموش کے ساتھ میں متحیر کھڑا رہتا تھا۔ میری روح پر کیفیات کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس کے رخ زیبا میں جملہ دلفریبیاں اور ادائیں مجتمع تھیں اور کامل حسن و جمال جھلک رہا تھا جسے دیکھ کر میں پکار اٹھتا تھا کہ "لا الٰہ الا ہو العلی العظیم"۔ (ابن الفارض)۔

۲۔ آقا سے پوچھو یہ کونسا مکان ہے جس میں سے مسلسل مست نغموں کی آواز آرہی ہے۔ اگر یہ کعبہ ہے تو اس صورت بت کے کیا معنی؟ اور اگر یہ عبادت گاہ مجوس ہے تو اس نورِ الٰہی کے کیا معنی! اس مکان میں ایک ایسا خزانہ ہے جو اس تنگ کائنات میں سما نہیں سکتا۔ یہ مکان اور یہ آقا نظر فریبی کر رہے ہیں، اس مکان کو ہاتھ نہ لگانا کیونکہ یہ ایک طلسم ہے آقا سے بات نہ کرنا کیونکہ وہ مست ہے۔ اس مکان کا کوڑا کرکٹ مشک و عطریات ہیں، اس کی چھت اور اس کے دروازے اشعار اور نغمے ہیں جسے اس مکان میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا وہ سلطانِ جہاں اور سلیمانِ وقت ہے۔ اے آقا! اس کی چھت سے اپنا سر ایک بار نیچا کر کیونکہ تیرا چہرہ نصیبہ وری کی علامت ہے۔ مثل آئینہ کے تیری صورت میری روح میں اتر آئی۔ تیری زلفوں کی نوکیں میرے دل میں مثل شانہ کے چبھ گئی ہیں۔ یہ آقا مثل زہرہ اور قمر کے ہے اور آسمانوں کا مالک ہے یہ مکان عشق کا مکان ہے۔

جس کی نہ کوئی حد ہے نہ انتہا۔" (مولانا رومی)۔

یہ غزلیات زمان اور مکان کی حدود سے تجاوز کرکے مستی کی وہ بلندی اختیار کرتی ہیں جہاں سے ہر چیز پر ایک مجموعی نظر پڑتی ہے۔

فارسی شاعری کی دوسری قسم افسانہ ہائے عشق کی حکایات سے متعلق ہے۔ اس نوع کی شاعری کو نظامی (م ۱۲۰۳ء) نے کمال پر پہونچایا۔ اس کے ذریعے اس درد و فراق کا نقشہ خوب کھینچا جا سکتا ہے جو سلوک الی اللہ میں روح پر گذرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بکثرت پرانی کہانیاں مثل لیلیٰ مجنوں اور یوسف زلیخا کے صوفیانہ رنگ میں از سر نو بیان کی گئیں۔

تیسری قسم ان کثیر التعداد نظموں کی ہے جن کی غایت محض تعلیمی ہے۔ ان کی ابتدائی صورت صرف منظوم ہدایات و نصائح ہیں جن کو مختصر کہانیوں اور واقعات سے مشرح کر دیا گیا ہے مثلاً حدیقۃ الحقائق جسے سنائی غزنوی نے لکھا ہے۔ یا پھر وہ نظمیں ہیں جن میں مقامات سلوک کا ذکر تشبیہ و استعارات کی مدد سے کیا گیا ہے ان دونوں اقسام کی شاعری نے نہایت تیزی کے ساتھ انتہائی ترقی حاصل کی۔ اول الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت مثنوی جلال الدین رومی ہے۔ اور موخر الذکر شاعری کی ترقی یافتہ صورت فرید الدین عطار کی منطق الطیر ہے۔ اس نظم میں ان طیور کا قصہ ہے جو ہُدہُد کی رہنمائی میں سیمرغ یعنی اپنے پر اسرار بادشاہ کی تلاش میں نکلے۔ ان طیور نے اپنی طلب میں سات وادیاں طے کیں جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) طلب۔ (۲) عشق۔ (۳) معرفت (۴) استغنا، (۵) توحید۔ (۶) حیرت (۷) فقر و فنا۔

ان وادیوں کے طے کرنے کے بعد تیس ۳۰ طیور جو بچ رہے تھے جب پیش ہوئے تو ان پر منکشف ہوا کہ وہ خود ہی سیمرغ ہیں اور سیمرغ کوئی چیز نہیں مگر وہی تیس ۳۰ پرندے

کشف ایں سر قوے درخواستند ‏ ‏ ‏ ‏ حال مائی و منی درخواستند

بے زبان آمد از آں حضرت خطاب ‏ ‏ ‏ ‏ کے بود ایں ذرہ چون آں آفتاب

ہرکہ آید خویش را بیند درو جان و تن ہم پیش را بیند درو

(عطار)

شاعر کا منشا غالباً جیلی کے اس دلچسپ مقولے سے سمجھ میں آجائیگا جس میں انہوں نے عیسائیوں پر اعتراض کیا ہے کہ ان لوگوں نے ظہور الٰہی کو صرف مسیح میں محدود کر دیا "خدا فرماتا ہے کہ میں نے آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اور یہاں آدم سے مراد بنی نوع انسان کا ہر فرد ہے۔ جو لوگ خدا کو انسان کے آئینے میں دیکھتے ہیں ان کو معرفت تامہ حاصل ہوتی ہے۔ اس عرفان کا ایک جزو ہی عیسائیوں کے ہاتھ آیا ہے۔ اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق ان کا عقیدہ آخرکار ان کی اس وقت رہنمائی کرے گا جب کہ اصل چیز اپنی اصلیت میں ان پر منکشف ہوگی اور جب انھیں یہ انکشاف ہوگا کہ انسان مثل آئینوں کے ہیں۔ جو آمنے سامنے رکھے ہوئے ہیں۔ ہر آئینہ میں وہ نظر آتا ہے جو سب آئینوں میں ہے لہٰذا وہ خدا کو اپنے میں دیکھیں گے اور اقرار کریں گے کہ خدا ایک ہے"۔

کیونکہ قواعد کے پابند نہیں، اس لیئے عارف مذہب اور لامذہبی سے برتر ہے"۔ مگر مبتذل قسم کے صوفیوں کو مستثنیٰ رکھ کر اوروں کے نزدیک اس کے یہ معنی نہیں کہ لامذہبی اور بداخلاقی کی اس مقولہ سے انھیں اجازت مل گئی ہو۔ ولی صادق شریعت کی پابندی کرتا ہے نہ بوجہ اس کے کہ وہ اس کے لیے مجبور ہے بلکہ بوجہ اس کے کہ وہ اپنے آپ کو خدا سے واصل محسوس کرتا ہے۔ تکمیل الٰہیت میں دونوں چیزیں شامل ہیں، ظہور بھی اور بطون بھی، وحدت بھی اور کثرت بھی، حقیقت بھی اور شریعت بھی خلق سے علیحدگی کافی نہیں تاوقتیکہ خالق کی ابدیت میں داخل ہو کر مخلوق میں خالق کے ظہور کا بھی قصد نہ دیا جائے۔ فنا سے گذر کر بقا میں پہنچنا انسان کامل کی علامت ہے۔ ایسا شخص سیر الی اللہ ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ سیر فی اللہ اور سیر مع اللہ میں معروف ہوتا ہے یعنی واصل باللہ ہونے کے بعد وہ خدا کے ساتھ عالم شہادت کی جانب لوٹتا ہے، اپنی بدایت کی جانب رجوع ہوتا ہے اور کثرت میں

وحدت کا اظہار کرتا ہے۔ اس نزول میں شریعت اس کا لباس ظاہری اور طریقت اس کی روش باطنی ہوتی ہے۔ وہ بنی نوع انسان کو حقیقت کی تعلیم دیتا ہے اور خود شریعت پر پوری طرح کار بند رہتا ہے ؎

شریعت را شعار خویش سازد ۔۔۔ طریقت را دثار خویش سازد

قطع نظر امور مذکور کے مسلمانوں میں اکابر اولیا، جنہیں سے بکثرت رہنمائے خلق تھے خوب سمجھتے تھے کہ جس لئے ادنی امور پر دسترس حاصل نہ کی ہو اس پر اعلی امور کا اظہار دراصل ان اعلی امور کی تضییع ہے سینٹ پال کی طرح وہ اس امتیاز کو مدنظر رکھتے تھے کہ " ایک گروہ کی پرورش کے لیے دودھ کی ضرورت ہے اور دوسرے گروہ کی پرورش کے لیے قوی گوشت کی" اس "دُہری صداقت" کا اصول انھیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ وہ اللہ کے متعلق قرآنی تنزیل کی یونانی ہمہ اوست Pantheistic Philosophy سے تطبیق دیسکیں اور اخلاقیات کا اتنا طلبہ سیا پیش کردیں جس کا انتہائی اصول یہ ہو کہ شر محض کا کوئی حقیقی وجود نہیں۔

ایرانی تصوف کا لب لباب عام فہم پیرایہ میں مثنوی معنوی مولانا جلال الدین رومی میں درج ہے مولانا درویشوں کے سلسلہ مولویہ کے بانی ہیں۔ آپ کا انتقال قونیہ میں ۱۲۷۳ء میں ہوا۔ اس مثنوی کو "فارسی کا قرآن" کہا گیا ہے۔ اور اس کے مصنف کا دعوی ہے کہ اس میں تعلیم پیغمبر کا مغز بیان کر دیا گیا ہے جو شخص سرسری طور پر اس تصنیف کی ادھر ادھر سے ورق گردانی کرے گا وہ دیکھیگا کہ اس کی تعلیمات میں جابجا حکایات، واقعات، افسانے، کہانیاں، اور روایات جو شامل کی گئی ہیں وہ زمانہ سلطی کے مذہبی خیالات اور مذہبی زندگی پر محیط ہیں۔ غزلیات میں تو مولانا کی صوفیانہ نگاہ سوائے خدا کے کسی اور چیز پر نہیں جاتی مگر مثنوی میں انہوں نے ایک ایسے مبلغ اور پرجوش معلم کی شان اختیار کی ہے جو ان لوگوں کی رہنمائی کرتا ہو جنہوں نے خدا تک پہنچنے کا راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ساری تعلیم کا نچوڑ افتتاحی

اشعار میں دیدیا گیا ہے جس میں نے کو جو مولویہ سلسلہ کے درویشوں کا مقدس باجہ ہے، روح کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے اور اس روح پر خدا سے فراق کا مسلط ہو جانا بیان کیا گیا ہے۔ ؎

بشنو از نے چوں حکایت میکند ۔ وز جدائیہا شکایت میکند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ۔ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق ۔ تا بگویم شرح درد اشتیاق

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش ۔ باز جوید روزگار وصل خویش

اس نظم کے متعلق خوب بات کہی گئی ہے کہ "مذہبی تخیل کو عشق کی رنگینی سے رنگین اور پاکیزہ بنانے کی یہ ایک کوشش ہے"۔ بقول جلال الدین کے وہ مذہب جو دلائل پر مبنی ہو اور ثبوت عقلی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا ہو اتنا ہی بیکار ہے جتنا کہ وہ مذہب جو رسم و رواج اور قدامت پرستی پر مبنی ہو "تنبرک راز دان جانتا ہے اور ثبوت کا محتاج نہیں۔ شیطان کی جانب سے منطق ہے اور آدم کی جانب سے عشق"۔

خدا کی نگاہ میں رسمیات اور فرقہ بندیوں کی کوئی وقعت نہیں۔ خدا نہ مسجد میں رہتا ہے، نہ گرجا میں، نہ مندر میں۔ وہ پاک اور ستھرے دل میں رہتا ہے۔ اصل چیز پوری اخلاقی کایا پلٹ ہے جو ایمان کامل اور عاجزانہ دعاؤں سے حاصل ہوتی ہے۔ جلال الدین کو خدا کی اچھائی اور انسان کی گنہگاری کا پورا یقین ہے اس لیے وہ خالق کی طرف شر کی اضافت کے قائل نہیں بلکہ مخلوق کی طرف اس کی اضافت کے قائل ہیں۔ خدا کا اپنے کمال کو ظاہر کرنا خوبی ہے جس طرح کہ ایک مصور خوشنما اور بدنما دونوں چیزوں کی تصویر کھینچنے میں اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے نہ کہ اپنی بدنمائی کا۔ مگر مثنوی نے اس پہلو پر بہت زور دیا ہے کہ جملہ اشیا میں جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہیں ایک ربط باہمی اور تناسب موجود ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ ہر انفرادی شر منفعت عامہ کے حق میں خیر ہے۔ تاہم اس ایرانی صوفی نے

خودی کے خلاف مرتے دم تک جنگ جاری رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ خودی کو "ساتوں دروازوں والی دوزخ" اور "تمام بتوں کی ماں" قرار دیا ہے۔ جو عیب لوگوں کو دوسروں میں نظر آتا ہے وہ دراصل اُن ہی کے عیب کا پرتو ہے۔ "جو خرابیاں تم دوسروں میں دیکھتے ہو وہ سب تم ہی میں ہیں۔ جو ضرب تم دوسروں پر لگاتے ہو وہ تم ہی کو لگتی ہے تمہیں اپنے عیوب صاف نظر نہیں آتے ورنہ تم اپنے سے پوری نفرت کرتے"

اس شاعر نے شہوت اور بدکرداریوں کے متعلق اس خوبی، اس قوت، اور اس صداقت سے اس نظم میں طول طویل کلام کیا ہے کہ بعض اوقات مترجم کو اس کا ترجمہ کرنے میں دقتیں پیش آتی ہیں جبریوں کے مقابلے میں وہ زور دیتے ہیں کہ ہمارے افعال اگرچہ خدائی قوتوں کا نتیجہ ہیں تاہم ہمارے ہی اختیار سے سرزد ہوتے ہیں اور ہمیں کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم خدا کو ان کا ذمہ دار قرار دیں اگر گنہگاروں کو ارتکاب گناہ میں اپنی مجبوری کا احساس ہے تو وہ اس جبر کے تحت میں اتنی مستعدی کے ساتھ کیوں آجاتے ہیں اور بعد میں وہ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں اور انہیں خطاکار ہونے کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ مگر یہ اس مسئلہ کا تشفی اور آخری حل نہیں۔ کمال عشق کے بغیر اور ارادۂ انسانی کو ارادۂ الٰہی کے تحت میں لائے بغیر کمال آزادی محال ہے۔

لفظ جبر م عشق بے صبر کرد — آنکہ عاشق نیست حبس جبر کرد
این معیت با من است این جبر نیست — این تجلی مہ است این ابر نیست
گر بود این جبر جبر عام نیست — جبر آن امارۂ خودکام نیست

جو اخلاقی رنگ مثنوی پر غالب ہے وہ مثنوی کے ان فلسفیانہ حصوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جن میں ہستی واحد کا حیات کے مختلف طبقات میں ظہور فرمانا بیان کیا گیا ہے۔ اس ظہور کا خلاصہ روح کا وہ ارتقا ہے جس میں عقل کل کا تنزل عالم مادہ میں ہوا اور معدنیات، نباتات، حیوانات میں سے گذر کر عقل انسانی میں اظہار رہوا۔ پھر امتحانات ہوتے رہے ہیں۔ عالم ملکوت میں عروج ہوا

اور روحانی نشوونما ہوتے ہوتے اس اطلاق میں وصل ہوا جس کا وہ آئینہ ہے اور یہ کھل گیا کہ احساس فراق صرف ایک خواب تھا ۔

آمدہ اول بہ اقلیم جماد	وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد نادرد از نبرد
وز نباتی چوں بہ حیواں اوفتاد	نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آن	خاص در وقت بہار وضیمران
ہمچو میل کودکاں با مادراں	سر میل خود نداند درمیان
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت	تا شد اکنون عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست	ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد زیں عقل پر حرص و طلب	صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب
گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد ز پیش	کے گذارندش درآن نسیان خویش
باز ازاں خوابش بہ بیداری کشند	کے کند بر حالت خود ریشخند

گنجایش نہیں کہ اس عظیم الشان اور ہمہ گیر کتاب منظوم کے زائد اقتباسات یہاں درج کئے جائیں ایرانی تصوف کا اصلی رنگ اس خوبی اور قوت کے ساتھ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اس کی کہیں کوئی نظیر نہیں ملتی، گو بوجہ اس کتاب کے عالمانہ رنگ طوالت اور اشکال پسندی کے اول سے آخر تک بالالتزام کم لوگ اُسے پڑھتے ہیں۔ اس کے مصنف کو دنیائے مجاہدکی عملی حل ہوتی اور غزالی کے مقابلہ میں وسیع الخیالی بھی زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ غزالی کا مذہبی رنگ زمانہ وسطی کے روشن خیال علماء کے مذہبی رنگ سے ملتا جلتا ہے صوفی کی فطرت میں ایک پرواز ہوتی ہے اور فقیہہ کا کام اس بڑھیا کی نقالی ہے جس نے شاہی باز کے ہاتھ آجانے پر اس کے پر اور پنجے تراش دیئے تھے۔ اسلام میں اس

نوعیت کی سزائیں دینا شامل ہے۔ صوفیوں نے اسلام میں مقید رہ کر اس معاملہ میں جائز حد تک ترقی کی۔ صوفیوں کی اس ترقی سے جو آزادی حاصل ہوی وہ بالاخر فریقین کے لیے مفید ثابت ہوئی فریقین کے اصل جھگڑوں میں اس نے منصفانہ روش اختیار کی اور باہمی رواداری کو ترقی دی۔ بعض رومن کیتھولک مصنفین اس آزادی کی طرف جن امراض کو منسوب کرتے ہیں وہ امراض کم از کم ان معالجات سے کسی طرح بدتر نہیں جو یورپ کی مذہبی حکومتیں ایام گذشتہ میں کام میں لا چکی ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں صوفیوں نے بھی اپنی تعلیمات کے بعض اندیشہ ناک نتائج سے محفوظ رہنے کے لیے رفتہ رفتہ ایک ایسی تنظیم قائم کر لی جس کے تحت میں کاملین کے ارشادات کی تعمیل ماتحتوں پر لازمی قرار پا گئی۔ اس تنظیم نے ایک مذہبی حکومت کی صورت اختیار کر لی جس کے اراکین پوشیدہ و ظاہر اولیاء ہیں اور ان کا قطب اُن کا افسر اعلیٰ ہے۔ صوفیوں کے عقیدہ کی رو سے دنیا کی روحانی حکومت اسی جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ اس جماعت کی ذمہ داری اس بنا پر اور بھی زیادہ بڑھی ہوی ہے کہ علاوہ ہر صوفی کی تعلیم ایک شیخ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس شخص نے اپنی تعلیم آپ ہی کی ہو وہ اس سلسلہ سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ مگر نگران کا نگران کون ہو؟ اولیاء کی خوبیوں سے مجھے بحث نہیں مگر رسمی یا خود ساختہ قوانین اخلاق یا اس دنیا کی کسی دوسری چیز کا ایسے لوگوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے جو اپنے اوپر آپ ہی اثر ڈالنے کے طریقوں (Autohypnotic Methods) سے اپنی کیفیات کو بڑھاتے ہیں اور اپنے آپ کو اس حد تک الہام رسیدہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو خدا میں گم تصور کرنے لگتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ ان لوگوں کو معمولی معیار سے جانچا جائے جو کہ ایک فضول بات ہے آؤ ہم غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر آئیں کہ اپنے نصب العین میں یا جیسا کہ وہ کہتے ہیں حقیقت میں ان کا سچا انہماک گناہوں کے انبوہ کثیر کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اور آؤ ہم اس بات کو بھی تسلیم کر لیں کہ اپنی تلاش میں اگرچہ وہ مقصود تک نہیں پہنچے تاہم جو کچھ اسلام انہیں دے سکتا تھا اس سے پاکیزہ تر مذہب اور اعلیٰ تر اخلاق تک بہر نوع

ان کی رسائی ہوگئی۔ ؎

آر اے۔ نکلسن۔

؎ افسوس ہے کہ پروفیسر نکلسن نے اس مضمون میں نہ اسلام کے متعلق اپنی صحیح معلومات کا ثبوت دیا نہ تصوف کے متعلق جو شخص ان دونوں چیزوں سے پوری طرح واقف نہ ہو اس کی راستان کے تعلق باہمی کی بابت معتبر نہیں امور مذہبی میں سلمیات پر فلسفیانہ نگاہ ڈال کر ظنیات میں الجھنا اور قیاسی نتائج پر آ کر ٹھوکریں کھانا محققانہ شان سے بعید ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کہ یورپ کے تعلیم یافتہ لوگ مسمرزم اور ہپناٹزم پر اعتبار نہ کرتے تھے کیونکہ یہ چیزیں ان کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اب تک یورپ میں جماعت کثیر ان چیزوں کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔ صرف ایک جماعت قلیل ہے جو ان سے کسی قدر شغف رکھنے لگی ہے۔ مگر اب تماشا یہ ہے کہ وحی والہام کے متعلق ہر وہ بات جو اہل یورپ یا ان کے شاگردوں کی سمجھ میں نہیں آتی مسمرزم یا ہپناٹزم کی کوئی قسم قرار دے دی جاتی ہے عام اس سے کہ قرار دہندہ مسمرزم کے ماننے اور دیکھنے والے ہوں یا نہ ہوں۔ ان لوگوں کے نزدیک وحی الٰہی بھی نعوذ باللہ سلف ہپناٹزم ہے اور صوفیائے کرام کے احوال و وجدانات بھی وہی نوعیت رکھتے ہیں لیکن ایک فلسفی جو اپنے کمرہ میں بند ہو کر اپنے تخیلات میں گم ہو جاتا ہے اور دور کی کوڑی لانا شروع کر دیتا ہے یا ایک سائنس دان موجد جو اپنی لیبوریٹری (Laboratory) میں مقید ہو کر دنیا و ما فیہا سے بےخبر ہو جاتا ہے اور اپنی کسی ایجاد مطلوب کی دھن میں مستغرق رہتا ہے وہ اپنے ارتقائے تخیل کے کسی درجہ میں جا کر بھی سلف ہپناٹزم زدہ نہیں ہوتا۔ ایام جاہلیت کے جاہل و منکر عرب حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبعوث ہونے پر آپ کے جن کمالات پر جادو کا گمان کرتے تھے ان ہی کمالات پر اب اہل یورپ ہپناٹزم کا گمان کرتے ہیں۔ صرف الفاظ کا فرق ہے۔ ذہنیت میں کوئی فرق نہیں۔

(ذوقی)

معاملہ میں ء

مسلم سوسائٹی

از جناب چودھری غلام احمد صاحب ویزہ ہوم ڈپارٹمنٹ نئی دہلی

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ دنیا میں ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جس میں خود یہ صلاحیت موجود ہو کہ دنیا میں عزت و وقار، ذمہ داری اور خود اعتمادی کی زندگی بسر کرے اور اس کے ساتھ ہی روحانی نشو و ارتقا کی آخری منازل طے کرنے کے لیے اس معراج کمال تک پہنچے جو تخلیق انسانی کا مقصود کہلایا جاسکے اور اس صلاحیت کو وہ اپنے تک ہی محدود نہ رکھے بلکہ جو انسان اس فضا میں سانس لے یہ جوہر انسانی اس میں بھی متعدی طور پر سرایت کر جائے حتی کہ اس جماعت کی وسعت شرق و غرب کو محیط ہو جائے۔ اس سوسائٹی (جماعت) کا وجود فی احسن تقویم سب سے پہلے عرب کی اونٹ چرانے والی قوم میں اس وقت عمل میں آیا جب کہ اس معلم الحکما، اعلم الناس، نبی امی نے اپنی پردہ کشا تعلیم اور حقیقت نما عمل سے ان میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا جو چشم فلک نے نہ اس سے قبل کبھی دیکھا اور نہ پھر دیکھنے میں آیا۔ درحقیقت یہ ایک خمیر تیار کیا گیا تھا کہ اس سے دوسری قومیں بھی اسی نہج اور روش پر تیار کی جائیں چنانچہ اس امت وسط نے پہلے اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کی، اور اس کے بعد جہاں جہاں وہ پہنچے، آفتاب نبوت سے جو اکتساب نور انھوں نے کیا تھا اس کی ضیا پاشیوں میں ہر جگہ عملاً مصروف ہو گئے۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔

لیکن یہ دور سعادت جلد ختم ہو گیا۔ اور اس کے بعد۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے خدا کی عبادت کو

واتبعوا الشھوات فسوف یلقون ضائع کر دیا اور نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے پس
غیا بہت جلد ان کی گمراہی ان کے آگے آئے گی

چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ مسلمانوں کی سوسائٹی سے متعلق بے گانے جو رائے قائم کریں اسے تو برطرف رکھیے، خود مسلمان جب اپنی حالت پر ذرا سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو انھیں اپنے آپ سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے (بشرطیکہ قلب میں احساس موجود ہو) اور یہ انسانی ذلت کی انتہا ہے کہ وہ اپنی ذات سے نفرت محسوس کرنے لگے حقیقت یہ ہے کہ جو عیوب عمومیت اختیار کر جائیں وہ سوسائٹی کی نگاہ میں عیوب ہی نہیں رہتے اس لیے کہ جس طرح آنکھوں کے ساتھ لگا کر کسی کاغذ کا پڑھنا مشکل ہے، انسان کے لیے اپنا آپ ناقد ہونا بھی بہت مشکل ہے۔ ہمارے پاس ایک صحیح تنقید کا معیار موجود تھا لیکن اس کو ہم نے برکات حاصل کرنے کے لیے جزدانوں میں بند کر کے رکھ دیا اب ہمارے عیب و صواب میں تمیز کرے تو کون کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کریم کی روشنی میں دیکھیں کہ ہماری انفرادی زندگی میں کون کون سے عیوب داخل ہو چکے ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہ کونسے جوہر تھے جو اس سوسائٹی میں موجود تھے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، اور ہماری سوسائٹی میں ان کی بجائے کون کون سے نقائص پیدا ہو گئے ہیں۔

مگر جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، چونکہ قرآن کریم کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایک اس قسم کی مثالی سوسائٹی پیدا ہو جائے، لہذا اس کی تعلیم شروع سے اخیر تک اسی مشن کے لیے وقف ہے کہیں امثال و نظائر سے، کہیں عبرت و موعظت سے، کہیں تذکیر و تادیب سے، کہیں قصص و حکایات سے، کہیں اوامر و نواہی سے کہیں تبشیر و انذار سے، اسی سوسائٹی کی تشکیل و تربیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ لہذا تفصیل سے یہ بتانا کہ اس قسم کی سوسائٹی میں کون کون سی خصوصیات ہوں گی کن امور سے ان کو اجتناب اور کن کا اصرار ہو گا گویا تمام قرآن کریم کو بیک وقت سامنے لے آنا ہو گا، جو مشکل ہے۔ اس لیے عنوان زیر نظر کو ان موٹی موٹی باتوں تک محدود رکھا جائے گا۔ جو ہر روز ہمارے سامنے واقع ہوتی ہیں۔

اور ان میں ہم کوئی خرابی محسوس نہیں کرتے۔ ایسے واقعات جو ہماری سوسائٹی کا خاصۂ حیات بن چکے ہیں، اور جن کے متعلق کبھی خیال بھی نہیں گذرتا کہ وہ قرآنی تعلیم کے منافی ہیں۔ تخم خنزیر کو چھو جانے والا آج بھی ہماری سوسائٹی میں "اچھوت" کہا جاتا ہے، لیکن اپنے بھائی کا تمام خون پی جانے والا (بشرطیکہ وہ ذرا ہوشیار رہا) کبھی حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ لہٰذا یہی وہ خرابیاں ہیں کہ جن کو بےنقاب کرنے کی ضرورت ہے، اور انہی کی اصلاح سے قوم کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ وما توفیقی الّا باللہ۔

ا۔ تحقیق اخبار۔

رشید[۱]:۔ "کہو میاں سنا تم نے کچھ۔ مولوی ابو سعید صاحب حج کو جاتے وقت دو ہزار روپیہ حمید کے پاس بطور امانت رکھ گئے تھے حمید صاحب صاف مکر گئے۔ اب کیا اعتبار کیا جائے ان لوگوں کی نمازوں کا۔ لاحول ولاقوۃ لیکن مختار بھائی! اس کا ابھی ذکر نہ کرنا کہیں"۔

مختار بھائی یہاں سے اٹھے اور سیدھے ابوالفضل کے پاس پہنچے۔ رشید صاحب کا بیان بلا حوالہ یوں بیان کر گئے گویا بنفس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اور اس پر اتنا اضافہ بھی فرما دیا کہ "مولوی ابو سعید صاحب نے دعوی دائر کر دیا ہے۔ آخر میں وہی تاکید ان سے بھی کر دی کہ بھائی کہنا نہیں کسی سے۔ خواہ مخواہ بچارے کی عزت خراب ہو گی۔

شام تک آپ دیکھیے تو گلی کوچے میں یہ خبر مشہور ہو چکی ہو گی۔ حالانکہ مولوی صاحب اور حمید دونوں اسی محلے کے رہنے والے ہیں لیکن کسی نے اتنی تکلیف گوارا نہیں فرمائی کہ ان سے جا کر بات کی تحقیق تو کرے۔ آپ دیکھیں گے یہ واقعات ہر روز پیش آتے ہیں۔ اور سوسائٹی میں ہزار خرابیوں کا موجب بن رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا صاف صاف ارشاد ہے۔

---

[۱] روئے سخن کسی کی طرف ہو تو۔ دسیاہ۔ (نام سب فرضی ہیں)۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا	جس بات کا تمہیں تحقیقی علم نہ ہو اس کے پیچھے مت ہو جایا کرو۔ یاد رکھو کان۔ آنکھ۔ قلب ہر ایک سے بازپرس ہو گی۔[۵]

۲۔ فتنہ انگیزی۔ کتم شہادت۔

رشید:۔ "میاں وہ حمید کے ساتھ تمہاری کیا بات ہو گئی۔ وہ تمہارے متعلق بڑی بکواس کرتا تھا۔ میں تو حیران ہو گیا۔ تمہارے خلاف بڑے الزام دھر رہا تھا"۔

مختار:۔ بھئی میں تو اس سے تنگ آ گیا۔ قسم لے لو جو میں نے کبھی اس کے خلاف زبان بھی ہلائی ہو۔ لیکن نہ معلوم اسے مجھ سے کیا بیر ہے کہ ہر جگہ مطعون کرتا پھرتا ہے۔ اگر اس نے واقعی ایسا کہا ہے جیسا تم کہتے ہو تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں لیکن کیا تم یہی بات اس کے منہ پر بھی کہہ دو گے؟"

رشید:۔ "نہ بابا! میرا نام نہ کہیں لینا۔ خدا کے واسطے۔ میں نے تو تمہارے بھلے کے لئے یہ بات بتا دی۔ مجھے کیا غرض کہ اس سے عداوت مول لیتا پھروں"۔

یقین مانیے کہ یہ "بھلے کی کہنے والے" تمہارے اور سوسائٹی کے بدترین دشمن ہیں۔ انہی کے دم سے سوسائٹی تشتت و افتراق کا مرقع بن رہی ہے۔ یا تو یہ محض فتنہ انگیزی کرتے ہیں جس کے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ کہ

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ	فتنہ انگیزی قتل سے بھی زیادہ خطرناک ہے

اور اگر سچ کہتے ہیں تو پھر شہادت کو چھپاتے ہیں۔ جس کے متعلق فرمایا کہ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ	اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے۔ جو اس شہادت کو چھپائے جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے۔

[۵] استیعاب مقصود نہیں۔ اس لئے صرف ایک ایک آیۃ پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

جو شخص آپ سے ایسی بات کہے کبھی اسے تسلیم نہ کیجئے جب تک کہ وہ اہل معاملہ کے سامنے بھی شہادت دینے پر آمادہ نہ ہو۔ ایک دفعہ آپ ایسا سلوک کیجیے پھر دیکھیے آیندہ کے لیے خود بخود آپ کے یہ "بہی خواہ" الگ ہو جائیں گے، اور آپ کا کوئی دشمن باقی نہ رہے گا۔

۴۔ منافست۔ حسد۔

رشید "میں نہیں سمجھتا کہ یہ ممبری کیا ان کے باپ دادا کی میراث ہے۔ کوئی بھی مقابلہ میں کھڑا ہو کبھی کامیاب ہی نہیں ہونے دیتے۔ خبر نہیں ان کے پاس کیا جادو ہے کہ کوئی ان کی مخالفت کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔"

ان جذبات کا اظہار ایک ایسے مسلمان بزرگ کے متعلق ہو رہا ہے جنہیں خدا نے امارت دی ہے پھر وہ غریبوں کی حاجت براری کرتے ہیں۔ نیک بخت ہیں اہل محلہ ان کے سایہ عاطفت میں امن وسکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ پھر وہ مسلمانوں کی نمایندگی بھی حتی الامکان صحیح طور پر کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے انھیں کے محلہ میں یہ رشید صاحب بھی ہیں کہ ممبری کے لیے جان دئے دیتے ہیں۔ حریف کے برابر صفات تو پیدا کر نہیں سکتے لیکن مارے حسد کے جلے جا رہے ہیں۔ اور طرح طرح کا پروپیگنڈا ان کے خلاف کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے جہاں ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جن پر اللہ کی لعنت ہے تو فرمایا۔

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (پ ۵) یا جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے لوگوں کو دے رکھا ہے یہ اس پر حسد کرتے ہیں۔

یہ تو رہا عام حالات کے متعلق خاص خاص ذمہ داریوں کے باب میں تو قرآن کریم نے بہت ہی بلند اصول پیش کیا ہے۔ وہ قوم وملت کی نمایندگی کو ایک امانت (Public trust) قرار دیتا ہے۔ اور حکم دیتا ہے کہ اگر ایسی امانت تمہارے سپرد بھی کر دی جائے، اور تم دیکھو کہ تم سے زیادہ کوئی اور شخص اس کا اہل ہے، تو خود اس سے دست بردار ہو کر یہ امانت اس کے حوالہ کر دو۔ فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا۔ بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کر دیا کرو۔

"باقی رہا بڑا بننے" کا جذبہ تو یقین مانیے ایسی خواہشات رکھنے والے کے لیے خدا کی بادشاہت میں کوئی جگہ نہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۲۸)۔ یہ آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے ہم نے بنایا ہے۔ جو نہ تو دنیا میں "بڑا بننا چاہتے ہیں" اور نہ ہی فساد کرنا چاہتے ہیں اور عاقبت تو خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ہے۔

۴۔ تنقید و تنقیص۔

"تجویز تو یہ بڑی معقول ہے لیکن........"

آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ وہ ہر معاملہ میں "لیکن" ضرور لگائیں گے۔ محکم سے محکم تجویز، پختہ سے پختہ پروگرام، اعلیٰ سے اعلیٰ اسکیم ان کے سامنے رکھیے، ہر بات کو تسلیم کرنے کے بعد "لیکن" ضرور آجائے گا۔ یقین مانیے یہ وہ لوگ ہیں کہ جو نہ خود کسی کام کو کرسکتے ہیں، اور نہ دوسروں کو کچھ کرنے دیتے ہیں۔ جن قوموں میں قوت عمل موجود ہوتی ہے، ان میں "لیکن" کہنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ نپولین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کہہ رکھا تھا کہ ہمارے لغت میں "لیکن" کا لفظ ہی موجود نہیں ہونا چاہئے۔ کچھ کرکے دکھانے والے انسانوں کو فرصت کہاں کہ وہ خواہ مخواہ کی نظری موشگافیوں میں وقت ضائع کریں۔ ان کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ کوئی معاملہ سامنے آیا، اس کے حسن و قبح پر پوری توجہ سے غور کیا اگر حسنات کا پہلو جھکتا ہوا نظر آیا، تو فوراً اس پر عمل شروع کر دیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد۔

سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کے گائے ذبح کرنے کا واقعہ مذکور ہے۔ اللہ میاں نے سیدھا سادہ

حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ ان کے عملی قوی معطل ہو چکے تھے۔ لگے موشگافیاں کرنے کہ اس کا رنگ کیا ہو
کس کام کے قابل ہو، داغدار ہو یا بے داغ، غرض ہزار نکتہ آفرینیوں اور حجتوں کے بعد وہ کہیں تعمیل ارشاد
پر آمادہ ہوئے۔ چنانچہ اس قصہ کے آخر میں فرمایا کہ وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ (وہ کرتے کراتے تھے نظر نہیں آتے تھے)
یہ ٹکڑا فی الحقیقت ایسی قوموں کی نفسیاتی کیفیت اور ذہنیت کا ترجمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی آیات تقسیم
کرتے ہوئے فرمایا کہ ایک تو محکم آیات ہیں، جو اصل الاصول ہیں، اور دوسری متشابہات ہیں۔ جن لوگوں کے
دلوں میں کجروی ہے، ان کی یہ حالت ہے کہ وہ ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تاکہ تاویلات
اور فتنہ پردازی کا موقعہ ملتا رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نگاہیں ہمیشہ کمزور پہلوؤں کو تلاش کیا کرتی ہیں۔
شروع شروع میں تنقید بیجا کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بڑھتے بڑھتے تنقیص اور پھر انکار کی صورت
اختیار کر لیتا ہے۔ بس یہی نگاہیں قوم کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہیں۔ اور دنیا میں نگاہ اور ذہنیت کے
بدل جانے سے اشیاء کی ہیئت بدل جاتی ہے۔ ایک شخص ہمیشہ نالاں و شکوہ گذار رہے گا کہ اللہ تعالیٰ نے
پھولوں کے ساتھ کانٹے کیوں پیدا کر دئے۔ لیکن دوسرا شخص سجدۂ شکر بجا لائے گا کہ غنیمت ہے۔ اس نے
جہاں کانٹے پیدا کئے تھے وہاں پھول بھی پیدا کر دیے۔ صاف و شفاف پانی آپ کے سامنے آئے آپ کی
روح کو تازگی ملے گی لیکن اگر اسی پانی کو آپ خوردبین کی نگاہ سے دیکھیں تو اس میں کروڑہا کیڑے دکھائی
دیں گے۔ سو وہ آنکھیں جنھیں ہر شئے میں کیڑے ہی کیڑے نظر آئیں جتنے جلد اندھی ہو جائیں اچھا ہے۔

۵۔ بحث و جدال۔

"تم جھوٹے تمہارا باپ جھوٹا۔ اگر ایک لفظ اور بکے تو سر توڑ دونگا۔"

ایک علمی موضوع پر مبادلۂ خیالات ہو رہا تھا۔ متانت سے یبوست اور یبوست سے سب و شتم تک
نوبت پہنچی اگر بیچ بچاؤ نہ ہو جاتا تو عجب نہیں کہ دست و گریبان کا نظارہ بھی سامنے ہوتا۔ جن قوموں میں
صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ وہاں اہم مسائل اور ادق نکات بحث و نظر سے ہی طے پاتے ہیں لیکن جب قومیں

روبہ تنزل ہوتی ہیں تو بحث و تمحیص اور دنگا فساد گویا مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کے دستور العمل حیات کا اہم فرمان ہے کہ۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۱۲۵

اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت و موعظت (علم و دانش) اور نیک نصیحت) سے بلائیے اور ان کے ساتھ عمدہ طریق سے بحث کیجئے۔

بحث و جدل کو چھوڑئیے۔ عام گفتگو میں دیکھیے تو اس قدر بازاریت کہ "قدامت پسند" طبقہ بھی بازاریت کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ مزاح استہزاء کا پہلو لیے ہوئے۔ انداز تخاطب میں بالکل شہدپن۔ باہمی بے تکلفی کا مقصد یہ کہ بات چیت میں صاف عریانیت آجائے جتنا کوئی بدتمیزی میں بڑھتا جائے۔ زیادہ پاپولر ہوتا جائے۔ اور اس کا انجام یہ ہو کہ باہمی علیک سلیک بھی ختم ہو جائے۔ قرآن کریم نے پہلے ہی فطرت انسانی کو سامنے رکھ کر فرما دیا تھا۔

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ۵۳

میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ (آپس میں) نہایت اچھی اچھی باتیں کیا کریں یقیناً شیطان ان کے درمیان تفرقہ ڈالنا چاہتا ہے اور شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

۷۔ اختلاف خیالات۔ آزادی آراء۔

اختلاف خیالات کو امت کے لیے رحمت قرار دیا گیا تھا۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ذہنی جلاء ہمیشہ اختلافی مسائل سے حاصل ہوتی ہے۔ تجارب میں پختگی، معاملات میں استواری، خیالات میں رفعت، تجاویز میں استحکام، لائحہ عمل میں بردمندی، ہمیشہ اختلافات سے پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اسی وقت تک کہ اختلاف آراء کو ذاتی انتقام خصومت پر محمول نہ کیا جائے۔ جونہی اس میں ذاتیات کا خیال پیدا ہوا اور ملت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے' اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے، ان کے اعمال

غارت ہوگئے۔ آج امت مسلمہ کے ادنیٰ طبقہ میں نہیں اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ میں بھی نگاہ دوڑا کر دیکھئے کہیں آپ کو اختلاف آراء برداشت کرنے والے مسلمان ملتے ہیں؟ جب تک ان کی ہاں میں ہاں ملائے جائیے اتحاد بھی ہے، پارٹی بھی ہے، یکجہتی بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن کسی معاملہ میں آپ آزادیٔ ضمیر سے کام لیجئے، روحانی رہنما ہو یا مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر ہو یا تمدنی مصلح، آپ کے اس جرم کو بخشنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوگا اور یہی ہمارے تمام اختلافات کی جڑ ہے۔ قرآن کریم نے جو سب سے بڑا انعام گنایا ہے وہ یہی اتحاد و مواخات ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

"اللہ کے سلسلے کو سب متفق ہو کر مضبوطی سے پکڑے رہو اور متفرق مت ہو جاؤ اور تم پر جو اللہ نے انعام کیا ہے اسے یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر اللہ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی سو تم خدا کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے، اور تم لوگ ایک آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اللہ نے تمہیں اس سے بچایا۔۔۔۔" ۱۰۲/۳ -

لیکن اس سے متصل ہی یہ آیت ہے۔

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۱۰۳/۳

اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی ضروری ہے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے نیک کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے روکا کرے۔ اور یہی لوگ کامیاب ہوں گے

بظاہر ان دونوں آیتوں میں شاید باہمی ربط نظر نہ آئے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہو جائے گا کہ ان میں وہی ربط موجود ہے جو بطور علت و معلول اوپر عرض کیا گیا ہے۔ یعنی اتحاد کی اہمیت واضح کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ آزادیٔ رائے اور حریت ضمیر اس اتحاد میں مانع نہ ہونی چاہیے ظاہر ہے کہ کسی کو نیکی کا حکم کرنے اور اسے برائی سے روکنے کے لیے اختلاف خیالات اور آزادیٔ رائے کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اگر جی حضوری نصب العین ہو تو پھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیسے ہو سکے لہٰذا

ان دونوں باتوں کو لازم و ملزوم قرار دے کر اس کے بعد پھر اتحاد کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا کہ

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۳ - ۱۰۹

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے آپس میں تفرقہ ڈال لیا اور واضح دلائل آجانے کے بعد اختلافات میں پڑ گئے۔ ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہے۔

ایک اختلاف جہالت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور علم آجانے کے بعد وہ رفع ہو جاتا ہے لیکن جس اختلاف کا اس آیت کریمہ میں ذکر کیا گیا ہے وہ جہالت کے اختلاف سے کہیں سخت ہے یعنی باوجود حقیقت معلوم ہو جانے کے پھر بھی اختلاف باقی رکھا جائے۔ اس کو قرآن کریم نے دوسری جگہ بَغْيًا بَيْنَهُمْ قرار دیا ہے یعنی محض باہمی ضد کی بنا پر اختلاف۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے پارٹی بازی (جماعت بندی) کی ابتدا ہوتی ہے۔ خدا اور رسول۔ عدل و انصاف، علم و عقل کسی چیز سے واسطہ نہیں رہتا۔ جائز وہ جو پارٹی کے مفاد میں ہو۔ اور ناجائز وہ جو اس سے برعکس ہو۔ نہ کسی کی عزت کا خیال۔ نہ آبرو سے واسطہ کچھ کرنا پڑے کچھ کہنا پڑے۔ پارٹی کی ناک رہ جائے۔ قرآن کریم نے غیر مسلم اہل کتاب کے خلاف یہ الزام عاید کیا تھا کہ وہ غیر اہل کتاب کا مال بے دریغ کھا جاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس میں کچھ حرج نہیں لیکن یہاں پارٹی بازی میں آکر خود مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ فریق مخالف (جس کا جرم یہ ہے کہ وہ ان کے خیالات سے متفق نہیں) کے جان، مال، رزق، ناموس، ہر چیز پر بے محابا ہاتھ ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جب اس مرد غازی کے مجاہدانہ کارنامے پارٹی کی مجلس میں بیان ہوتے ہیں تو ایک فلک بوس غلغلۂ تحسین و تبریک بلند ہوتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن۔

آج کل تو پارٹیوں کے اختلاف کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا جاتا حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا

جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر سلام کا

اَوْرُدُّوْهَا۔ جواب دو یا کم از کم اسی سلام کو لوٹا دو۔

۷۔ احسان جتانا۔

"مہینے بھر تک تمہیں روٹیاں کھلائیں اور اب شرم نہیں آتی کہ ذراسی بات پر کہہ رہے ہو کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف نہیں کہہ سکتا۔"

بات صاف ہے اور کسی مزید توضیح کی محتاج نہیں لیکن قرآن کریم کا حکم بھی کچھ کم واضح نہیں فرمایا جو لوگ خدا کی راہ میں مال صرف کرتے ہیں پھر خرچ کرکے احسان نہیں جتاتے اور نہ (اس سلوک کی وجہ سے) ایذارسانی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے ثواب کا اجر ان کے خدا کے پاس ہے ان پر کسی قسم کا خوف وحزن نہیں۔ ۲۶۲/۲۔ "اے ایمان والو اپنے صدقات کو احسان جتا کر یا ایذا پہنچا کر باطل وبرباد مت کرو" ۲۶۴/۲

(۸) انفاق ریا۔

محلہ میں ایک بیوہ کا جوان لڑکا، اس کی دنیا کا آخری سہارا سسکیاں لے کر مرگیا، اس نے ہزار منتیں کیں کہ ایک روپیہ دوا کے لیے بطور قرض ہی مل جائے لیکن نہ مل سکا۔ اور اس بدبخت کی دنیا اجڑ گئی لیکن صبح اخباروں میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی طرف سے کوئٹہ کے زلزلہ فنڈ کی جو فہرست شائع ہوئی تو اسی محلہ کے میونسپل کمشنر صاحب کا اسم گرامی سب سے پہلے درج تھا۔ اور ایک ہزار روپیہ اس کار خیر میں اس نام کے سامنے تحریر تھا۔ اے کاش اس کے سامنے قرآن کی یہ تعلیم ہوتی کہ۔

"جو شخص اپنا مال لوگوں کو دکھانے کی غرض سے صرف کرتا ہے اور خدا و آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر جس پر کچھ مٹی آگئی ہو۔ پھر اس پر زور کی بارش پڑجائے اور وہ اس کو بالکل صاف کردے۔ ایسے لوگوں کو ان کی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہیں لگے گی۔ اور اللہ قوم کفار کو ہدایت نہیں کرتا" ۲۶۴/۲

مسلمان کو تو یہ حکم دیکھ کر کانپ اٹھنا چاہیے۔ ریاکاری کے انفاق کے لیے فرمایا کہ یہ لوگ اللہ

وآخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

۹۔ مقروض پر سختی۔

"میں تو ابھی وصول کروں گا۔ ابھی خواہ تمہیں جیل بھجوانا پڑے"۔

"بھائی میں ایک ماہ سے بیمار پڑا ہوا ہوں۔ کام پر جا نہیں سکا۔ ذرا ہمت آجائے تو سب سے پہلے تمہارا قرضہ ادا کرونگا۔ میں مکرتا نہیں اطمینان رکھو۔ میری حالت پر رحم کرو"۔

"میں تو یہ بکواس سننے کو تیار ہی نہیں ہوں۔ یا روپیہ دو یا عدالت میں چلو"۔

یہ ان کی باتیں ہو رہی ہیں جن کے خدا کا حکم ہے کہ

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ اور اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اسے فراغت تک مہلت
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ دیدو۔ اور اگر معاف ہی کر دو تو اور زیادہ بہتر ہے اگر تم سمجھو

قرضہ کے باب میں ایک اور دلچسپ نظارہ پیش آیا کرتا ہے۔ عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ جب دو دوست باہمی دین کا معاملہ کرتے ہیں تو لکھت پڑھت کرنا گویا اپنی رفاقت و صداقت کے منافی سمجھتے ہیں۔ بعد میں جب قرضدار مکر جاتا ہے تو جگہ جگہ اسے بدنام کرتے پھرتے ہیں اور معاملہ عدالت تک پہنچتا ہے۔ اگر یہ تکلف کو برطرف رکھتے، اور خدا کے حکم پر عمل پیرا ہوتے تو یہ فضیحتا کیوں رہتا۔ فرمایا۔

اے ایمان والو جب ایک مدت معینہ تک ادھار کا معاملہ کرنے لگو تو لکھ لیا کرو۔

(باقی)

حقوق الزوجین

(۳)

خلع | شرع اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ کسی طرح نباہ نہیں کر سکتا اسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو اس سے خلع حاصل کرلے۔

اس باب میں احکام شریعت کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اخلاقی ہے اور دوسرا قانونی۔ اخلاقی پہلو تو یہ ہے کہ خواہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کو طلاق یا خلع کا اختیار صرف ایک آخری چارۂ کار کے طور پر استعمال کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ محض خواہشات کی تسکین کے لیے طلاق اور خلع کو کھیل بنا لیا جائے۔ چنانچہ احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات منقول ہیں کہ

اِنَّ اللہ لَا یُحِبُّ الذوّاقین والذّواقات۔ (اللہ مزے چکھنے والوں اور مزے چکھنے والیوں کو پسند نہیں کرتا)۔

لعن اللہ کل ذوّاق مطلاق (ہر طالب لذت بکثرت طلاق دینے والے پر اللہ نے لعنت کی ہے)۔

ایما امرأۃ اختلعت من زوجھا بغیر نشوز فعلیھا لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین (جس کسی عورت نے اپنے شوہر سے نشوز کے بغیر خلع لیا اس پر اللہ اور ملائکہ اور سب لوگوں کی لعنت)۔

المختلعات من المنافقات (خلع کو کھیل بنا لینے والی عورتیں منافق ہیں)۔

لیکن قانون جس کا کام اشخاص کے حقوق متعین کرنا ہے اس پہلو سے بحث نہیں کرتا۔ وہ جس طرح

مرد کو شوہر ہونے کی حیثیت سے طلاق کا حق دیتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی بیوی ہونے کی حیثیت سے خلع کا حق دیتا ہے تاکہ دونوں کے لیے بوقت ضرورت عقد نکاح سے آزادی حاصل کرنا ممکن ہو، اور کوئی فریق بھی ایسی حالت میں مبتلا نہ کر دیا جائے کہ دل میں نفرت ہے، مقاصد نکاح پورے نہیں ہوتے، رشتہ ازدواج ایک مصیبت بن گیا ہے، مگر جبراً ایک دوسرے کے ساتھ محض اس لیے بندھے ہوئے ہیں کہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ رہا یہ سوال کہ دونوں میں سے کوئی فریق اپنے حق کو بے جا طور پر استعمال کرے گا، تو اس بارے میں قانون جہاں تک ممکن اور معقول ہے، پابندیاں عائد کر دیتا ہے مگر حق کو بجا یا بیجا استعمال کرنے کا انحصار بڑی حد تک خود استعمال کرنے والے کے اختیار تمیزی، اور اس کی دیانت اور خدا ترسی پر ہے۔ اس کے اور خدا کے سوا کوئی بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ محض طالب لذت ہے یا فی الواقع اس حق کے استعمال کی جائز حاجت رکھتا ہے۔ قانون اس کا فطری حق اسے دینے کے بعد اس کو بیجا استعمال سے روکنے کے لیے صرف ضروری پابندیاں اس پر عائد کر سکتا ہے۔ چنانچہ طلاق کی بحث میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ مرد کو عورت سے علیٰحدگی اختیار کرنے کا حق دینے کے ساتھ اس پر متعدد قیود لگا دی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ جو مہر اس نے عورت کو دیا تھا اس کا نقصان گوارا کرے، زمانہ حیض میں طلاق نہ دے، تین طہروں میں ایک ایک طلاق دے۔ عورت کو زمانہ عدت میں اپنے ساتھ رکھے۔ اور جب تین طلاقیں دے چکے تو پھر وہ عورت تحلیل کے بغیر دوبارہ اس کے نکاح میں نہ آ سکے۔ اسی طرح عورت کو بھی خلع کا حق دینے کے ساتھ چند قیود عائد کر دی گئی ہیں جن کو قرآن مجید کی اس مختصر سی آیت میں تمام و کمال بیان کر دیا گیا ہے:

خلع کی شرائط

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ

تمہارے لیے جائز نہیں کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو، واپس لے لو الا یہ کہ میاں بیوی کو یہ خوف ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے تو ایسی صورت میں جب کہ تم کو خوف ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے

کچھ مضائقہ نہیں اگر عورت کچھ معاوضہ دے کر (عقدۂ نکاح سے آزادی حاصل کرلے)۔

اس آیت سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:۔

۱- خلع ایسی حالت میں ہونا چاہیے جبکہ حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو۔ فلاجناح علیہما کے الفاظ دلالت کرتے ہیں کہ اگرچہ خلع ایک بری چیز ہے جس طرح کہ طلاق بُرا ہے لیکن جب یہ خوف ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو خلع لینے میں کوئی بُرائی نہیں۔

۲- جب عورت عقدۂ نکاح سے آزاد ہونا چاہے تو وہ بھی اسی طرح مال کی قربانی گوارا کرے جس طرح مرد کو اپنی خواہش سے طلاق دینے کی صورت میں گوارا کرنی پڑتی ہے۔ مرد اگر خود طلاق دے تو وہ اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو اس نے عورت کو دیا تھا۔ اور اگر عورت جدائی کی خواہش کرے تو وہ اس مال کا ایک حصہ یا پورا مال واپس کرکے جدا ہوسکتی ہے جو اس نے شوہر سے لیا تھا۔

۳- افتداء (یعنی معاوضہ دے کر رہائی حاصل کرنے) کے لیے محض فدیہ دینے والی کی خواہش کافی نہیں، بلکہ اس معاملہ کا اتمام اس وقت ہوتا ہے جب کہ فدیہ لینے والا بھی راضی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ عورت محض ایک مقدار مال پیش کرکے آپ سے آپ علٰحدہ نہیں ہوسکتی، بلکہ علٰحدگی کے لیے ضروری ہے کہ جو مال وہ پیش کررہی ہے، اس کو شوہر قبول کرلے۔

۴- خلع کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ عورت اپنا پورا مہر یا اس کا ایک حصہ پیش کرکے علٰحدگی کا مطالبہ کرے اور مرد اس کو قبول کرکے طلاق دیدے۔ فلاجناح علیہما فیما افتدت بہ کے الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ خلع کا فعل تراضی طرفین سے مکمل ہوجاتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی تردید ہوتی ہے جو خلع کے لیے قضائے قاضی کو شرط قرار دیتے ہیں۔

۵- اگر عورت فدیہ پیش کرے اور مرد قبول نہ کرے تو اس صورت میں ان کی طرف رجوع کیا جائے گا جو خِفۡتُمۡ کے مخاطب ہیں، یعنی مسلمانوں کے اولی الامر، اور چونکہ اولی الامر کا اولین فرض حدود اللہ کی

حفاظت ہے، اس لیے ان پر لازم ہوگا کہ جب حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف متحقق ہو جائے تو عورت کو اس کا وہ حق دلوا دیں جو انہی حدود کے تحفظ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا کیا ہے۔

یہ مجمل احکام ہیں جن میں اس امر کی تصریح نہیں کہ "حدود اللہ کے ٹوٹ جانے کا خوف" کن صورتوں میں متحقق ہوگا؟ فدیہ کی مقدار متعین کرنے میں انصاف کیا ہے؟ اور اگر عورت افتدا پر آمادہ ہو لیکن مرد قبول نہ کرے تو ایسی صورت میں قاضی کو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ ان مسائل کی تفصیلات ہم کو خلع کے ان مقدمات کی رودادوں میں ملتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے سامنے پیش ہوئے تھے۔

صدر اول کے نظائر خلع کا سب سے زیادہ مشہور مقدمہ وہ ہے جس میں ثابت بن قیس سے ان کی بیویوں نے خلع حاصل کیا ہے۔ اس مقدمہ کی روداد کے مختلف ٹکڑے مختلف احادیث میں وارد ہوئے ہیں جن کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثابت سے ان کی دو بیویوں نے خلع حاصل کیا تھا۔ ایک بیوی جمیلہ بنت ابی بن سلول (عبداللہ ابن ابی کی بہن[1]) کا قصہ یہ ہے کہ انھیں ثابت کی صورت ناپسند تھی۔ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خلع کے لیے مرافعہ کیا، اور ان الفاظ میں اپنی شکایت بیان کی۔

یا رسول اللہ لا یجمع رأسی ورأسہ شیئ أبدا۔ انی رفعت جانب الخباء فرأیتہ اقبل فی عدۃ فاذا ہو اشدہم سوادًا واقصرہم قامۃ واقبحہم وجھًا۔ (ابن جریر)۔	یا رسول اللہ میرے اور اس کے سر کو کوئی چیز کبھی جمع نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنا گھونگٹ جو اٹھایا تو وہ سامنے سے چند آدمیوں کے ساتھ آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان میں سب سے زیادہ کالا اور سب سے زیادہ پست قد اور سب سے زیادہ بدشکل تھا۔
واللہ ما کرھت منہ دینًا ولا خلقًا الا انی کرھت دمامتہ (ابن جریر)	خدا کی قسم میں دین یا اخلاق کی کسی خرابی کے سبب سے اس کو ناپسند نہیں کرتی بلکہ مجھے اس کی بدصورتی ناپسند ہے

[1] بعض نے زینب بنت عبداللہ بن ابی کہا ہے مگر مشہور یہی ہے کہ ان کا نام جمیلہ تھا اور عبداللہ بن ابی کی بیٹی نہیں بلکہ بہن تھیں۔

واللہ لولا مخافۃ اللہ اذا دخل علی	خدا کی قسم اگر خوف خدا نہ ہوتا تو جب وہ میرے پاس آیا تھا
لبصقت فی وجہہ (ابن ماجہ)	اس وقت میں اس کے منہ پر تھوک دیتی۔
یارسول اللہ بی من الجمال ما تری و	یارسول اللہ میں جیسی خوبصورت ہوں آپ دیکھتے ہیں اور
ثابت رجل دمیم (عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری)	ثابت ایک بدصورت شخص ہے۔
وما اعتب علیہ فی خلق ولا دین ولکنی	میں اس کے دین اور اخلاق پر کوئی حرف نہیں رکھتی مگر مجھے
اکرہ الکفر فی الاسلام[1] (بخاری)	اسلام میں کفر کا خوف ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی اور فرمایا کہ اتردین علیہ حدیقتہ (التی اعطاک) جو باغ تجھ کو اس نے دیا تھا وہ تو واپس کردے گی؟ انہوں نے عرض کیا ہاں یارسول اللہ بلکہ وہ زیادہ چاہے تو زیادہ بھی دوں گی۔ حضور نے فرمایا اما الزیادۃ فلا ولکن حدیقتہ۔ زیادہ تو نہیں مگر تو اس کا باغ واپس کردے۔ پھر ثابت کو حکم دیا کہ اقبل الحدیقۃ وطلقھا تطلیقۃ۔ باغ قبول کرلے اور اس کو ایک طلاق دیدے۔

ثابت کی ایک اور بیوی حبیبہ بنت سہل الانصاریہ تھیں جن کا واقعہ امام مالک اور ابو داود نے اس طرح نقل کیا ہے کہ ایک روز صبح سویرے حضور کاشانۂ نبوی سے برآمد ہوئے تو حبیبہ کو کھڑا پایا۔ دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ لا انا ولا ثابت بن قیس (میری اور ثابت کی نہیں نبھ سکتی) جب ثابت حاضر ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ یہ حبیبہ بنت سہل ہے۔ اس نے بیان کیا جو کچھ اللہ نے چاہا کہ بیان کرے۔ حبیبہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جو کچھ ثابت نے مجھے دیا ہے وہ سب میرے پاس ہے حضور نے ثابت کو حکم دیا کہ وہ لے لے اور اس کو چھوڑ دے۔ بعض روایتوں میں خل سبیلھا کے الفاظ ہیں اور بعض میں فارقھا۔ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ابو داود اور ابن جریر نے حضرت عائشہ سے

[1] اسلام میں کفر کے خوف سے مراد یہ ہے کہ کراہت و نفرت کے باوجود اگر میں اس کے ساتھ رہی تو مجھے اندیشہ ہے کہیں ان احکام کی پابند نہ رہ سکوں گی جو شوہر کی اطاعت اور اس کی وفاداری اور عصمت و عفت کے تحفظ کے لئے خدا اور رسول نے دیئے ہیں۔

اس واقعہ کو اس طرح روایت کیا ہے کہ ثابت نے حبیبہ کو اتنا مارا تھا کہ ان کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی حبیبہ نے آکر حضور سے شکایت کی آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ خذ بعض مالها وفارقها۔ اس کے مال کا ایک حصہ لے لے اور جدا ہو جا۔ مگر ابن ماجہ نے حبیبہ کے جو الفاظ نقل کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ کو ثابت کے خلاف جو شکایت تھی وہ مارپیٹ کی نہ تھی۔ بلکہ بدصورتی کی تھی چنانچہ انہوں نے یہی الفاظ کہے جو دوسری احادیث میں جمیلہ سے منقول ہیں یعنی اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں ثابت کے منہ پر تھوک دیتی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک عورت اور مرد کا مقدمہ پیش ہوا۔ آپ نے عورت کو نصیحت کی اور شوہر کے ساتھ رہنے کا مشورہ دیا۔ عورت نے قبول نہ کیا۔ اس پر آپ نے اُسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا جس میں کوڑا کرکٹ بھرا ہوا تھا۔ تین دن قید رکھنے کے بعد آپ نے اسے نکالا اور پوچھا کہ تیرا کیا حال رہا۔ اس نے کہا خدا کی قسم مجھ کو انہی تین راتوں میں راحت نصیب ہوئی ہے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے اس کے شوہر کو حکم دیا کہ اخلعها ويحك ولو من قرطها۔ اس کو خلع دیدے خواہ وہ اس کے کان کی بالیوں کے عوض ہی میں ہو (کنز العمال ج ۲)۔

ربیع بنت معوذ بن عفراء نے اپنے شوہر سے اپنی تمام املاک کے معاوضہ میں خلع حاصل کرنا چاہا شوہر نے نہ مانا۔ حضرت عثمان کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عثمان نے اس کو حکم دیا کہ اس کی چوٹی کا موباف تک لے لے اور اس کو خلع دیدے (فاجازہ وامرہ بالخذ عقاص راسها فمادونه۔ عبد الرزاق)۔

احکام خلع | ان روایات سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے :-

(۱) فان خفتم الا يقيما حدود الله کی تفسیر وہ شکایات ہیں جو ثابت بن قیس کی بیوی سے منقول ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں کی اس شکایت کو خلع کے لیے کافی سمجھا کہ ان کا شوہر بدصورت ہے اور وہ ان کو پسند نہیں۔ آپ نے ان کو خوبصورتی اور بدصورتی کے فلسفہ پر کوئی لکچر نہیں دیا۔ کیونکہ آپ کی

نظر شریعت کے مقاصد پر تھی۔ جب یہ امر محقق ہو گیا کہ ان عورتوں کے دل میں شوہر کی طرف سے نفرت و کراہیت بیٹھ چکی ہے تو آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمالیا، کیونکہ نفرت و کراہیت کے ساتھ ایک عورت اور مرد کو جبراً ایک دوسرے سے باندھ رکھنے کے نتائج، دین اور اخلاق اور تمدن کے لیے طلاق و خلع سے زیادہ خراب ہیں اور ان سے مقاصد شریعت فوت ہونے کا خوف ہے۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ خلع کا حکم نافذ کرنے کے لیے محض اس بات کا محقق ہو جانا کافی ہے کہ عورت اپنے شوہر کو ناپسند کرتی ہے اور اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے فعل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کی تحقیق کے لئے قاضی شرع کوئی مناسب تدبیر اختیار کر سکتا ہے تاکہ کسی شبہہ کی گنجائش نہ رہے اور بالیقین معلوم ہو جائے کہ ان زن و شوہر میں ابنباہ ہونا متوقع نہیں ہے۔

۳۔ حضرت عمرؓ کے فعل سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نفرت و کراہیت کے اسباب کا کھوج لگانا ضروری نہیں، اور یہ ایک معقول بات ہے۔ عورت کو اپنے شوہر سے بہت سے ایسے اسباب کی بنا پر نفرت ہو سکتی ہے جن کو کسی کے سامنے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے اسباب بھی نفرت کے ہو سکتے ہیں جن کو اگر بیان کیا جائے تو سننے والا نفرت کے لئے کافی نہ سمجھے گا، لیکن جس کو ان اسباب سے رات دن سابقہ پیش آتا ہے اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لیے وہ کافی ہوتے ہیں۔ لہٰذا قاضی کا کام صرف اس واقعہ کی تحقیق کرنا ہے کہ عورت کے دل میں شوہر سے نفرت پیدا ہو چکی ہے۔

۴۔ قاضی عورت کو وعظ و پند کرکے شوہر کے ساتھ رہنے کے لیے راضی کرنے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، مگر اس کی خواہش کے خلاف اسے مجبور نہیں کر سکتا، کیونکہ خلع اس کا حق ہے جو خدا نے اس کو دیا ہے، اور اگر وہ اس امر کا اندیشہ ظاہر کرتی ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ رہنے میں وہ حدود اللہ پر قائم نہ رہ سکے گی تو کسی کو اس سے یہ کہنے کا حق نہیں کہ تو چاہے حدود اللہ کو توڑ دے مگر اس خاص مرد کے

ساتھ بہرحال تجھ کو رہنا پڑے گا۔

۵۔ خلع کے مسئلہ میں دراصل یہ سوال قاضی شرع کے لیے تنقیح طلب ہی نہیں ہے کہ عورت آیا جائز ضرورت کی بنا پر طالب خلع ہے یا محض نفسانی خواہشات کے لیے علیحدگی چاہتی ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے قاضی کی حیثیت سے جب مقدمات خلع کی سماعت کی تو اس سوال کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ کیونکہ اول تو اس سوال کی کماحقہ تحقیق کرنا کسی قاضی کے بس کا کام نہیں۔ دوسرے خلع کا حق عورت کے لیے اُس حق کے مقابلہ میں ہے جو مرد کو طلاق کی صورت میں دیا گیا ہے۔ ذوّاقیت کا احتمال دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔ مگر مرد کے حق طلاق کو قانون میں اس قید کے ساتھ مقید نہیں کیا گیا ہے کہ وہ ذوّاقیت کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ پس جہاں تک قانونی حق کا تعلق ہے، عورت کے حق خلع کو بھی کسی اخلاقی قید سے مقید نہ ہونا چاہیے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کوئی طالب خلع عورت دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ یا وہ فی الحقیقت خلع کی جائز ضرورت رکھتی ہوگی یا محض ذوّاقہ ہوگی۔ اگر پہلی صورت ہے تو اس کے مطالبہ کو رد کرنا ظلم ہوگا۔ اور اگر دوسری صورت ہے تو اس کو خلع نہ دلوانے سے شریعت کے اہم مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ جو عورت طبعاً ذوّاقہ ہے وہ تو اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے رہے گی۔ اگر آپ اس کو جائز طریقے سے ایسا نہ کرنے دیں گے تو وہ ناجائز طریقوں سے اپنی فطرت کے داعیات کو پورا کرے گی اور یہ زیادہ برا ہوگا۔ ایک عورت کا پچاس شوہروں کو یکے بعد دیگرے بدلنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ کسی شخص کے قید نکاح میں رہتے ہوئے ایک مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے۔

۶۔ اگر عورت خلع مانگے اور شوہر اس پر راضی نہ ہو تو قاضی اس کو حکم دے گا کہ اسے چھوڑ دے۔ تمام روایات میں یہی آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے ایسی صورتوں میں مال قبول کر کے عورت کو چھوڑ دینے کا حکم دیا ہے۔ اور قاضی کا حکم بہرحال یہی معنے رکھتا ہے کہ محکوم علیہ اس کے امتثال کا پابند ہے، حتیٰ کہ اگر وہ امتثال نہ کرے تو قاضی اس کو حبس کر سکتا ہے۔ شریعت میں قاضی

کی حیثیت صرف ایک مشیر کی نہیں ہے کہ اس کا حکم محض مشورہ کے درجہ میں ہو اور محکوم علیہ کو اس کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار ہو۔

۷۔ خلع کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح کے مطابق ایک طلاق بائن کا ہے یعنی اس کے بعد زمانہ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا کیونکہ حق رجوع باقی رہنے سے خلع کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے نیز چونکہ عورت نے جو مال اس کو دیا ہے وہ عقدۂ نکاح سے اپنی رہائی کے معاوضہ میں دیا ہے اس لیے اگر شوہر معاوضہ لے لے اور اس کو رہائی نہ دے تو یہ فریب اور دغا ہوگی جس کو شریعت جائز نہیں رکھ سکتی۔ ہاں اگر عورت دوبارہ اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو کر سکتی ہے کیونکہ یہ طلاق حسن ہے جس کے بعد دوبارہ نکاح کرنے کے لیے تحلیل شرط نہیں ہے۔

۸۔ خلع کے معاوضہ کی تعیین میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں لگائی ہے۔ جتنے معاوضہ پر بھی زوجین راضی ہو جائیں اس پر خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہ فرمایا کہ شوہر خلع کے معاوضہ میں اپنے دیے ہوئے مہر سے زیادہ مال لے آپ کا ارشاد ہے لایاخذ الرجل من المختلعۃ اکثر مما اعطاھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی بالفاظ صریح اس کو مکروہ فرمایا ہے۔ ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے بلکہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی وجہ سے خلع کا مطالبہ کرے تو شوہر کے لیے سرے سے مال ہی لینا مکروہ ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے وان کان النشوز من قبلہ یکرہ لہ ان یاخذ منھا عوضاً۔ اس باب میں اصول شرع کے ماتحت یہ ضابطہ بنایا جا سکتا ہے کہ اگر خلع مانگنے والی عورت اپنے شوہر کا نشوز ثابت کر دے، یا خلع کے لیے ایسے وجوہ ظاہر کرے جو قاضی کے نزدیک معقول ہوں تو اس کو مہر کے ایک قلیل جز یا نصف کی واپسی پر خلع دلایا جائے اور اگر وہ نہ شوہر کا نشوز ثابت کرے نہ کوئی معقول وجہ ظاہر کرے تو اس کے لیے پورا مہر یا اس کا ایک بڑا حصہ واپس کرنا ضروری قرار دیا جائے۔ اگر اس کے رویے میں قاضی کو زودرنجی کے آثار نظر آئیں تو قاضی سزا کے طور پر اس کو مہر سے بھی کچھ

زیادہ دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔

مسئلہ خلع میں ایک بنیادی غلطی | خلع کی اس بحث سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ قانون اسلامی میں عورت اور مرد کے حقوق کے درمیان کس قدر صحیح توازن قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ ہماری اپنی غلطی ہے کہ ہم نے اپنی عورتوں سے خلع کے حق کو عملاً سلب کر لیا، اور اصول شرع کے خلاف، عقدۂ نکاح کو کلیۃً مردوں کی خواہش پر منحصر ٹھیرا دیا۔ اس سے عورتوں کی جو حق تلفیاں ہوئیں اور ہو رہی ہیں ان کی ذمہ داری خدا اور رسول کے قانون پر قطعاً نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اس قانون کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر اب بھی عورتوں کے اس حق کا استقرار ہو جائے تو وہ بہت سی گتھیاں سلجھ جائیں گی جو ہمارے ازدواجی معاملات میں پیدا ہوگئی ہیں، بلکہ گتھیوں کا پیدا ہونا ہی بند ہو جائے گا۔

عورت سے خلع کے حق کو جس چیز نے عملاً بالکل سلب کر لیا ہے وہ یہ غلط خیال ہے کہ شارع نے خلع کا معاملہ کلیۃً زن و شوہر کے درمیان رکھا ہے اور اس میں مداخلت کرنا قاضی کے حدود اختیار سے باہر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خلع دینا یا نہ دینا بالکل مرد کی مرضی پر موقوف ہوگیا ہے۔ اگر عورت خلع حاصل کرنا چاہے اور مرد اپنی شرارت یا خود غرضی سے نہ دینا چاہے تو عورت کے لیے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ لیکن یہ بات شارع کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ شارع کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ معاملۂ نکاح کے ایک فریق کو بالکل بے بس کر کے دوسرے فریق کے ہاتھ میں دیدے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ بلند اخلاقی و تمدنی مقاصد فوت ہو جاتے جو اس نے مناکحت کے ساتھ وابستہ کیے ہیں۔ جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے اسلامی شریعت میں قانون ازدواج کی بنا ہی اس اصل پر رکھی گئی ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق جب تک پاکیزگی اخلاق اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہ سکتا ہو اس کا استحکام مستحسن اور ضروری ہے اور اس کو توڑنا یا توڑ دینے کی کوشش کرنا سخت نامحمود ہے۔ اور جب یہ تعلق دونوں کے لیے یا دونوں میں سے کسی ایک

کے لیے اخلاق کی خرابی کا سبب بن جائے، یا اس میں مودت و رحمت کی جگہ نفرت و کراہیت داخل ہو جائے تو پھر اس کا توڑ دینا ضروری ہے، اور اس کا باقی رہنا اغراض شریعت کے خلاف ہے۔ اس اصل کے تحت شریعت نے معاملہ نکاح کے دونوں فریقوں کو ایک ایک قانونی آلہ ایسا دیا ہے جس سے وہ عقدہ نکاح کے ناقابل برداشت ہو جانے کی صورت میں حل عقد کا کام لے سکتے ہیں۔ مرد کے قانونی آلہ کا نام طلاق ہے جس کے استعمال میں اسے آزادانہ اختیار دیا گیا ہے۔ اور اس کے بالمقابل عورت کے قانونی آلہ کا نام خلع ہے جس کے استعمال کی صورت یہ رکھی گئی ہے کہ جب وہ عقدۂ نکاح کو توڑنا چاہے تو پہلے مرد سے اس کا مطالبہ کرے، اور اگر مرد اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کردے تو پھر قاضی سے مدد لے۔ زوجین کے حقوق میں توازن اسی طرح قائم رہ سکتا تھا، اور خدا و رسول نے درحقیقت یہی توازن قائم کیا تھا۔ مگر قاضی کے اختیار سماعت کو درمیان سے خارج کرکے یہ توازن بگاڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس طرح وہ قانونی آلہ جو عورت کو دیا گیا تھا قطعاً بے کار ہو گیا، اور عملاً قانون کی صورت بگڑ کر یہ ہو گئی کہ مرد کو ازدواجی تعلق میں حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو یا یہ تعلق اس کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قطع کر سکتا ہے، لیکن اگر یہی خوف عورت کو ہو یا ازدواجی تعلق اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جائے تو اس کے پاس اس تعلق کو قطع کرانے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ تاوقتیکہ مرد ہی اس کو آزاد نہ کرے وہ مجبور ہے کہ بہرحال اس تعلق میں بندھی رہے، خواہ حدود اللہ پر قائم رہنا اس کے لیے محال ہی کیوں نہ ہو جائے۔ اور مناکحت کے شرعی مقاصد بالکل ہی کیوں نہ فوت ہو جائیں۔ کیا کسی میں اتنی جرأت ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت پر اتنی کھلی ہوئی بے انصافی کا الزام عائد کر سکے؟

مسئلہ خلع میں قاضی کے اختیارات | قرآن مجید کی جس آیت میں خلع کا قانون بیان کیا گیا ہے اس کو پھر پڑھیے:-

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا اگر تم کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود پر قائم نہ رہ سکیں گے

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۔ تو ان دونوں پر اس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ وہ (یعنی عورت کچھ فدیہ دے کر (علیحدگی حاصل کرلے)۔

اس آیت میں زوجین کا ذکر تو غائب کے صیغوں سے کیا گیا ہے، لہذا لفظ خفتم کے مخاطب وہ نہیں ہوسکتے۔ اب لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں اور حکم الٰہی کا منشا یہ ہے کہ اگر خلع پر زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو اولی الامر کی طرف رجوع کیا جائے۔ اس کی تصدیق ان احادیث سے ہوتی ہے جو ہم اوپر نقل کرچکے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے پاس خلع کے دعوے لے کر عورتوں کا آنا اور آپ کا ان کی سماعت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ جب زوجین میں تراضی حاصل نہ ہو تو عورت کو قاضی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب اگر فی الواقع قاضی کا فیصلہ اس معاملہ میں بے اثر ہو، اور مرد کے راضی نہ ہونے کی صورت میں قاضی اس سے اپنا فیصلہ منوانے کا اقتدار نہ رکھتا ہو تو قاضی کو مرجع قرار دینا سرے سے فضول ہی ہوگا، کیونکہ اس کے پاس جانے کا نتیجہ بھی وہی ہے جو نہ جانے کا ہے۔ لیکن کیا احادیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قاضی اس معاملہ میں بے اختیار ہے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جتنے فیصلے اوپر منقول ہوئے ہیں ان میں یا تو صیغۂ امر آیا ہے جیسے طَلِّقْهَا اور فارقها اور خلّ سبیلها۔ یا یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے مرد کو حکم دیا کہ ایسا کرے۔ ابن جریر نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ تو یہ ہیں کہ فَفَرَّقَ بَيْنَهُمَا (پھر آپ نے ان کو جدا کردیا) اور یہی الفاظ اس روایت میں بھی ہیں جو خود جمیلہ بنت ابی بن سلول سے منقول ہے۔ اس کے بعد یہ شبہہ کرنے کی کوئی گنجایش نہیں رہتی کہ قاضی خلع کے معاملہ میں حکم دینے کا مجاز نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اگر شوہر اس حکم کو محض مشورہ سمجھ کر ماننے سے انکار کردے تو کیا قاضی اس سے جبراً اپنا حکم منوا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عہد میں ایسی تو کوئی مثال ہم کو نہیں ملتی کہ آپ نے کوئی فیصلہ صادر کیا ہو اور کسی نے اس سے

سرتابی کی جرأت کی ہو لیکن سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے اس فیصلہ پر ہم قیاس کر سکتے ہیں جس میں آپ نے ایک جھگڑالو شوہر سے فرمایا تھا کہ لَتُمْسَکَنَّ بیا رجع حتّٰی ترضٰی بمثل ما رضیت بہٖ یعنی تجھے نہ چھوڑا جائے گا جب تک تو بھی اسی طرح حکمین کا فیصلہ قبول کرنے پر راضی نہ ہو جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔ اگر قاضی ایک شوہر کو حکمین کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کرنے سے انکار کرنے پر حراست میں رکھ سکتا ہے تو وہ خود اپنا فیصلہ منوانے کے لیے تو بدرجہ اولیٰ قوت استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دنیا کے تمام معاملات میں سے صرف خلع ہی کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہو جسے قاضی کے اس حق سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ فقہ کی کتابوں میں متعدد جزئیات ایسے ملتے ہیں جن میں قاضی کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر شوہر اس کے حکم سے طلاق نہ دے تو قاضی خود تفریق کرا دے۔ پھر کیوں نہ خلع کے مسئلہ میں بھی قاضی کو یہ اختیار حاصل ہو؟

آگے چل کر جو مباحث بیان ہوں گے ان سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے گی کہ عنین اور مجبوب اور خصی اور جذامی، مبروص اور مجنون شوہروں کے مسئلہ میں فقہائے کرام نے جو ضوابط بیان کئے ہیں، اور اسی طرح خیار بلوغ اور بعض دوسرے مسائل میں جو اجتہادی قوانین مقرر کیے گئے ہیں ان کی موجودگی میں تو نہایت ضروری ہو گیا ہے کہ عورتوں کو خلع دلانے کے پورے اختیارات عدالتوں کو حاصل ہوں، ورنہ جو عورتیں ایسے حالات میں گرفتار ہو جائیں ان کے لیے بجز اس کے اور کوئی صورت ہی نہیں کہ یا تو وہ تمام عمر مصیبت کی زندگی بسر کریں، یا اپنے داعیات نفس سے مجبور ہو کر فواحش میں مبتلا ہو جائیں، یا مجبوراً مرتد ہو کر قید نکاح سے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ توضیح مدعا کے لیے ہم یہاں ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

عنین کے معاملہ میں فقہی مسئلہ یہ ہے کہ اس کو ایک سال تک علاج کی مہلت دی جائے گی اگر علاج کے بعد وہ ایک مرتبہ بھی ہمبستری پر قادر ہو گیا حتیٰ کہ اگر ایک مرتبہ اس نے ادھوری مباشرت

بھی کرلی تو عورت کو فسخ نکاح کا حق نہیں بلکہ یہ حق ہمیشہ کے لیے باطل ہو گیا۔ اگر عورت کو نکاح سے پہلے یہ معلوم تھا کہ وہ عنین ہے تو اس کو سرے سے قاضی کے پاس دعویٰ لے جانے کا حق ہی نہیں[۲]۔ اگر اس نے نکاح کے بعد ایک مرتبہ مباشرت کی اور پھر عنین ہو گیا تب بھی عورت کو دعوے کا حق نہیں[۳]۔ اگر عورت نے شوہر کے عنین ہونے کا علم حاصل ہونے کے بعد اس کے ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تب بھی وہ ہمیشہ کے لیے خیار فسخ سے محروم ہو گئی[۴]۔ ان صورتوں میں عورت کا خیار فسخ تو یوں باطل ہو گیا اس کے بعد ایسے ناکارہ شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دوسری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ وہ خلع حاصل کرے۔ مگر وہ اس کو مل نہیں سکتا کیونکہ شوہر سے مطالبہ کرتی ہے تو وہ اس کا پورا مہر بلکہ مہر سے کچھ زائد لیکر بھی چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا اور عدالت سے رجوع کرتی ہے تو وہ اس کو مجبور کر کے طلاق دلوانے یا تفریق کرنے سے انکار کر دیتی ہے اب غور کیجیے کہ اس غریب عورت کا حشر کیا ہوگا؟ بس یہی ناکہ یا تو وہ عیسائی راہبات کی طرح نفس کشی کی زندگی بسر کرے اور اپنے نفس پر روح فرسا تکلیفیں برداشت کرے یا قید نکاح میں رہ کر اخلاقی فواحش میں مبتلا ہو، یا پھر سرے سے دین اسلام ہی کو خیرباد کہہ دے۔ مگر کیا اسلامی قانون کا منشا بھی یہی ہے کہ کوئی عورت ان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو؟ کیا ایسے ازدواجی تعلق سے شریعت کے وہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں جن کے لیے قانون ازدواج بنایا گیا ہے؟ کیا ایسے زوجین میں مودت و رحمت ہوگی؟ کیا وہ باہم مل کر تمدن

---

[۱] فی رد المحتار عن المعراج اذا اولج الحشفة فقط فلیس بعنین وان کان مقطوعها فلابد من ایلاج بقیة الذکر

[۲] فی العالمکیریہ ان علمت المرأة وقت النکاح انه عنین لا یصل الی النساء لا یکون لها حق الخصومة

[۳]۔ فی الدر المختار فلو جبّ بعد وصوله الیها مرة او صار عنینا بعد الوصول لا یفرق لحصول حقها بالوطی مرة۔

[۴] قال الشامی قوله لم یبطل ای مالم تقل رضیت بالمقام معه۔

کی کو کوئی مفید خدمت کرسکیں گے؟ کیا ان کے گھر میں خوشی اور راحت کے فرشتے کبھی داخل ہوسکیں گے؟ کیا یہ قید نکاح کسی حیثیت سے بھی احصان کی تعریف میں آسکے گی، اور اس سے دین اور اخلاق اور عفت کا تحفظ ہوگا؟ اگر نہیں تو بتایا جائے کہ ایک بے گناہ عورت کی زندگی برباد ہونے یا مجبوراً اس کے فواحش میں مبتلا ہو جانے، یا دائرۂ دین سے نکل جانے کا وبال کس کے سر ہوگا؟ خدا اور رسول تو یقیناً بری الذمہ ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے قانون میں کوئی نقص نہیں چھوڑا ہے۔ (باقی)

"سچ" کے بجائے "صدق"

زیر ادارت جناب مولانا عبدالماجد دریابادی

یکم مئی ۱۹۳۵ء سے ۲۷×۱۷/۴ ۲۰ پونڈ سفید چکنے کاغذ پر ہر مہینہ کی یکم، گیارہ اور اکیس کو شایع ہوتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ وہ صاحب ذوق حضرات جو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے طرز انشاء کے عاشق ہیں اور آپ کے مخصوص دل نشین طرز صحافت کیلئے آپ کے اخبار سچ کے بند ہونیکے بعد سے بیتاب تھے اس مژدہ کو صحیح معنوں میں مژدہ سمجھیں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس اخبار "سچ" کے خریداروں کی مکمل فہرست موجود نہیں ہے اس وجہ سے فرداً فرداً خریداران سچ کو نمونہ نہ روانہ کرسکے لہذا شائقین حضرات اپنا اپنا چندہ قیمتی چار روپیہ جلد از جلد روانہ فرماکر خریداران کے رجسٹر میں اپنا نام درج کرالیں ورنہ بعد کو پچھلے پرچے دستیاب نہ ہونے پر پچھتانا پڑیگا۔

"صدق" ہر اعتبار سے "سچ" سے بڑھا ہوا ہے معنوی حیثیت سے مضامین قرآنی کا اضافہ

سالانہ چندہ للعہ

ترسیل زر بنام منیجر اخبار "صدق" ۴۲ ہیوٹ روڈ لکھنو

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

مصنفۂ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ
مترجمۂ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(۲)

نہر کوثر خانۂ کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانیت کی تصویر ہے

(۶) معراج میں جو نہر کوثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مشاہدہ کرائی گئی تھی، اس کی صفات پر جو شخص غور کرے گا، اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ نہر کوثر درحقیقت کعبہ اور اس کے ماحول کی روحانی تمثال ہے۔ اس کے متعلق مختلف طرق سے جو روایات مروی ہیں، ان کی مشترک حقیقت یہ ہے کہ کوثر ایک نہر ہے، اس کے کنارے پر مجوف موتیوں کے قبے ہیں، اس کی زمین یاقوت و مرجان اور زبرجد کی ہے، اس میں برتن ہیں جو آسمان کے تاروں کے مانند ہیں، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیریں، برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے اور اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس پر چڑیاں اترتی ہیں، جن کی گردنیں قربانی کے جانوروں کی طرح ہیں، ایک شخص نے کہا تب تو وہ بہت ہی خوش قسمت ہوں گی۔ آپ نے فرمایا:۔ ان کے کھانے والے ان سے زیادہ خوش قسمت ہوں گے، اس کے پانی کی آواز ایسی محسوس ہوگی جیسے تم اپنے دونوں کانوں میں انگلی ڈالے ہوئے ہو،

یہ تفصیلات ہم نے روایات جمع کر کے یکجا کی ہیں۔ بخاری میں یہ الفاظ ہیں۔

بینا انا اسیر فی الجنۃ اذا انا بنھر حافتاہ قباب الدر المجوف فقلت ما ھذا یا جبریل

میں جنت میں چل رہا تھا کہ ناگہاں ایک نہر پر گذر ہوا اس کے دونوں کناروں پر مجوف موتیوں کے قبے تھے

قَالَ ھٰذا الکوثر الذی اعطاك ربكَ	میں نے جبریل سے پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب
قال فضرب الملك بیدہٖ فاذا طینہ مسك	دیا یہ وہ کوثر ہے جو آپ کو آپ کے رب نے بخشا ہے مزید
اذ فر۔	پھر فرشتہ نے زمین پر ہاتھ مارا تو اس کی مٹی نہایت
	خوشبو دار مشک تھی۔

اب ایک لمحہ توقف کرکے کعبہ اور اس کے طول کے مشاہدات پر غور کرو۔ جب تمام اکناف عالم سے موحدین کے قافلے عشق و محبت الہٰی کی پیاس بجھانے کے لیے اس چشمۂ خیر و برکت کے پاس اکٹھے ہوتے ہیں تو کیا اُن کے احساس روحانی میں اس مقدس وادی کے سنگریزے یاقوت و زمرد سے زیادہ پُرگل اس کی مٹی مشک سے زیادہ خوشبودار، اور اس کے ارد گرد حجاج کے خیمے، مجوف موتیوں کے قبوں سے زیادہ حسین و خوبصورت نہیں ہیں؟ ایک قدم آگے بڑھ کر پھر غور کرو! حجاج اور ان کے ساتھ قربانی کے اونٹوں کی قطاروں میں تم کو کس حقیقت کا جلوہ نظر آتا ہے؟ کیا یہ ایک چشمہ کے کنارے لمبی گردن والی چڑیوں کا جھنڈ نہیں ہے؟ پھر ان کی خوش بختی اور فیروزمندی پر غور کرو۔ یہ اشرف المخلوقات انسان کی قائم مقام بن کر خدا کے سامنے قربان ہوں گی۔ گویا وہ بمنزلہ انسان ہیں، ان سے بڑھ کر خوش بخت اور فیروز مند کون ہو سکتا ہے۔ پھر ان کے خوش قسمت کھانے والوں کو دیکھو۔ یہ کون ہیں؟ اللہ کے مہمان! کیا اللہ کے مہمانوں سے بھی بڑھ کر کسی کا طالع اچھا ہے؟ ایک نکتہ نحو اس تشبیہ کے محاسن پر بھی ڈالو۔ حوض پر آنے والی چڑیوں کو قربانی کے اونٹوں سے تشبیہ دیکر اور ان کے کھانے والوں کا ذکر کرکے اشارہ کر دیا کہ چڑیوں سے مقصود یہی قربانی کے اونٹ ہیں، پھر اشارہ کتنا لطیف ہے۔ چڑیوں کی گردن کو قربانی کے اونٹوں کی گردن سے تشبیہ دی کہ اس جزء سے پورے کل پر روشنی پڑ جائے۔ نیز دیکھو! "بدن" کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ "جزور" کا لفظ استعمال کیا جس کی عمومیت میں ابہام ہے۔ تم پوچھ سکتے ہو کہ اتنی رازداری اور اس قدر اشارات و کنایات کی کیا ضرورت تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تاکہ عقل سلیم اس سے حظ

کا استنباط کرے۔ اللہ تعالیٰ جب قرآن میں دلائل حکمت کی تفصیل کرتا ہے تو آخر میں عموماً یہ آیت آتی ہے
اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ اس میں غور کرنے والوں کے لئے بہت سی دلیلیں ہیں
کہیں کہیں "یعلمون" اور "یتفکرون" کے الفاظ بھی آتے ہیں، جس طرح قرآن مجید میں سراپا دعوت فکر و
نظر ہے، اسی طرح اس کا حامل بھی بہترین معلّم تھا، وہ عقل انسانی کی تربیت کرتا تھا اور اس کو اکتساب
حکمت کے لائق بناتا تھا۔ اس تربیت عقل کے لئے آپ بسا اوقات صحابہ سے بعض امور کی باہمی مخفی نسبتوں
کے متعلق سوالات کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ آپ نے پوچھا درختوں میں مومن سے اشبہ کون درخت ہے؟
عیسیٰ علیہ السلام امثال میں گفتگو فرماتے تھے، لوگوں نے سوال کیا کہ آپ کھول کر بات کیوں نہیں کہتے انھوں
جواب دیا "تاکہ عقلاء ہی سمجھیں"۔ بعینہ یہی حقیقت قرآن پاک کی اس آیت میں ہے۔

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ۔ یہ مثلیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن اس کو وہی سمجھیں گے جو اہل علم ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اشارات کو تعلیم و تربیت میں مخصوص اہمیت حاصل ہے۔

یروشلم کی روحانیت | ہم نے گذشتہ فصل میں خانہ کعبہ کی روحانیت کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، مکاشفات
یوحنا باب ۲۱ میں اسی کے مشابہ یروشلم کی روحانیت بیان کی گئی ہے۔

"اور وہ مجھے روح میں ایک بڑے اور اونچے پہاڑ پر لے گیا۔ اور شہر مقدس یروشلم کو
خدا کے پاس سے اترتے دکھایا۔ اس میں خدا کا جلال تھا۔ اور اس کی چمک نہایت قیمتی پتھر
یعنی اس یشب کی سی تھی جو بلور کی طرح شفاف ہو (اس کے بعد اس کی شہر پناہ، اما فت،
دروازوں اور اس کے رہنے د۔ لوں یعنی خاندان اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے تذکرہ کے
بعد کہا) اور اس کی شہر پناہ کی تعمیر یشب کی تھی، اور شہر ایسے خالص سونے کا تھا جو شفاف
شیشے کے مانند ہو، اور اس شہر کی شہر پناہ کی بنیادیں ہر طرح کے جواہر سے آراستہ تھیں پہلی

بنیاد یشب کی تھی، دوسری نیلم کی، تیسری شب چراغ کی، چوتھی زمرد کی، پانچویں عقیق کی، چھٹی لعل کی، ساتویں سنہرے پتھر کی، آٹھویں فیروزے کی، نویں زبرجد کی، دسویں یمنی کی، گیارہویں سنگ سنبلی کی، اور بارہویں یاقوت کی۔ اور بارہ دروازے بارہ موتیوں کے تھے، ہر دروازہ ایک ایک موتی کا تھا، اور شہر کی سڑک شفاف شیشے کے مانند خالص سونے کی تھی۔" اس کے بعد کہا ہے کہ اس میں کوئی مقدس نہیں ہے اور اس میں صرف ایک خدا کی عبادت ہوگی۔

ممکن ہے کہ نقل و روایت میں کچھ کمی بیشی کر دی گئی ہو۔ ہمارا مقصد اس سے صرف یہ دکھانا ہے کہ دنیا میں جو اعیان و اعراض ہیں، ان کی روحانی مثال کا خیال ایک معلوم و مشہور حقیقت ہے۔ یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں صرف ان صفات کا تذکرہ کیا ہے جو قوت باصرہ کی گرفت میں آتی ہیں لیکن کعبہ کی جو روحانیت بیان ہوئی ہے اس میں ہر حاسہ کے لیے حلاوت ہے، یہاں تک کہ پانی کی روانی کی آواز کا بھی ذکر ہے، اور ایک پیاسے کے لیے، دورسے پانی کی روانی کے نغمہ سے زیادہ شیریں اور جانفزا نغمہ کیا ہو سکتا ہے۔ پھر جو دیدار الٰہی کی پیاس سے تڑپ رہے ہیں، ان کے لیے شیریں اور ٹھنڈے پانی کی سیرابی اگر نہیں ہے تو کیا ہے؟ حضرت مسیح نے ایسوں ہی کے بارہ میں فرمایا ہے:-

"مبارک ہیں وہ، جو بھوکے اور پیاسے ہیں کیونکہ وہی آسودہ ہوں گے"۔

انا اعطیناک الکوثر کی تفسیر (۸) لفظ کوثر کا ٹھیک مطلب معلوم ہو جانے کے بعد پہلی آیت کی تفسیر صاف ہو گئی۔ یعنی پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے برکت اور کثرت امت کی جو گرانمایہ دولت مقدر تھی، اس آیت میں اسی کا پیام بشارت ہے۔ جب اس وعدہ کی تکمیل کا وقت قریب آگیا، اس کی خبر دیدی گئی کہ آنحضرت صلعم اور مسلمانوں کے لیے اسلام کے غلبے اور فتح مکہ کی خوشخبری ہو۔ یعنی سادہ لفظوں میں گویا یوں کہا گیا: اللہ تعالیٰ نے تم کو نماز پڑھنے والی اور راہ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان امت دی ہے جو بیت اللہ الحرام کا حج کرے گی۔ چنانچہ سورۂ حج میں ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ، وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ	یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کو بیت اللہ کے پاس آباد کیا اور یہ ہدایت کی کہ میرا کسی کو ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور میری عبادت میں کھڑے ہونے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں (یعنی نماز پڑھنے والوں) کے لیے پاک رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، وہ تمہارے پاس پیادہ اور لاغر اونٹوں

پر گہرے راستوں سے آئیں۔ (یعنی خانۂ کعبہ کی زیارت کے لیے قریب سے پیادہ آئیں اور دور دراز گوشوں سے سدھائے ہوئے لاغر اونٹوں پر۔ اور مکہ میں ہر راہ سے داخل ہوں، یہاں تک کہ آمدوشد کی کثرت سے راستے گہرے ہو جائیں) تاکہ اپنے منافع کی جگہ پر آئیں (یعنی یہ شہر ان کا مرکز بنے گا، وہ اس کی تجارت سے منفعت حاصل کریں گے، اور اس میں ان کا باہمی اختلاط ان کے اجتماعی رشتوں اور رحمی تعلقات کے استحکام کا ذریعہ ہوگا۔ چنانچہ عرفات کے اجتماع میں خطیب ان کو صلح اور صلہ رحم کی دعوت دیتا تھا۔ اور اسی وجہ سے عرب مکہ کو صلاح اور ام الرحم بھی کہتے تھے۔ اس سے زیادہ معاشی اور اجتماعی فوائد اور کیا ہو سکتے ہیں؟) ....

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ (حج۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸)	اور چند متعین دنوں میں، ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو روزی کیے ہیں اللہ کا نام لیں (یہ وہی منفعت ہے۔ عربوں نے باوجود شرک کے خدا کو نہیں چھوڑا تھا۔ البتہ اس کے دربار کے لیے شفعاء

ٹھیرا لیے تھے) پس اس سے کھاؤ اور تنگ حال فقیر کو کھلاؤ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بیت اللہ ایک عظیم الشان امت کے لیے، توحید، نماز، اور اطعام

فقراء کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور وہ امت دنیا کے تمام گوشوں سے اس کے حج کے لیے مجتمع ہو
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ اس عظیم الشان امت کے لیے ایک
مبعوث فرمائے۔ یہ دعا مستجاب ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی ذریت کی کثرت کا
فرمایا تھا۔ اور توریت میں ہے کہ کثرت ذریت کا وعدہ حضرت اسمٰعیل کی نسل میں خاص طور پر
ہوگا اہل کتاب کو اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ اور اوائل بعثت میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو ا
کی خوشخبری دیدی تھی چنانچہ سورۃ الضحیٰ میں ہے:۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ	جلد تیرا خدا اپنی بخشش سے تجھے خوش کر دے گا

یہی وعدہ جس کے قرب کا ذکر فرمایا تھا "انا اعطینا" کہکر پورا کر دیا۔ اب لفظ کوثر کو سامنے ر
"فترضیٰ" کی تفسیر پر غور کرو! رحمت عالم کو غایت رحمت کی وجہ سے لوگوں کی ہدایت وا
جو بے پایاں آرزو تھی، وہ ایک محدود امت کے ایمان و اسلام سے نہیں پوری ہوسکتی تھی،
اس طرح پوری ہوسکتی تھی کہ دنیا میں تو آپ کے متبعین کی کثرت ہو لیکن آخرت میں یہ نعمت چھ
اور حوض کوثر پر انکی تعداد تھوڑی رہ جائے "فترضیٰ" اور "الکوثر" کے الفاظ نے ان تمام شبہ
کا ازالہ کر دیا۔ چنانچہ بکثرت احادیث صحیحہ میں کثرت امت کا ذکر آیا ہے۔

مذکورہ تفصیلات کی روشنی میں پہلی آیت پر غور کرو! اس میں متعدد بشارتیں پنہاں
۱۔ مکہ عنقریب فتح ہوگا۔
۲۔ لوگوں کی کثیر تعداد آپ کی امت میں داخل ہوگی۔
۳۔ ان لوگوں کے زعم کے خلاف جو کہتے ہیں کہ اس امت کا بڑا حصہ مرتد ہو جائے
ایک بڑا طبقہ دین حق پر قائم رہے گا۔

ان کے علاوہ اور متعدد بشارتیں اس سورۃ میں پنہاں ہیں، جن کی تفصیل بعد میں آ

یہ پوری سورت بشارتوں کا مجموعہ ہے۔ وللہ الحمد۔

فصل لربک وانحر کی تفسیر اور ماقبل سے تعلق

۹۔ اس آیت سے چار اہم حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔

۱۔ نماز اور قربانی کو اس عطیہ سے کوئی خاص تعلق ہے، کیونکہ صیغہ امر پر ف داخل ہوتا ہے۔

۲۔ ان دونوں کو عام طور پر الگ الگ کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے، اور مخصوص ایام حج میں ایک ساتھ کرنے کا بھی۔

۳۔ نماز اور قربانی میں باہمدگر کوئی خاص تعلق ہے۔

۴۔ یہ عطیہ ہمارے لیے مخصوص ہے۔ نیز یہ کہ نماز اور قربانی دونوں ضروری ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر صرف ہم ہیں۔ مشرکین اور مبتدعین یہود و نصاریٰ اس شرف سے محروم ہیں، مشرکین اس لیے کہ ان کی نماز اور قربانی اللہ واحد کے لیے نہیں تھی۔ یہود اس لیے کہ انھوں نے صرف قربانی کو لے لیا، نماز غائب کر دی، نیز ان کی قربانی "نحر" نہ تھی۔ نحر کا لفظ اونٹ کی قربانی کے لیے مخصوص ہے اور اونٹ ان کے ہاں حرام تھا۔ نصاریٰ، اس لیے کہ ان کے ہاں قربانی سرے سے نہیں ہے، اور نماز ان کے خیال میں واجب نہیں ہے۔ یہ مجمل اشارات ہیں، ان کی تفصیل کی ضرورت ہے۔ ہم متعدد فصلوں میں ان اشارات کی شرح کریں گے۔ پہلی دو باتیں تو اس فصل میں بیان کر دیتے ہیں۔ باقی دو باتوں کی تفصیل آئندہ فصلوں میں آئے گی۔

اللہ تعالیٰ نے، آنحضرت صلعم کو اس عطیہ کی بشارت دینے کے بعد، دو باتوں کا حکم دیا: نماز اور قربانی۔ اور امر کے صیغہ پر تعقیب کی ف داخل کی، قواعد زبان کے اعتبار سے تعقیب کی ف سابق و لاحق یعنی عطیہ اور حکم کے درمیان نسبت اور تعلق کی دلیل ہے اس لئے ہم نے نظم کلام پر

غور کیا، اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے زلہا کے بعض پہلو معلوم ہوئے۔ ذیل میں بترتیب ان کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ اس حکم میں، اس بخشش کا اصلی مقصود پنہاں ہے، کیونکہ یہ بخشش بہت بڑے مقصد کے لیے تھی، چنانچہ فرمایا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (حج ۴)	جو اگر ہم ان کو زمین میں تمکن دیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے منکر سے روکیں گے،

ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرمایا گیا ہے۔

رَبَّنَا اِنِّیْ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَۃً مِّنَ النَّاسِ تَھْوِیْ اِلَیْھِمْ۔	اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس بن کھیتی کی زمین میں، تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے اے ہمارے پروردگار! اس لیے کہ یہ نماز قائم کریں پس تو یوں کر کہ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں۔ (یعنی لوگ ان کے پاس تیرے گھر کی زیارت کے لیے آئیں)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے قدیم وطن سے ہجرت کر کے ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں بسنا، محض اس لیے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو، جو لوگوں کی عقیدت و انابت، سعی و طواف اور نذر و نیاز کا قبلہ ہو، اور جس طرح غلام اپنے آقا کی دیوڑھی پر گوش برآواز سرگرم عمل رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لبیک لبیک۔ لاشریک لک لبیک کہتے ہوئے بڑھیں؛ اور اپنے امام کی زبان سے گھر والے کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہوں اسی لیے فرمایا :۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس گھر کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لیے ہوئی ہے اور خدا نے انہی مقاصد کی خدمت اور تکمیل کے لیے ان کو اس پر قبضہ دیا ہے، ان مقاصد کا لب لباب دو چیزیں ہیں۔ نماز اور قربانی۔ پس اس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں کا ذکر کر دیا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ عطیہ یوں ہی نہیں مل رہا ہے، بلکہ اس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں، جن کا اہتمام اصل مقصود ہے۔ یہ گویا بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مسلّم حق کا اظہار کیا گیا، کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی فرض کی ذمہ داری کے نہیں ملتا جب ہم کچھ لیتے ہیں تو لامحالہ ہم کو کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بھی آمادہ رہنا چاہیے۔ مندرجۂ ذیل آیات کی بنیاد اسی حقیقت پر ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ فِيمَا آتَاكُمْ۔ — تاکہ تم کو جو کچھ دیا ہے، اس میں آزمائے۔

اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ — اللہ نے جس طرح تم پر احسان فرمایا، اسی طرح تم دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ — اور اس کی کٹائی کے دن اس کا حق دو۔

۲۔ ربط کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس عطیہ کے ذکر کے بعد اس چیز کا ذکر کیا گیا جو اس کے بقا و قیام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لیے عام ہوا کیونکہ یہ نعمت بھی پیغمبر اور اس کی امت کے لیے عام تھی پیغمبر امت کا وکیل ہوتا ہے، اس لیے جو کچھ اس کو ملتا ہے اس میں امت بھی شریک ہوتی ہے اسی لیے آنحضرت صلعم نے فرمایا جیسا کہ گزر چکا ہے "میں تمہارے لیے حوض پر آگے جانے والا ہوں"۔ پس یہاں نماز اور قربانی کا حکم عام ہے۔ یہ بات سیاق کلام سے ظاہر ہے۔

جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی پابندی ہی اس نعمت کے بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ اسی حقیقت کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا — اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے وعدوں کو اس وقت

بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۱۱۔ رعد) تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنی ذمہ داریوں میں تبدیلی نہ کرے۔

یہاں جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے، ہم کو حج اور اس کے دوسرے آداب و مراسم کا حکم دیا گیا ہے، گویا یوں کہا گیا کہ "ہم نے تم کو کوثر بخشا" پس اس کے حقوق ادا کرو کہ یہ نعمت تمہارے ساتھ باقی رہنے والی ہے نماز اور حج کو الگ الگ لو یا دونوں کو ایک ساتھ، مراد اس سے حج ہی ہے۔ کیونکہ حدیث سے ثابت ہے کہ بیت اللہ کا مقصد نماز ہے اور اسی لیے اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے استطاعت کے باوجود اس گھر کا حج نہ کیا، اس نے اس کا مقصد پورا نہیں کیا۔ بعینہ یہی حال قربانی کا ہے۔ جس نے حج میں قربانی کی سعادت حاصل نہ کی، وہ حقیقی قربانی سے محروم رہا۔ جو شخص اپنے گھر پر قربانی کرتا ہے، وہ حجاج سے صرف ایک گونہ تشبیہ حاصل کرتا ہے، اور یہ قربانی کرکے گویا وہ ایک دن حقیقی قربانی کی سعادت کے حصول کی راہ تک رہا ہے۔ بہرحال! جو پہلو بھی اختیار کرو آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حج امت پر لازم ہے، اور جو شخص حج سے بے پروا ہوا، اس نے گویا اپنے کو امت کے حلقے سے الگ کر لیا۔ حج کی حقیقت پر غور کرنے کے بعد یہ بات بالکل غیر مشتبہ طور پر ہمارے سامنے آتی ہے قرآن مجید اور احادیث سے بھی یہی بات ثابت ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا۔ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ۔ آل عمران (۹۷)

اور لوگوں پر، اللہ کے لیے بیت اللہ کا حج کرنا ہے جس کو استطاعت ہو، اور جو کفر کرے گا، تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ حج سے بے پروا ہونے والا کافر ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ایسے شخص کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کے لیے تسلی ہے۔ گویا ان سے یوں کہا گیا

کہ کفار نے تم کو جوار بیت اللہ سے جلا وطن کیا اور نماز و قربانی سے روکا لیکن اب، جب کہ ہم نے تم کو کوثر بخشا، پورے فراغ خاطر اور ایک بڑی جماعت کے ساتھ اپنا حوصلہ پورا کرو"۔ اس سے ایک طرف نماز، حج، قربانی اور دوسرے اعمال صالحہ کے لیے اس بے تابی کا اظہار ہوتا ہے، جو آنحضرت صلعم اور آپ کے صحابہ کو بے چین کیے ہوئے تھی اور دوسری طرف اس میں بشارت، تسلی اور اظہار محبت کی نہایت جاں نواز ادائیں ہیں۔

۴- یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عائد ہو جاتی ہے، کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ گویا مشروط کیا ہے۔ اس لیے جب ہم نے خدا کا عطیہ قبول کر لیا تو اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کر لیا۔ اور جب تک اس عہد پر قائم رہیں گے، یہ عطیہ بھی ہمارے لیے باقی رہے گا۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے، جیسا آدم و حوا کے ساتھ ہوا تھا خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر چیز سے آزادانہ متمتع ہونے کی اجازت دی لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس پھٹکنے کی ممانعت کر دی۔ جب انھوں نے خدا کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کر لیا تو ان کے اوپر خدا کا یہ عہد بھی خود بخود واجب ہو گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو عہد سے تعبیر فرمایا:-

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا لیکن وہ بھول گیا، اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہ پائی

چنانچہ یہ عطیہ اسی وقت تک باقی رہا جب تک وہ دونوں اپنے عہد پر باقی رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا، تو اس نے ان کو پورا کیا، خدا نے کہا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا ابراہیم نے

پوچھا اور میری ذریت میں سے؟ خدا نے جواب دیا میرا یہ عہد ظالموں سے نہیں ہے۔

جب حضرت ابراہیم نے خدا کے فرمائے ہوئے حکموں کی تعمیل کر دی، خدا نے ان سے ایک عہد باندھا اور فرمایا کہ جب تک ان کی ذریت اس عہد پر قائم رہے گی خدا کا عہد بھی قائم رہیگا۔ اور جو اس کو توڑیں گے، وہ اس کی برکتوں سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

۵۔ پانچواں پہلو یہ ہے کہ یہ عہد توحید کا بیان ہے قرآن نے اس عہد کو پوری تشریح و وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس کے دلائل کی تفصیل کی ہے۔ ان دلائل کا عام عنوان یہ ہے کہ وہ پروردگار ہے، اسی نے اپنی نعمتوں سے ہم کو مالا مال کیا، اس نے ہم کو خلعت وجود سے آراستہ کیا، بہترین ساخت پر پیدا کیا، اور ہمارے لیے رزق طیب کا وسیع خوان کرم بچھایا اس لیے اسی کی عبادت اور اسی کی پرستش کرنی چاہیے لیکن یہاں ایک مخصوص عظیم الشان نعمت کا ذکر ہے اس لیے توحید کا مطالبہ بھی اسی مخصوص پہلو سے کیا گیا ہے یعنی رجحان کلام گویا یوں ہوگا کہ جب خدا ہی نے ہم کو اس گھر کی خدمت و پاسبانی کی عزت بخشی ہے تو نماز و قربانی بھی اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ اس میں ان مشرکین پر تعریض بھی ہوگی جو اس عہد کو فراموش کر کے غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ حقیقت "اِنَّآ" (بے شک ہم نے) اور "لِرَبِّكَ" (اپنے خداوند ہی کے لیے) کے الفاظ پر غور کرنے سے سامنے آتی ہے۔ یعنی ہم نے تم کو بخشا ہے اس لیے تمہارا فرض ہے کہ مشرکین کے برخلاف صرف ہماری نماز پڑھو اور ہمارے ہی لیے قربانی کرو۔ سورۃ حج میں یہ مضمون بار بار بیان ہوا ہے، اس لیے یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے بھی آیت کی تفسیر یونہی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"لوگ غیر اللہ کے لیے نماز پڑھتے تھے، اور غیر اللہ کے لیے قربانی کرتے تھے۔ جب ہم نے تم کو اے محمدؐ کوثر بخشا تو تمہاری نماز اور قربانی صرف ہمارے لیے ہونی چاہیے۔" (باقی)

حالات پر گہری نگاہ ڈال کر صحیح اجتہادی قوت سے کام لیتا، اور اصول اسلام کو ان حا
منطبق کر کے ایک ایسا سمویا ہوا نظام مرتب کر دیتا جس کی اساس کتاب و سنت پر ہوتی ا
رفتار زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے کی صلاحیت ہوتی۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکا
ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ نوجوان ترکوں پر کفر و فسق کے فتوے لگا رہے ہیں، مگر ان
کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علما اور مشائخ ہیں، انہی کے جمود نے ایک
جو پانچ سو برس سے اسلام کے لیے تن تنہا سینہ سپر تھی اسلامیت سے فرنگیت کی طرف ڈھکیل
اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب ڈھکیل
گے۔ دوسری طرف جدت پسند حضرات ہر اس وحی کو جو انقرہ سے نازل ہوتی ہے، مسلمانو
اس طرح پیش کر رہے ہیں گویا قرآن منسوخ ہو چکا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ختم ہو گئی
ہدایت ہے تو اتاترک کے اسوہ اور انقرہ سے اتری ہوئی وحی میں ہے۔ حالانکہ بیچارے ا
اس کے متبعین کا حال یہ ہے کہ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ

بھی ہوئی کہ مدیر نگار نے اصل شبہہ کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ اور یہ مبہم سی بات کہکر کہ "فی الحقیقت یہ قرآن کا انداز بیان ہے اور عربوں کے نمونہ خطابت میں بھی اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں" صاف دامن بچا کر نکل گئے۔ آیت کے جس مفہوم کو مدیر نگار نے غلط قرار دیا ہے، اگر واقعی وہ غلط ہے تو آخر اس آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور یہاں بظاہر الفاظ سے جو شبہہ پیدا ہوتا ہے اس کا حقیقی جواب کیا ہے؟ افسوس ہے کہ مدیر نگار نے اس کی طرف بالکل توجہ نہیں کی اور اس کے بجائے ایک غیر متعلق اور بالکل غیر ضروری بحث میں پڑ گئے کہ "بستی کو تباہ کرنے کا مفہوم، در و دیوار کی مسماری نہیں ہے بلکہ اہل قریہ کی تباہی مراد ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی بستی کے رہنے والے برباد ہو جائیں گے تو وہ بستی آپ اجاڑ نظر آئے گی" سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کونسی ایسی اہم بات تھی جس کو بیان کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی! یہ تو بالکل ظاہر بات ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ نگار کے پڑھنے والوں کو یہ سمجھانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی کہ "جب کسی بستی کے رہنے والے برباد ہو جائیں گے تو وہ بستی آپ اجاڑ نظر آئے گی" یہ تو معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھتا ہے بہر حال افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مدیر نگار کے تفصیلی جواب کے باوجود آیت کا کوئی مفہوم متعین نہ ہو سکا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے ناقص علم کے مطابق کچھ عرض کروں۔

اس آیت میں تو دراصل دو باتیں قابل بحث ہیں سب سے پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں اَمَرْنَا کے کیا معنے ہیں۔ اور مامور بہ کیا چیز ہے؟ مفسرین نے اگرچہ امرنا کے بہت سے معنے لکھے ہیں لیکن میرے خیال میں وہ تمام تر تکلفات ہیں۔ میرے نزدیک اس آیت میں بھی "امر" کا وہی مفہوم ہے جو عام طور سے اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے یعنی حکم دینا۔ بغیر کسی وجہ خاص کے کسی لفظ سے غیر معروف معنی مراد لینا، میرے نزدیک اصولاً غلط ہے کیونکہ میرا خیال ہے کہ حتی الوسع قرآن کے الفاظ سے وہی معانی مراد لینے چاہئیں جو معروف اور متداول ہیں، اب رہا یہ سوال کہ مامور بہ کیا چیز ہے؟ تو اکثر محققین تو یہی فرماتے ہیں کہ اللہ کا حکم، اطاعت اور نیکوکاری کا ہوگا نہ کہ فسق و فجور کا۔ لیکن علامہ زمخشری نے

نہایت شد و مد کے ساتھ یہ دعوی کیاہے کہ عربی اصول کے لحاظ سے یہاں فسق کو ماموریہ ماننا پڑیگا کیونکہ امرتہ فقام اگر کہا جائے تو فقام کے قرینہ سے امر بالقیام مراد ہوگا۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ففسقوا کے قرینہ سے امر بالفسق مراد ہوگا۔ لیکن واضح رہے کہ علامہ زمخشری نے جو کچھ کہا ہے اصل میں انھوں نے یہ سب کچھ مذکورہ بالا قاعدہ کی بے جا حمایت میں کہا ہے ورنہ خدا نخواستہ وہ اس بات کے قائل نہیں کہ اللہ فسق و فجور کا حکم دیتا ہے۔ ان کے نزدیک امرنا بالفسق گویا مجازاً کہا گیا ہے، اور مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ ان پر راحت اور آسائش کے دروازے کھول دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں، نہ یہ کہ واقعی ان کو فسق کا حکم دیتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ علامہ زمخشری کا یہ اصرار بالکل بیجا ہے۔ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ "اَمَرْتُہٗ فَعَصٰی" تو کیا کوئی عربی سے واقف، یہاں "عصٰی" کے قرینہ سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں امر بالعصیان مراد ہے؟ بعینہ یہی حال یہاں بھی ہے، علامہ زمخشری اس قسم کی مثالوں کا یہ جواب دیتے ہیں کہ چونکہ معصیت امر کے منافی ہے اس لیے اس مثال میں امر بالمعصیۃ مراد نہیں ہو سکتی لیکن بقول امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے اگر ایسا ہے تو "امرتہ ففسق" میں بھی فسق کا ماموربہ ہونا مناسب نہیں۔ کیونکہ فسق کے معنی امر کی خلاف ورزی کے ہیں۔ تو جس طرح معصیت، ماموربہا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح فسق بھی ماموربہ نہیں ہو سکتا اس سے معلوم ہوا کہ اس بارہ میں ان لوگوں کا خیال صحیح ہے جو "طاعت" کو ماموربہ قرار دیتے ہیں۔ بظاہر یہ بحث یہاں غیر متعلق معلوم ہوتی ہے لیکن یہ تفصیل محض دوسری بحث کی تمہید اور توضیح کے لیے کر دی گئی ہے۔

دوسری بحث یہ ہے کہ بظاہر آیت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہلاکت کا ارادہ پہلے ہی کر لیتا ہے اور پھر محض اسی ارادہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے، وہ نہیں مانتے اس لیے ہلاک کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ خدا جب کسی قوم کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے

تو کیا یہ ہلاکت ان کے گذشتہ اعمال کی پاداش میں ہونے والی ہوتی ہے یا اہلاک کے بعد خدا جو کچھ ان کو حکم دیتا ہے اس کی نافرمانی کے صلہ میں؟ اگر پہلی صورت اختیار کی جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے ہلاک کر دینے کا ارادہ ہی کر لیا تو پھر خواہ مخواہ کے لیے ایمان اور عمل صالح وغیرہ کا حکم دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو یہ اعتراض لاحق ہوتا ہے کہ خدا قبل نافرمانی اور قبل استحقاق عذاب ہلاک کر دینا چاہتا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ بظاہر یہ سوال بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا کہ مقالہ نگار کو اگرچہ اس آیت میں یہ شبہہ لاحق ہوا جس کا اظہار خود ہی انہوں نے اپنی تحریر میں کیا ہے لیکن جواب دینے سے انہوں نے پہلو تہی کی اور یہ مہمل بات کہکر جان چھڑالی کہ دونی الحقیقت قرآن کا انداز بیان ہے اور عربوں کے نمونۂ خطابت میں بھی اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں"۔ انصاف فرمائیے کہ کیا اس جواب سے مذکورہ بالا شبہہ رفع ہو گیا؟

اصل یہ ہے کہ یہ تمام شبہات، آیت کا صحیح مفہوم معلوم نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ اس آیت سے خدا کے ظلم و ستم کے ثبوت کے بجائے اس کی بے پایاں رحمت اور شفقت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ غلط فہمیاں محض اس لیے پیدا ہوتی ہیں۔ کہ لوگ ماقبل اور مابعد کی آیتوں کو پیش نظر رکھکر غور نہیں کرتے ورنہ یہ شبہہ ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اللہ اہلاک کا ارادہ، نافرمانی سے پہلے کرتا ہے یا نافرمانی کے بعد۔

ماقبل اور مابعد کی آیتوں کو ایک ساتھ ملا کر پڑھیے، خدا فرماتا ہے۔

لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّھْلِکَ قَرْیَۃً اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا فَفَسَقُوْا فِیْھَا فَحَقَّ عَلَیْھَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰھَا تَدْمِیْرًا وَکَمْ اَھْلَکْنَا مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ بَعْدِ نُوْحٍ وَکَفٰی بِرَبِّکَ

بِذُنُوْبِ عِبَادِہٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا۔ سب سے پہلے خدا یہ فرماتا ہے کہ رسول بھیجنے سے قبل ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے اور پھر اسی سلسلہ میں اس کی مزید توضیح اور تفسیر کے لیے فرماتا ہے کہ جب کوئی قوم اپنے اعمال خبیثہ کی بنا پر ہلاکت کی مستحق ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے ہم ان کو باوجود استحقاق عذاب کے آخری موقع اور دے کر، ڈرانے والوں کو بھیج کر، ایمان اور عمل صالح کا حکم دیتے ہیں۔ جب لوگ اس کے بعد بھی اپنی شرارتوں اور بداعمالیوں سے باز نہیں آتے تو پھر ہم ان کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس قانون کے مطابق حضرت نوح کے بعد معلوم نہیں کتنی قومیں برباد ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے گناہوں سے واقف ہی ہے۔ اس لئے جو لوگ اس کے قانون کے مطابق عذاب کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نافرمانی سے قبل ہلاک کر دینے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ دراصل ان کے گذشتہ اعمال ہلاکت کا موجب ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ ان کو فوراً ہلاک نہیں کرتا بلکہ ان کو آخری موقع دیتا ہے اور ان کی ہدایت کے لیے انبیاء کو بھیجتا ہے جب اس موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے تو پھر ہلاک کر دیئے جاتے ہیں ماقبل اور مابعد کی آیتوں کو ملا کر غور کرنے سے اس آیت کا یہی مفہوم متعین ہوتا ہے۔ اسی لیے اگرچہ مفسرین نے اس آیت کی بھی حسب عادت مختلف تاویلیں کی ہیں لیکن محققین نے بالعموم یہی تاویل پسند کی ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی معتزلہ کے قول کے مطابق اسی تاویل کو "احسن" قرار دیا ہے۔ شریف مرتضیٰ نے بھی اگرچہ اس آیت کی متعدد تاویلیں نقل کی ہیں لیکن ان کا رجحان بھی اسی تاویل کی طرف زیادہ ہے علماء متاخرین میں استاذ امام علامہ حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تاویل کی ہے۔ اور اس کی دوسرے دلائل سے توثیق کی ہے تفصیل کا موقع نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی اور دوسری آیتوں سے اس آیت کے یہی معنی متعین ہوتے ہیں اور

یعنے اس مفہوم کی بے شمار آیتیں قرآن میں ملتی ہیں کہ خدا، انذار سے قبل کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ راستہ دکھانے والوں کو بھیجکر انکا آخری بار امتحان لیتا ہے مثلاً ایک آیت میں ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔

یعنی پیغمبروں کو بھیج کر حجت کا تمام کرنا اس سبب سے ہے کہ تمہارا پروردگار بستیوں کو ظلم سے ہلاک کرنے والا نہیں کہ ان کو ہلاک کردے اور وہاں کے رہنے والے خدا کے منشا سے بے خبر ہوں

ایک دوسری آیت میں ہے :-

مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِىْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا۔

یعنی جب تک تمہارا پروردگار کسی قصبے میں پیغمبر نہ بھیجے اور وہ ان کو ہماری آیتیں پڑھکر نہ سنائے اس کی شان انصاف سے بعید ہے کہ اتمام حجت کے بغیر بستیوں کو ہلاک کر دیا کرے۔ سورہ شعرا میں ہے

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ۔

ہم نے کسی گاؤں کو بے اس کے ہلاک نہیں کیا کہ آگاہ کرنے کو ان کے پاس پیغمبر آئے۔

استحقاق عذاب کے بعد، انذار پر عذاب کیوں موقوف ہوتا ہے؟ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ دیا ہے مثلاً سورہ قصص میں ہے۔ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

ایک دوسری جگہ ہے :- لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ۔ لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ

اسی قسم کی بہت سی آیتیں قرآن میں ہیں اس وقت اس کی چند مثالیں پیش کر دی گئی ہیں استقصا مقصود نہیں۔

ان تمام آیتوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ آیت اِذَآ اَرَدْنَا الخ میں روئے سخن خواہ یہود کی

ہو یا مشرکین عرب کی طرف، یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کوئی قوم انذار سے قبل ہلاک نہیں کی جاتی لیکن انذار کے بعد پھر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اللہ کا تم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تم کو تمہاری بدکاریوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کردیا بلکہ تمہاری ہدایت کے لیے رسول بھیجا۔ اب بھی اگر تم اپنی بدکاریوں سے باز نہ آؤگے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے کردار سے واقف ہے۔ وہ ضرور تم کو ہلاک کردیگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مفہوم کی توضیح کے بعد آیت میں کوئی شبہہ ہی باقی نہیں رہتا۔ ہاں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آیت میں مُتْرَفِیْنَ (خوشحال لوگوں) کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاکت کی مستحق ہوگئی تو اگر اللہ کو خیر خواہی مقصود ہے تو مترفین کے ساتھ پوری قوم کو اطاعت اور نیکوکاری کا حکم دیا جاتا اور پوری قوم کے لیے انذار ہوتا صرف مترفین کی تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟ ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم ہرگز نہیں کہ یہ حکم مترفین کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ حکم تمام اہل قریہ کے لیے ہوتا ہے لیکن چونکہ عوام ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور یہی دراصل ان کی شقاوت یا سعادت کا باعث ہوتے ہیں، نیز یہاں روئے سخن "مترفین" ہی کی طرف ہے اس لیے ذکر میں ان کی تخصیص کردی گئی۔ ورنہ یہ چیز اپنی جگہ پر عام ہے۔

یعنی اس مفہوم کی بے شمار آیتیں قرآن میں ملتی ہیں کہ خدا، انذار سے قبل کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا بلکہ
راستہ دکھانے والوں کو بھیجکر انکا آخری بار امتحان لیتا ہے مثلاً ایک آیت میں ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ۔

یعنی پیغمبروں کو بھیج کر حجت کا تمام کرنا اس سبب سے ہے کہ تمہارا پروردگار بستیوں کو ظلم سے
ہلاک کرنے والا نہیں کہ ان کو ہلاک کردے اور وہاں کے رہنے والے خدا کے منشا سے بے خبر ہوں
ایک دوسری آیت میں ہے :۔

مَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِىْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا۔

یعنی جب تک تمہارا پروردگار کسی قصبے میں پیغمبر نہ بھیجے اور وہ ان کو ہماری آیتیں پڑھکر نہ سنائے
اس کی شان انصاف سے بعید ہے کہ اتمام حجت کے بغیر بستیوں کو ہلاک کردیا کرے۔ سورۂ شعراء میں ہے

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ۔

ہم نے کسی گاؤں کو بے اس کے ہلاک نہیں کیا کہ آگاہ کرنے کو ان کے پاس پیغمبر آئے۔
استحقاق عذاب کے بعد، انذار پر عذاب کیوں موقوف ہوتا ہے؟ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ
نے متعدد جگہ دیا ہے مثلاً سورۂ قصص میں ہے۔ وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
ایک دوسری جگہ ہے :۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا
مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ۔ لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ
اسی قسم کی بہت سی آیتیں قرآن میں ہیں اس وقت اس کی چند مثالیں پیش کردی گئی ہیں
استقصا مقصود نہیں۔

ان تمام آیتوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ آیت اِذَآ اَرَدْنَا الخ میں روئے سخن خواہ یہود کی

ہو یا مشرکین عرب کی طرف، یہ بات واضح کی گئی ہے کہ کوئی قوم انذار سے قبل ہلاک نہیں کی جاتی لیکن انذار کے بعد پھر وہ زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے اللہ کا تم پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تم کو تمہاری بدکاریوں کی وجہ سے ہلاک نہیں کر دیا بلکہ تمہاری ہدایت کے لیے رسول بھیجا۔ اب بھی اگر تم اپنی بدکاریوں سے باز نہ آؤگے تو یاد رکھو کہ اللہ تمہارے کردار سے واقف ہے۔ وہ ضرور تم کو ہلاک کر دیگا۔
میں سمجھتا ہوں کہ اس مفہوم کی توضیح کے بعد آیت میں کوئی شبہہ ہی باقی نہیں رہتا۔ ہاں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ آیت میں مُتْرَفِیْنَ (خوشحال لوگوں) کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہلاکت کی مستحق ہو گئی تو اگر اللہ کو خیر خواہی مقصود ہے تو مترفین کے ساتھ پوری قوم کو اطاعت اور نیکو کاری کا حکم دیا جاتا اور پوری قوم کے لیے انذار ہوتا صرف مترفین کی تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ یہ حکم مترفین کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ حکم تمام اہل قریہ کے لیے ہوتا ہے لیکن چونکہ عوام ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور یہی دراصل ان کی شقاوت یا سعادت کا باعث ہوتے ہیں، نیز یہاں روئے سخن "مترفین" ہی کی طرف ہے اس لیے ذکر میں ان کی تخصیص کر دی گئی۔ ورنہ یہ چیز اپنی جگہ پر عام ہے۔

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

از جناب مولوی ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب سنی وکیل ہنمکنڈہ

انجمن طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کے گذشتہ سالانہ جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب پروفیسر قانون جامعۂ عثمانیہ نے اپنے خطبہ میں سود، پردہ، طلاق اور مہر کے مسائل پر جو بحث کی ہے وہ غور و توجہ کی محتاج ہے اور ضرورت ہے کہ ان مسائل پر نور قرآن و حدیث کے اجالے میں نظر ڈال کر صحیح شرعی احکام بیان کئے جائیں۔

مسئلہ سود | جناب صدر کا ارشاد ہے:

"شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے نہایت ہی اہم موقع پر میدان عرفات میں ہزارہا صحابیوں کے سامنے نہایت ہی اہم الفاظ میں اس کی ممانعت فرمائی کہ الا اِنَّ ربٰوا الجاہلیۃ موضوعٌ تحتَ قدمی ھذا لیکن دور اول ہی سے اس کی شروعات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً امام مالک کی مدونہ میں سود پر سینکڑوں مسائل کا ذکر ہے۔ اگر یہ سب فرضی اور قانونی نہیں ہیں بلکہ کچھ بھی واقعی تو ان سے ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک شکل میں سود کا لین دین ہوتا تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی مبسوط میں صراحۃً مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس بصرہ سے مکہ تک سفاتج (یعنی بل آف ایکسچینج یا ہنڈیوں) پر کچھ زائد لینے کو جائز سمجھتے تھے حالانکہ یہ الذھب بالذھب والفضّۃ بالفضّۃ کی حدیث سے فقہاء کے نزدیک سود کی تعریف میں داخل ہے۔ دور اول کے بعد تو مسلمانوں

میں سود کا رواج عام رہا ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف کے متعلق قاضی خان اور دوسری فقہی کتابوں میں یہ قول منقول ہے کہ وہ حیل شرعی کے ذریعہ سے سود لینے کو پسند فرماتے تھے اور بیع بالوفا وغیرہ شرعی حیلوں کے ذریعہ سے سود کے جواز سے قطع نظر بھی کر لیں تو نیل الاوطار میں امام شوکانی صاف الفاظ میں شاکی نظر آتے ہیں کہ افسوس مسلمان ممالک کی مسلمان عدالتیں سود کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ اور دیتی آئی ہیں"۔

"........ مسئلہ سود کا ایک رخ مسلمانوں کے لیے بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ وہ سود دیتے ہی ہیں اور سود لیتے نہیں۔ حالانکہ فقہی احکام کی رو سے سود دینا بھی اتنا منع ہے جتنا کہ لینا۔ اسی سود دینے کی وجہ سے سالانہ ہزارہا مسلمانوں کی لاکھوں کی جائداد بنگال، یوپی، پنجاب، بمبئی وغیرہ میں دیگر اقوام کے ہاتھوں منتقل ہوتی جا رہی ہے........ یہ المناک واقعہ علمائے اسلام کی توجہ کے قابل ہے..... حلت و حرمت سود و ربا کے متعلق ان کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ربا یعنی غیر پیدائشی اغراض کے لیے محتاجوں سے اضعافاً مضاعفاً سود بھی حرام ہے اور پیدائشی اغراض کے لیے بنک کا سود بھی۔ ان کو پہلی قسم کے سود کی ممانعت پر کوئی شبہ نہیں۔ دوسرے کے متعلق بھی وہ حرمت کی طرف مائل ہیں کیونکہ کاروبار میں پیدائشی اور غیر پیدائشی اغراض محتاج اور غیر محتاجوں کا فرق ممکن نہیں۔ اس شبہ پر وہ اس سود کو بھی اس بنا پر ممنوع قرار دیتے ہیں کہ سود کی وجہ سے سرمایہ چند کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ اخوت اور ہمدردی کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، اور نظم معاشرت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے"۔

؎ شرع شریف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ لا ینکر والمتغیر الاحکام بتغیر الازمان

اس اصول پر عمل کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاق السنۃ یعنی قرآن و حدیث کے مقرر کردہ طریق طلاق کو بدل کر طلاق بدعی کو رائج کر دیا جو آج تک حنفی شافعی حنبلی ممالک میں قانون ہے۔ صحیح حدیث کی رو سے خود حضرت عمرؓ کو ربا کی وسعت اور حدود کے متعلق شبہ رہا ہے۔ دار الامان و دار الاسلام کے مسئلہ کی بنا پر حضرت عبد العزیز دہلوی نے جواز سود کا فتویٰ دیا ہے۔ اضعافاً مضاعفاً۔ یا سود در سود کی ممانعت میں تو مضائقہ نہیں اور یہی قرآن شریف کا حکم ہے اور اس کی تحدید قوانین موضوعہ کی رو سے کافی حد تک کامیابی کے ساتھ کی جا سکتی ہے۔ مشہور و مستند حدیث الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ الخ کا صحیح منشا کیا ہے؟ کیا اس کا منشا مبادلہ کو ختم کرنا اور اس کے بجائے بیع کا رواج دینا نہیں تھا؟ کیا اس خصوص میں آج کل کے اسلامی ممالک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا پورا نہیں ہو چکا ہے؟ اور کیا نیز اس حدیث شریف کا مقصد عربستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج نہیں تھا۔ اور کیا یہ بھی آج کل کے تمام اسلامی ممالک میں شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشا کے مطابق ظہور پذیر نہیں ہو چکا ہے؟ اور کیا اسی لیے سود کے متعلق میدان صاف نہیں ہے تاکہ ہر اسلامی حکومت حسب مصلحت عامہ احکام وضع کرے؟ اور کیا اگر یہ توجیہیں صحیح ہیں تو علمائے کرام کو نہیں چاہیئے کہ مسلمانوں کے ضمیر سے سود کی ممانعت کے بارگراں کو اٹھالیں کم از کم عارضی طور پر مصلحت کے اصول ہی کے تحت؟ بلاتشبیہ ساری تعریف ہے علمائے کرام کے لیے کہ اپنی تجارتی دنیا آپ پیدا کرنے کی مردانہ تعلیم دیتے ہیں لیکن کیا دنیا کے معاشی حالات مسلمانوں کو اس طرح گھیر نہیں لیے ہیں کہ اس مشورہ پر عمل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے؟ کیا آج کل کے قیامت سے قریب کے زمانہ میں مسلمان سود کے

غبار میں سرتاپا اٹے ہوئے نہیں ہیں۔؟

اس تقریر میں حسب ذیل سوالات تنقیح طلب ہیں:۔

(۱) اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ شرع اسلامی میں سود حرام کیا گیا ہے مگر کیا یہ واقعہ ہے کہ شرع میں خود سود کو بلا کسی تعریف و تحدید کے یوں ہی مبہم چھوڑ دیا گیا ہے؟ اگر سود کی وسعت اور اس کے حدود ہی متعین نہیں ہیں، جیسا کہ فاضل صدر کا خیال ہے، تو شریعت کا حکم تحریم سرے سے باطل ہو جاتا ہے اور شارع پر یہ الزام وارد ہوتا ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کو حرام کیا جس کے متعلق یہی معلوم نہیں کہ وہ چیز درحقیقت ہے کیا۔

(۲) اگر ایسا نہیں ہے اور "ربوا" ایک معلوم و متعین چیز ہے تو کیا شریعت میں "ربوٰ" صرف وہی حرام ہے جو اضعافاً مضاعفۃً ہو؟ کیا سود کی دوسری صورتوں پر "ربوٰ" کا اطلاق نہیں ہوتا؟

(۳) کیا یہ واقعہ ہے کہ ممالک اسلامیہ میں دور اول ہی سے سود کسی نہ کسی صورت میں رائج ہو گیا تھا اور فقہاء و مجتہدین نے مختلف حیلوں سے اس کو پسند کیا یا جائز رکھا؟

(۴) کیا تحریم ربوٰ کا مقصد صرف مبادلہ کو ختم کرنا اور اس کی جگہ بیع کو رواج دینا اور عرب میں ایک واحد سکہ کو جاری کرنا تھا؟ اور کیا یہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اب ہر اسلامی حکومت آزاد ہے کہ سود کے متعلق مصلحت عامہ کے تحت احکام وضع کرے؟

(۵) تغیر از مان کے ساتھ تغیر احکام کی حد کیا ہے؟ کیا تغیر زمانہ کے ساتھ اصول بھی بدلے جا سکتے ہیں؟ یا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصول کے ماتحت جزئی احکام میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟

(۶) کیا موجودہ زمانہ کی معاشی مشکلات کو حل کرنے کے لیے جائز ہے کہ سود کے متعلق اسلام کے اصلی قانون میں ترمیم کی جائے؟ اگر نہیں تو اس اصلی قانون کو برقرار رکھتے ہوئے ان مشکلات

کا صحیح حل کیا ہے؟

پردہ | دوسرا مسئلہ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مذہبی حیثیت سے بحث فرمائی ہے حجاب شرعی کا مسئلہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"میری ناچیز تحقیق میں امر صاف ہے کہ پردہ قرآن و حدیث و آثار سے واجب نہیں ہے بلکہ وہ صرف رواج کی وجہ سے واجب ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو قرآن شریف کی ایک آیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا۔ یعنی عورتوں کو نہ چاہیے کہ اپنی زینت کو ظاہر کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہے۔ اب تفسیر میں علامہ طبری کی تفسیر سب سے قدیم اور بہت ہی مستند ہے۔ اس میں حضرت ابن عباس کی اس آیت کی یہ تفسیر بیان کی گئی ہے کہ عورتوں کو چاہیے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوا بدن کو ڈھانکے رہیں کیونکہ چہرہ اور ہاتھ ان کی ایسی زینت ہے جو خود ظاہر ہے۔ اس طرح یہ ظاہر ہے کہ قرآن شریف سے پردہ کا حکم نہیں ہے۔ اور نہ میرے مطالعہ سے کوئی ایسی حدیث شریف گذری ہے جس سے پردہ کا حکم نکلتا ہو بر خلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بہت سے واقعات سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں پردہ کا رواج نہیں تھا۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کرتے پر آپ کی پیشوائی انصار کی لڑکیوں نے بھی طلع البدر علینا کے مشہور آفاق اشعار کو پڑھتے ہوئے کی آپ کی بیعت عورتیں خود آکر کرتی تھیں اور اگر کبھی ان کا لباس باریک ہوتا تھا جس سے ان کا جسم نظر آتا تھا۔ تو آپ ان کو ایسا لباس پہننے سے منع کرتے تھے۔ آپ کے زمانہ میں اور حضرت عمر کے زمانہ تک عورت و مرد ایک ہی صف میں نماز پڑھتے

حضرت عمر نے خیالات منتشر ہو جانے کے خیال سے حکم دیا کہ عورتوں کی صفیں مردوں کے پیچھے رہیں۔ مراسم حج میں یہ بھی آج تک بھی ضروری ہے کہ میدان عرفات میں عورتیں بے نقاب کھڑی رہیں۔ ان تمام واقعات و دلائل سے ظاہر ہے کہ پردہ شعائر اسلام سے نہیں۔ البتہ یہ مسلمانوں کے رواج سے اور وہ بھی بعض ممالک کے رواج سے قائم ہے۔ میں آخری شخص ہوں گا جو مسلمانوں کے رواج کو قطعی طور پر بُرا کہوں گا اور فی الحقیقت پردہ کا رواج سرتا سر برائیوں سے بھرا ہے۔ .... آیا پردہ تعلیم نسوان میں، عورتوں کی صحت جسمانی میں، ان کے اچھی ماں اور اچھی بیوی بننے میں مانع نہیں؟ اگر ہے اور ہم اجتماعی غور و فکر کے بعد اس کی تخفیف کو مناسب سمجھتے ہیں تو اس تخفیف کی کمیت اور کیفیت کیا ہونی چاہیئے؟ کیا اس خصوص میں ہندو عورتیں ہمیں کچھ سبق سکھا سکتی ہیں۔؟

یہاں حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی تحقیق ضروری ہے:۔

(۱) کیا قرآن وحدیث کی رو سے پردہ واجب نہیں ہے اور شعائر اسلام سے خارج ہے؟

(۲) آیت محولہ فوق میں "زینت" کا کیا مفہوم ہے اور مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے کیا مراد ہے؟۔

(۳) کیا عہد نبوی اور عہد صحابہ میں پردے کا رواج نہ تھا؟ اور کیا اس عہد مبارک میں عورتوں کو بے نقاب پھرنے اور مذہبی و معاشرتی اجتماعات میں مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھنے کی اجازت تھی؟۔

۴۔ کیا میدان عرفات میں عورتوں کا بے نقاب استادہ ہونا ضروری ہے؟

۵۔ کیا مسلمان عورتوں کے لیے جائز ہے کہ بے پردہ پھرنے میں غیر مسلم عورتوں کی تقلید کریں؟

طلاق بدعی طلاق کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے جن مسائل پر بحث فرمائی ہے ان میں سے پہلا

مسئلہ طلاق بدعی (یعنی بیک وقت تین طلاق دینے) کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"طلاق بدعی خلاف احکام قرآن و حدیث شریف ہے۔ ہماری معاشرت کے لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اس کو قانون کے ذریعہ سے منسوخ کر دینا چاہیے ..... طلاق بدعی کا مسلمانوں میں رواج حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ عرب اپنی طبیعت کی وجہ سے اپنی عورتوں کو ذرا سی بات پر طلاق دیدیتے تھے اور تین مہینے ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے لیکن دل سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ کہیں بیوی بند نکاح سے آزاد ہو کر کسی دوسرے سے نکاح نہ کرلے۔ اس طرح پر وہ عورتوں کو معلق رکھتے تھے۔ نہ امساک بالمعروف پر عمل کرتے تھے نہ تسریح باحسان پر۔ اس لیے عورتوں کے مفاد کے مدنظر آپ نے قرار دیا کہ اگر کوئی عرب اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے تو یہ تین طلاق فوراً ہی بائن واقع ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ مرور زمانہ سے اور اختلاف طبائع اور معاشرت کی وجہ سے طلاق بدعی کی ہمارے لیے ضرورت نہیں اور قرآن وحدیث شریف کے طریقۂ طلاق کی طرف رجوع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔"

یہ مسئلہ فقہاء کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں تین طلاق دی جائیں تو یا وہ تینوں ایک طلاق قرار دی جائیں گی یا جدا جدا تین طلاق؟ اور آیا ان سے عورت اپنے شوہر سے جدا ہو جائے گی یا شوہر کو حق رجوع باقی رہے گا؟ ڈاکٹر سیادت علی صاحب اس کا قطعی تصفیہ کر دینا چاہتے ہیں، اور ان کی تجویز یہ ہے کہ طلاق بدعی کو قانون کے ذریعہ سے منسوخ کر دیا جائے یعنی قانون میں یہ طے کر دیا جائے کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی طلاق کے حکم میں ہونگی اور وہ طلاق بائن نہیں بلکہ رجعی ہوگی۔ لیکن ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے مسائل ذیل کا تصفیہ ضروری ہے۔

(۱) کیا قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ طلاق بدعی سے بینونت واقع نہیں ہوتی؟

(۲) کیا حضرت عمرؓ کو یہ حق تھا کہ جس طلاق کو خدا اور رسول نے بائن نہ قرار دیا ہو اس کو وہ آپ

اختیار سے بائن قرار دیں؟

طلاق کو عدالتی فعل بنانے کی تجویز | اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک اور تجویز پیش فرمائی ہے جو انہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"شوہر کی طاقت طلاق مطلق العنان ہے اور اس طاقت میں اس کا کوئی شریک نہیں نہ بیوی نہ قاضی نہ عدالت۔ اس کو طلاق دینے کی وجہ تبلانے کی ضرورت نہیں۔ میری دانست میں یہ امر ہم سب کے غور و توجہ کا محتاج ہے کہ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ طلاق کو بجائے ایک شخصی فعل رہنے دینے کے ایک پنچایتی یا عدالتی فعل بنا دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قرابت والوں کو بیچ بچاؤ کرنے کا موقع ملے گا اور بغیر کافی وجہ کے طلاق دینا ناممکن ہوگا۔"

سوال یہ ہے کہ کیا شریعت کے اصول میں اس قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار کسی کو حاصل ہے؟ اور کیا شوہر کے اختیار طلاق پر پابندی عائد کرنا درست ہے؟

مہر کی تحدید | مہر کے متعلق فاضل خطیب نے فرمایا کہ:۔

"گو مہر السنۃ پانچ سو درہم یعنی ایک قلیل رقم ہے (مگر) خصوصاً ہم ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے بڑے مہر باندھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کی جو مطلق العنان طاقت شوہر کو حاصل ہے اس پر ایک روک لگانے کے لیے مسلمانوں نے رواج کے ذریعہ سے یہ قانون سازی کی ہے کہ مہر بڑی بڑی مقداریں باندھے جائیں تاکہ شوہر کو اپنی مطلق العنان طاقت کا استعمال دشوار ہو جائے اور چونکہ مہر کتنا ہی زیادہ ہو شرع شریف میں اور ہندی عدالتوں میں اس کی ڈگری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سے مقدمے ایسے ملتے ہیں جن میں لاکھوں کی ڈگری دی گئی ہے۔ اس لیے مقدار مہر کی زیادتی صحیح معنی میں طلاق کی مطلق العنان طاقت پر ایک موثر روک ہے لیکن مہر کی بے اندازہ زیادتی بنفسہ خرابیوں سے خالی نہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مہر کی اس زیادتی کے دو نقصان بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ کم ست وارثوں کے حقوق پر زد پڑتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شوہروں کو کاروباری دنیا میں معاشی حیثیت سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے مثلاً بنک سے اگر تجارتی اغراض کے لیے ان کو قرض لینا پڑتا ہے تو سوال کیا جاتا ہے کہ تمہارے ذمہ مہر کی رقم کس قدر واجب الادا ہے۔ اگر مہران کی معاشی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتا ہے تو شرح سود بڑھادی جاتی ہے اور بڑی بڑی کفالتیں مانگی جاتی ہیں ان نقصانات کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ :۔

" توقع ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد اور ارکان مجلس قوانین قانون کے ذریعہ سے نہ صرف اس کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائیں گے بلکہ طلاق کو بجائے شخصی فعل کے پنچایتی یا عدالتی فعل بنانے کی طرف بھی کیونکہ یہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے علانیہ طور پر مربوط ہیں "

اس معاملہ میں تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ آیا مہر کی زیادتی پر شرعاً کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

ترجمان القرآن ۔ چونکہ یہ سوالات تفصیلی بحث چاہتے ہیں اس لیے ان کا جواب اشاعت آئندہ پر ملتوی کیا جاتا ہے ۔

مطبوعات

عربوں کی جہاز رانی | مولانا سید سلیمان ندوی ضخامت دو سو صفحات۔ کاغذ و طباعت نفیس۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ جناب آصف علی اصغر فیضی ایم اے نمبر ۲۲ چوپاٹی روڈ، بمبئی)

یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ ۱۹۳۱ء میں مولانا نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی دعوت پر دیے تھے۔ اہل عرب کے فن جہاز رانی اور اس فن میں ان کی ترقیات اور ان کی بحری تجارت اور ان کے جنگی بیڑوں کے متعلق جتنی مفصل اور مستند معلومات اس مجموعہ میں جمع کی گئی ہیں وہ شاید کہیں اور یکجا نہ مل سکیں گی اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آج مغربی قوموں کے جنگی اور تجارتی بیڑوں نے جو ترقی کی ہے اس کی اساس کے بانی مبانی اہل عرب یا مسلمان ہی تھے۔ یہ محض خشک تاریخی اور فنی معلومات ہی کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ اس میں جگہ جگہ ایسی چیزیں ملتی ہیں جو دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی، مثلاً حضرت عمر کے ابتدائی عہد میں نہر سویز کا تخیل پیدا ہونا اور حضرت عمر کی دور اندیش نگاہوں کا اس خطرے کو تاڑ لینا جو اس نہر سے حجاز کو خصوصاً اور تمام اسلامی ممالک کو عموماً پیش آنے والا تھا۔ یا مثلاً ایک مسلمان جہاز ران کا واسکوڈی گاما، کو ہندوستان تک پہنچانا جس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ اکثر شرقی ممالک پر فرنگیوں کا سیلاب ایک عذاب کی صورت میں ٹوٹ پڑا۔

کلمۂ طیبہ | ایک مختصر رسالہ ہے جس کو ایک شیخ کامل نے ہدایت عام کے لیے لکھا ہے۔ اس میں دین اسلام کی تعلیم کا لب لباب اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ اس سے نہ صرف عقائد کی تفصیلات معلوم

ہوں بلکہ اس کے ساتھ وہ روح بھی پیدا ہو سکے جو دراصل ان عقائد کی تعلیم سے مقصود ہے
مولف نے جو کچھ لکھا ہے اگر اس کو حقیقی اسلامی تصوف کا نچوڑ کہا جائے تو بجا ہوگا۔ ان کے بیان کی
اصلی خوبی یہی ہے کہ وہ تفلسف کی بھول بھلیاں میں نہ خود پھنستے ہیں نہ کسی کی اس طرف رہنمائی کرتے
ہیں بلکہ سلوک کے تمام مقامات اسی ذریعہ سے طے کرانا چاہتے ہیں جس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
رہنمائی میں صحابۂ کرام نے ان کو طے کیا تھا۔ یعنی کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کا فہم اور قلب و روح میں اس فہم کا
اور پھر پوری زندگی پر اس کا ایسا حاوی ہو جانا کہ خیال اور عمل میں اس سے یک سر مو بھی ا
نہ ہو۔ اسلام میں اگر کوئی طریقت یا تصوف ہے تو وہ بس یہی ہے۔ اسی کو صحابہ نے رسول خدا صلی
علیہ وسلم سے حاصل کیا اور پھر سلسلہ بہ سلسلہ یہی چیز ہمارے اکابر تک پہنچی اور اسی کے ذریعہ سے ا
مسلمان ان بلند مدارج تک پہنچ سکتا ہے جن تک پہنچنے کا راستہ بجز اس علم صحیح اور عمل صحیح کے
کوئی نہیں ہے۔ اگر ہمارے صوفیہ اس طریقہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتے اور اسی کے مطابق
کی تربیت کرتے تو یہ قوم ان گمراہیوں میں کبھی مبتلا نہ ہوتی جنہوں نے اس کو دین اور دنیا د
سے کھو دیا۔

فائدۂ عام کی خاطر اس رسالے کو مفت شایع کیا گیا ہے۔ دو پیسے کے انگریزی یا چار
کے معلیٰ ٹکٹ بھیج کر دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیا جا سکتا ہے۔

اسلامیات تالیف جناب سلیم عبد اللہ صاحب۔ قیمت حصہ اول ۲۰ ر، حصہ دوم ۲۰ ر
۲۸ ر۔ ملنے کا پتہ: ناظم دفتر ال بینات۔ امراؤتی۔ برار۔

عام طور پر بچوں کے لیے دینیات کی جو درسی کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں مختصر طور پر عقائد
اسلامی کو اس طرح بیان کر دیا جاتا ہے جیسے وہ ریاضی کے چند فارمولے ہیں جن کو بس یاد
کافی ہے۔ اس کے بعد تمام تر زور وضو اور نماز روزے کے مسائل پر صرف کیا جاتا ہے

ان رسائل کے مصنف نے ایک جدید طریقہ اختیار کیا ہے اور وہ یقیناً زیادہ مفید ہے۔ وہ سب سے پہلے ایمانیات کو بچوں کی فہم کے مطابق دلنشین پیرائے میں بیان کرتے ہیں، اس کے بعد انبیا علیہم السلام اور اکابر دین کے حالات سے اسلامی سیرت کے بلند پایہ نمونے اخذ کر کے اس طور پر پیش کرتے ہیں کہ ان سے نہ صرف عقائد کی صحیح تعلیم حاصل ہو بلکہ اس کے ساتھ بچوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان عقائد سے کیسے انسان بنتے ہیں۔ پھر وہ آگے بڑھ کر تعلیم قرآن کی ابتدا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی سورتیں ترجمہ و مفہوم کے ساتھ یاد کراتے چلے جاتے ہیں اگر اسی ڈھنگ پر یہ سلسلہ مکمل کیا جائے تو ہمیں امید ہے کہ بچوں کی دینی تعلیم کے لیے یہ ایک بہت اچھا سلسلہ ہوگا۔ مصنف نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ کوئی ایسی چیز نہ آنے پائے جو اسلامی فرقوں میں مختلف فیہ ہو۔ نیز انہوں نے جگہ جگہ توحید و رسالت کی تعلیم کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

مشیت ایزدی اور قرآنی تعلیمات | از پروفیسر یوسف سلیم چشتی پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور۔
قیمت ۵ ۔ پیکو آرٹ پریس ۔ موچی دروازہ، لاہور۔

اس رسالہ میں جبر و قدر کے پیچیدہ مسئلے پر بحث کی گئی ہے اور آیات قرآنی کی مدد سے اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ خلق فعل اور کسب فعل دونوں اپنی اپنی جگہ دو ناقابل انکار حقیقتیں ہیں جن کا ظہور ہماری ذات میں ساتھ ساتھ ہوتا ہے، اور اس طور پر ہوتا ہے کہ ہم تابع مشیت الٰہی بھی ہیں اور اپنے اچھے برے افعال کے ذمہ دار بھی۔ دوران بحث میں ضمناً ذات باری تعالیٰ کے متعلق اسلامی عقائد کی تشریح اور ملحدین کے خیالات کی تردید بھی آگئی ہے۔

ختم نبوت | یہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا دوسرا مختصر رسالہ ہے جس کا موضوع بحث اس کے نام سے ظاہر ہے۔ بحث کا رخ زیادہ تر مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعوئے نبوت کے ابطال کی طرف پھرا ہوا ہے، اور نصوص و براہین عقلیہ سے ان اعتراضات کو رد کیا گیا ہے جو ختم نبوت کے متفقہ اسلامی عقیدے پر

کیے جاتے ہیں۔

قیمت ۲/-۔ بیکو آرٹ پریس۔ لاہور۔

المفتی زیر ادارت مولانا سید اصغر حسین صاحب و مولانا محمد شفیع صاحب مفتی دارالعلوم دیو[بند]

چندہ سالانہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ دارالاشاعت دیوبند ضلع سہارنپور۔

یہ رسالہ خاص طور پر فتاوی کی اشاعت کے لیے جاری کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دوسرے مذہبی مضامین بھی اس میں درج کیے جاتے ہیں۔ فقہی معلومات حاصل کرنے کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

مکتبہ علمیہ

سلطنت آصفیہ میں ایک ایسا مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم مل سکتے ہیں طلبا کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمائش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مؤلفین حیدرآباد میں اپنی تصانیف کی اشاعت یا ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہوں وہ مہتمم مکتبہ سے بذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں حیدرآباد کے مشہور اور نامور شعرا اور مصنفین کی تصانیف آپ کو مکتبہ ہی سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر فہرست مفت **مالک خواجہ بہاؤالدین صاحب مکتبہ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن** طلب فرمائیے

قواعد

رسالہ **ترجمان القرآن** بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینے کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ طلب کر سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔ جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں پتے جدید کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹری نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن)

اردو زبان کی ایک پرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی صفحہ بصفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۲۵) امریکن کاک (۱۵۱) صفحے
نفیس چھپائی، بہترین سنہری جلد فرانس کے نامور مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰ حضرت فرماں روائے دکن (مدظلہ)

کے جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت تین روپے بعد طبع چھ روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر و روزگار کتابوں کے لئے

سید عبدالقادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پبلشر دیپو پر آشر اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن

جلد [illegible] عدد [illegible]
[illegible]

رجسٹرڈ نمبر [illegible]
رجسٹرڈ نمبر [illegible]

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت [illegible]

قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

ضخامت ([illegible] صفحات) قیمت مجلد ([illegible]) انگریزی ([illegible]) سکہ عثمانیہ غیر مجلد ([illegible]) انگریزی چار روپیہ بارہ آنے سکہ

دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ رمضان سنہ ۱۳۵۴ھ - جلد ۷، عدد ۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول اور اساسی [احکام] میں غایت درجہ کا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اخلاق کے بلند نصب العین کو پیش [نظر] رکھتا ہے تو دوسری طرف انسانی فطرت کی کمزوریوں کو بھی نظرانداز نہیں کرتا۔ ایک طرف وہ تمدنی [و] اجتماعی مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے تو دوسری طرف اشخاص کے حقوق بھی پامال نہیں ہونے دیتا۔ [ایک] طرف وہ واقعی حالات پر نگاہ رکھتا ہے تو دوسری طرف ایسے امکانات کو بھی نظر سے اوجھل نہیں ہونے [دیتا] جن کا کسی وقت عالم واقعہ میں آنا متوقع ہے۔ غرض یہ ایک ایسا معتدل قانون ہے جس کا کوئی قاعدہ [اور] کوئی حکم افراط و تفریط کی جانب مائل نہیں ہے۔ قانون سازی میں جتنے مختلف پہلوؤں کا لحاظ رکھنا [ضروری] ہے، ان سب کا اس میں نظری حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عملاً پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے اور ان کے درمیان [ایسا] صحیح توازن قائم کیا گیا ہے کہ کہیں کسی ایک طرف نامناسب میلان اور کسی دوسرے پہلو سے غیر منصفانہ اعراض نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تیرہ سو برس سے یہ قانون مختلف ملکوں، مختلف زمانوں، مختلف حالات اور مختلف علمی مراتب اور مزاجی کیفیات رکھنے والی قوموں میں رائج رہا ہے، اور کہیں کسی شخصی یا [اجتماعی] تجربے نے اس کے کسی اساسی حکم کو غلط یا قابل ترمیم نہیں پایا۔ یہی نہیں بلکہ انسانی فکر باوجود سعی بلیغ [اس] کی کسی چیز کا ایسا بدل تجویز کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جو اعتدال اور توازن اور تناسب میں اس

تک بھی پہنچتا ہو۔

یہ کیفیت جو اسلامی قانون میں پائی جاتی ہے، صرف الٰہی حکمت و بصیرت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے، کیونکہ انسان اپنے لازمی تقیدات اور اپنی فطری محدودیتوں کے ساتھ کبھی اِس پر قادر ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرے، حال اور مستقبل پر یکساں نظر رکھے، ما بالفعل اور ما بالقوہ پر ایک ساتھ نگاہ ڈالے، خود اپنی اور اپنے تمام ابنائے نوع کی فطرت کے چھپے اور ظاہر خصائص کا پورا پورا لحاظ کرے، اپنے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد ہو جائے، اور اپنے جذبات اور طبعی رجحانات اور عقلی کوتاہیوں اور علمی نارسائیوں سے یکسر پاک ہو کر کوئی ایسا قاعدہ وضع کر سکے جو ہر حال اور ہر زمانے اور ہر ضرورت پر ٹھیک ٹھیک عدل اور مناسبت کے ساتھ منطبق ہو سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے قوانین انسانی فکر پر مبنی ہوتے ہیں ان میں صحیح توازن نہیں ہوتا، کہیں نظریات میں بے اعتدالی ہوتی ہے، کہیں حکمت عملی میں نقص پایا جاتا ہے، کہیں اخلاق اور قانون کی آمیزش میں افراط و تفریط ہوتی ہے، کہیں انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کی رعایت میں کوتاہی کی جاتی ہے، کہیں اشخاص کے حقوق اور واجبات متعین کرنے میں عدل نہیں ہوتا، کہیں شخص اور جماعت کے درمیان حدود اور حقوق کی تقسیم میں بے انصافی ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ ہر نئے تجربے اور ہر متغیر حالت اور ہر بدلے ہوئے زمانے میں ایسے قوانین کی کمزوریاں نمایاں ہوتی رہتی ہیں، اور انسان مجبور ہوتا ہے کہ یا تو ان میں ترمیم کرے یا اعتقاداً ان کا متبع رہ کر عملاً ان کی پابندی سے آزاد ہو جائے۔

الٰہی قانون اور انسانی قانون کے درمیان بنیادی فرق آج اتنا نمایاں ہو چکا ہے کہ بجز اندھوں اور شپرہ چشموں کے ہر شخص اس کو دیکھ سکتا ہے۔ کل تک تعصب یا جہل کی وجہ سے اسلامی قانون کے جن احکام اور اصولوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کیے جاتے تھے، اور ان کے مقابلے میں انسانی قوانین کے جن نظریات اور

قواعد پر فخر کا اظہار کیا جاتا تھا آج ان کے متعلق کسی بحث و استدلال کے بغیر محض واقعات ہی کی نا قابل انکار شہادت سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے اور ہوتی جا رہی ہے کہ جو کچھ اسلام نے سکھایا تھا وہی صحیح تھا۔ اس کے خلاف جتنے طریقے انسانی قوانین نے تجویز کئے تھے وہ سب غلط اور نا قابل اتباع نکلے اگرچہ عالم تخیل میں وہ بہت ہی درخشاں نظر آتے تھے۔ زبانیں اب بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنے سے انکار کرتی ہیں۔ مگر عملاً دنیا اُن قوانین کو توڑ رہی ہے۔ جن کو کل تک وہ نہایت مقدس اور نا قابل ترمیم سمجھتی تھی اور آہستہ آہستہ ان اُصول و قواعد کی طرف رجوع کر رہی ہے جو اسلام نے مقرر کیے تھے لیکن بعد از خرابی بسیار۔

مثال کے طور پر طلاق کے مسئلہ کو لے لیجیے جس پر ابھی چند سال پہلے تک مسیحی دنیا مسلمانوں کو کیسے کیسے طعنے دیتی تھی؟ اور بہت سے مرعوب مسلمانوں کو شرمندگی کے مارے جواب بن نہ آتا تھا۔ مگر دیکھتے دیکھتے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ازدواج کے مقدس رشتے کو ناقابل انقطاع قرار دینا اور قانون میں طلاق و خلع اور فسخ و تفریق کی گنجائش نہ رکھنا مسیحیت کا کوئی حکیمانہ فعل نہ تھا، بلکہ محض انسانی فکر کی بے اعتدالی کا نتیجہ تھا، اور اس میں اخلاق و انسانیت اور نظام تمدن کی فلاح نہیں بلکہ تباہی کے اسباب مضمر تھے۔

مسیح کے یہ الفاظ کس قدر شاندار ہیں کہ:-

"جسے خدا نے جوڑا اسے آدمی جدا نہ کرے" (متی ۱۹: ۶)

مگر اس قول کو اخلاقی اصول کی حد سے نکال کر قانون ازدواج کی اساس بنانے کا انجام کیا ہوا؟ مسیحی دنیا صدیوں تک اس ناقابل عمل قانون کے خلاف حیلوں اور مکر و فریب کے ساتھ عمل کرتی رہی پھر خلاف ورزی قانون کی عادت بدلنے اتنی ترقی کی کہ جو اخلاقی حدیں رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس تھیں ان کو بھی بکثرت اور علانیہ توڑا جانے لگا آخرکار اف فوں نے مجبور ہو کر اس قانون میں چند ادھوری اور ناقص ترمیمیں کیں جس کو وہ غلطی سے خدا کا قانون سمجھ رہے تھے۔ مگر یہ اصلاحی قدم اس وقت

اٹھایا گیا جب قانون شکنی کی عادت نے پیروان مسیح کے دلوں میں خدا کی جوڑی ہوئی چیز کا احترام باقی ہی نہ چھوڑا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان جزوی اور نہایت ناقص ترمیموں ہی کی بدولت یکی دنیا میں طلاق اور فسخ و تفریق کا ایک طوفان امنڈ آیا جس کی شدت سے نظام عائلی کی "مقدس" دیواریں پاش پاش ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ انگلستان جہاں ۱۸۵۸ء میں صرف ۱۶۶ تفریقیں ہوئی تھیں، وہاں ۱۹۳۳ء میں چار ہزار سے اوپر تفریقیں ہوئیں، یعنی خدا کے جوڑے ہوئے ہر ۹ رشتوں میں سے ایک کو آدمی نے جا کر دیا۔ امریکہ جہاں ۱۸۶۷ء میں ۱۰ ہزار تفریقیں ہوئی تھیں وہاں ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ ۸۳ ہزار مقدس رشتے قطع کیے گئے۔ فرانس میں تو اب قریب قریب ہر ۱۵ شادیوں کا انجام طلاق پر ہو رہا ہے۔ اور کم و بیش یہی حال دوسرے مغربی ممالک کا بھی ہے۔

مسیح نے جو تعلیم دی تھی اس سے ملتی جلتی تعلیم قرآن میں بھی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے کہ اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (۲: ۳) مسیح نے یہودیوں کی سخت دلی اور طلاق کی کثرت کے خلاف نفرت دلانے کے لیے کہا تھا کہ "جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے اور دوسری بیاہ کرے وہ زنا کرتا ہے" (متی ۱۹: ۹) محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس غرض کے لیے اس سے زیادہ بیچے تلے الفاظ میں طلاق کو ابغض الحلال فرمایا اور نفس پرستی کی خاطر طلاق دینے والے کو ملعون ٹھیرایا۔ مگر یہ اخلاق کے بلند پایہ اصول محض اشخاص کی تعلیم کے لیے تھے تاکہ وہ اپنے عمل میں ان کو پیش نظر رکھیں، نہ یہ کہ انھیں کو بجنسہٖ لے کر ایک قانون کی شکل میں تبدیل کر دیا جائے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف معلم اخلاق ہی نہیں صاحب شریعت بھی تھے اس لیے آپ نے اصول اخلاق بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ قانون میں ان اخلاقی اصولوں کی آمیزش کا صحیح تناسب کیا ہونا چاہیے اور اصول اخلاق و مقتضیات فطرت انسانی کے درمیان کس طرح

توازن قائم رہ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے مسیح علیہ السلام صاحبِ شریعت نہ تھے بلکہ صرف اس لیے آئے تھے کہ شریعتِ موسوی میں مکارمِ اخلاق کی وہ روح پھونک دیں جو بنی اسرائیل سے مفقود ہو گئی تھی، اس وجہ سے انہوں نے صرف اخلاقی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا جس سے مقصد یہ تھا کہ شریعتِ موسوی کے اتباع میں ان اصولوں کو مرعی رکھا جائے۔ مگر مسیحی یہ سمجھے کہ ان اصولوں کو پا لینے کے بعد اب ہم آبائی شریعت سے بے نیاز ہو چکے ہیں، اور یہ خدا اور اس کے رسول کا نہیں بلکہ "چرچ" کا کام ہے کہ ان اصولوں کی بنا پر قوانین بنائے۔

یہ عظیم الشان غلط فہمی تھی جس نے چرچ اور اس کے متبعین کو ہمیشہ کے لیے گمراہی میں ڈال دیا۔ مسیحیت کی دو ہزار سالہ تاریخ شاہد ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام نے جتنے اصولِ دین بتائے تھے ان میں سے کسی ایک کی بنیاد پر بھی کوئی صحیح قانون بنانے میں چرچ کو کامیابی نصیب نہ ہوئی اور آخر کار مسیحی قومیں ان اصولوں ہی سے انحراف کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

مسیح نے طلاق کی جو برائی کی تھی اس میں "حرام کاری" کا استثنا کر کے گویا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا تھا کہ طلاق مطلقاً بری چیز نہیں بلکہ سبب جائز کے بغیر مبغوض ہے۔ مسیحی اس کو نہ سمجھے اور اوپر والی آیت ("جسے خدا نے جوڑا ہے اسے آدمی جدا نہ کرے") سے متعارض پا کر بعض نے تو یہ رائے قائم کر لی کہ یہ استثنا بعد کا اضافہ ہے اور بعض نے اس سے یہ مسئلہ نکال لیا کہ "حرام کاری" کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے، مگر رشتۂ نکاح بدستور قائم رہے، اور دونوں میں سے کسی کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہ ہو۔ صدیوں تک مسیحی دنیا اسی پر عمل کرتی رہی اور منجملہ دوسرے قوانین کے اس قانون نے بھی مسیحی قوموں کے اندر بداخلاقی کی کافی اشاعت کی۔ لطف یہ ہے کہ چرچ کے اثر سے آزاد ہو جانے اور بالکل عقلی اصولوں پر قانون سازی کا ادعا کرنے کے باوجود انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں اب تک قانونی تفریق (Judicial Separation) کے معنی یہی سمجھے جاتے ہیں کہ زوجین کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے،

اگر دونوں نکاح ثانی کے مجاز نہ ہوں۔ یہ ہے انسانی عقل کی کوتاہیوں کا حال۔

کلیسائے روم کے مذہبی قانون (Canon Law) میں مذکورہ بالا اصول کی بنا پر جو قواعد بنائے گئے تھے ان کی رو سے طلاق (Divorce) یعنی رشتۂ نکاح کا کامل انقطاع جس کے بعد زوجین کو الگ الگ نکاح کرنے کا حق حاصل ہو، قطعاً ممنوع تھا، البتہ تفریق کے لیے ۶ صورتیں تجویز کی گئی تھیں:- (۱) زنا یا جرائم خلاف وضع فطری (۲) خیانت (۳) ظالمانہ برتاؤ (۴) کفر (۵) ارتداد (۶) زوجین کے درمیان حرام خونی رشتوں میں سے کوئی رشتہ نکل آنا۔

ان چھ صورتوں میں جو قانونی چارۂ کار تجویز کیا گیا تھا اس کو کون عقل کے مطابق کہہ سکتا ہے؟ عدالت سے تفریق کا فیصلہ حاصل کر کے ہمیشہ تجرد کی زندگی بسر کرنا! یہ قانونی چارۂ کار نہیں بلکہ ایک سزا تھی جس کے خوف سے لوگ تفریق کے مقدمے ہی عدالتوں میں لے جاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور اگر کسی قضا کے مارے جوڑے کی تفریق ہو جاتی تھی تو اسے لامحالہ یا تو راہبوں کی سی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی، یا پھر مدت العمر حرام کاری میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔

اس شدید اور ناقابل عمل قانون سے بچنے کے لیے مسیحی علما نے بہت سے شرعی حیلے نکال رکھے تھے جن سے کام لے کر "چرچ" کا قانون ایسے بدنصیب زوجین کا نکاح فسخ کر دیتا تھا۔ من جملہ ان کے ایک حیلہ یہ تھا کہ اگر کسی طور پر یہ ثابت ہو جائے کہ زوجین نے مدۃ العمر ساتھ رہنے کا جو عہد کیا تھا وہ بلا ارادہ اُن سے سرزد ہو گیا تھا اور نہ در اصل ان کا مقصود محض ایک محدود مدت کے لیے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا (متعہ) تھا، تو اس صورت میں مذہبی عدالت انفساخ نکاح (Nullity) کا اعلان کر دے گی۔ گر مسیحی قانون کی رو سے "انفساخِ نکاح" کے معنی کیا ہیں؟ یہ کہ زوجین میں کوئی نکاح ہی نہیں ہوا، اب تک ان کے درمیان ناجائز تعلقات تھے اور ان سے جو اولاد ہوئی وہ حرامی تھی! اس معنی کے لحاظ سے یہ دوسرا قانونی چارۂ کار

بھی کچھ کم خراب نہیں ہے۔

رومن چرچ کے بالمقابل مشرقی کلیسا (Orthodox Eastern Church)
نے جس کو فقہ اسلامی سے متاثر ہونے کے بہت زیادہ مواقع ملے ہیں نسبۃً ایک بہتر اور قابل عمل قانون بنایا ہے۔ اس کے نزدیک بند نکاح سے زوجین کو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آزاد کیا جا سکتا ہے۔
(۱) زنا یا اس کے مقدمات۔ (۲) ارتداد۔ (۳) شوہر کا اپنی زندگی کو قسیس کی حیثیت سے مذہبی خدمت کے لیے وقف کرنا۔ (۴) بغاوت۔ (۵) نشوز۔ (۶) ضمانت۔ (۷) جنون (۸) برص و جذام (۹) طویل مدت کے لیے قید ہونا۔ (۱۰) نفرت باہمی یا شدید ناموافقت مزاج۔

لیکن مغربی ممالک کے مذہبی پیشوا اس قانون کو نہیں مانتے وہ کلیسائے روم کی فقہ پر ایمان لا چکے ہیں جس میں قطعی طور پر طے کر دیا گیا ہے کہ رشتہ نکاح بجز موت کے کسی اور چیز سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ اب اس فتوے کے بعد ان کے لیے عقل سے کام لینا تو درکنار خود اپنے ہی دین کے ایک دوسرے مذہب فقہی پر غور کرنا بھی حرام ہے۔ ۱۹۱۲ء کے رایل کمشن کے سامنے بشپ گور (Bishop gore) نے مشرقی کلیسا کے بعض مسائل اخذ کرنے کی مخالفت محض اس حجت کی بنا پر کی کہ انگریزی چرچ رومن کلیسا کی فقہ کا پابند ہے۔ ۱۹۲۳ء کی (Lambeth Conference) میں بالفاظ صریح یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم کسی ایسے مرد یا عورت کا نکاح ہی نہیں پڑھا سکتے جس کا سابق شریک حیات ابھی زندہ ہو۔ آخری اصلاح جس پر ۱۹۳۵ء میں انگلستان کے مذہبی پیشواؤں کی ایک مجلس (Joint Committee of Convocation) متفق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر نکاح سے پہلے کوئی فریق امراض خبیثہ میں مبتلا ہو، یا موروثی خرابی دماغ یا نقص جسمانی کا شکار ہو اور نکاح کے وقت اس کو دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور نکاح کے وقت اپنے شوہر سے اپنے حمل کو

مخفی رکھا ہو تو نکاح فسخ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر نکاح کے بعد ایسی کوئی صورت پیش آجائے تو نہ عورت کے لیے مذہبی حیثیت سے کوئی چارہ کار رہے اور نہ مرد کے لیے!

یہ تو تھا مذہبی گروہ کا حال جس میں صدیوں تک پے در پے بڑے بڑے عقلا، علما، اور فقہا پیدا ہوئے، مگر ابتدا میں ان کے پیشواؤں سے مسیح علیہ السلام کے ایک ارشاد کا مفہوم اور اس کی قانونی حیثیت سمجھنے میں جو غلطی ہوئی تھی، اس کا اثر ان کے دل و دماغ پر ایسا گہرا جم گیا کہ استداد زمانہ، تغیر احوال، علمی و عقلی ارتقاء، انسانی فطرت کا مطالعہ، سینکڑوں برس کے تجربات، خود صریح عقل کے فیصلے اور دوسرے بہتر قوانین کے نظائر، غرض یہ سب چیزیں مل جل کر بھی ان کو اس اثر سے آزاد نہ کر سکیں، اور دو ہزار برس کی طویل مدت میں بھی رومن چرچ کے بہترین دماغ اپنے قانون کا توازن درست کرنے اور اس کو اعتدال کے صحیح نقطے پر لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اب ذرا ایک نظر ان روشن خیال اور وسیع علم و تجربہ رکھنے والے واضعین قانون کے کارناموں پر بھی ڈال لیجیے جنھوں نے مذہبی قانون کی بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی قوموں کے لیے خود اپنے اجتہاد سے ازدواجی قوانین بنائے ہیں۔

انقلاب فرانس سے پہلے تک یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک میں رومن چرچ کا مذہبی قانون نافذ تھا، اور اس نے دوسرے ایسے ہی قوانین کے ساتھ مل کر مغربی قوموں کی معاشرت اور ان کے اخلاق کو بہت سی شدید خرابیوں میں مبتلا کر رکھا تھا۔ انقلابی دور میں جب آزاد تنقید اور آزادانہ تفکر کی ہوا چلی تو سب سے پہلے اہل فرانس نے اس قانون کے نقائص کو محسوس کیا اور یہ دیکھ کر کہ علمائے دین کسی طرح اس کی اصلاح پر آمادہ نہیں کیے جا سکتے، سرے سے اس کا جوا ہی اپنے کندھوں سے اتار پھینکا۔

(سنہ ۱۷۹۲ء) اس کے بعد یہی ہوا دوسرے ممالک میں بھی چلی اور رفتہ رفتہ انگلستان، جرمنی، آسٹریا، بلجیم، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، سوئیٹزرلینڈ وغیرہ نے مذہبی قانون کو چھوڑ کر اپنے اپنے جداگانہ قوانین نکاح و طلاق وضع کر لیے جن میں قانونی تفریق اور فسخ کے علاوہ طلاق کے لیے بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔

اس طرح مسیحی اقوام کے ایک جم غفیر کا اپنے مذہبی قانون سے آزاد ہو جانا براہ راست نتیجہ ہے اُن تنگ نظری، جہل اور تعصب کا جس کی بنا پر مسیحی علما ایک ناقابل عمل، خلاف فطرت اور سخت مضرت رساں قانون کو جبراً محض مذہب کی طاقت سے مسلط رکھنے پر اصرار کر رہے تھے۔ یہ قانون خدا کا بنایا ہوا نہ تھا، محض چند انسانوں کے اجتہاد پر مبنی تھا، لیکن پادریوں نے اس کو خدائی قانون کی طرح مقدس اور ناقابل ترمیم قرار دیا۔ انھوں نے اس کی کھلی ہوئی غلطیوں، مضرتوں، اور خلاف عقل امور کو دیکھنے اور سمجھنے سے قطعی انکار کر دیا کہ کہیں سینٹ پال اور فلاں اور فلاں ائمہ متقدمین کے نکالے ہوئے مسائل میں غلطی کا امکان ہی فرض کر لینے سے ان کا ایمان سلب نہ ہو جائے۔ حتیٰ کہ انھوں نے خود اپنے دین کے ایک دوسرے فقہی مذہب سے بھی استفادہ کرنے کی مخالفت کی، نہ اس بنا پر کہ مغربی چرچ کا قانون مشرقی چرچ کے قانون سے بہتر ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کہ ہم مغربی چرچ کے متبع ہیں"۔ مذہبی پیشواؤں کے اس طرز عمل نے مغربی قوموں کے لیے بجز اس کے کوئی چارۂ کار باقی ہی نہ رکھا کہ وہ ایسے قانون کی بندشوں کو توڑ پھینکیں جس کی غلطیاں اور مضرتیں ظاہر ہو جانے کے باوجود قابل اصلاح نہیں سمجھی جاتیں۔

ایک قانون ازدواج ہی پر کیا موقوف ہے، اسی پادریانہ ذہنیت یورپ کی قوموں کو الحاد و دہریت اور لامذہبی کی طرف دھکیل دھکیل کر لے گئی ہے۔

جی

مذہبی قانون سے آزاد ہونے کے بعد مغربی ممالک میں گذشتہ ستر اسی سال کے اندر جواز

قوانین وضع کیے گئے ہیں ان کو بنانے میں اگر سینکڑوں ہزاروں دماغوں نے اپنی بہترین قابلیتوں کے ساتھ حصہ لیا ہے، اور نئے تجربات کی روشنی میں پے در پے ترمیمیں اور اصلاحیں بھی کرتے رہے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے باوجود ان کے قوانین میں وہ توازن اور اعتدال پیدا نہیں ہو سکا ہے جو عرب کے ایک امی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پیش کیے ہوئے قانون میں پایا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ مذہبی قانون سے آزاد ہو کر بھی وہ اپنے دل و دماغ کو ان تصورات سے اب تک پاک نہیں کر سکے ہیں جو انھیں رومن چرچ کے ابتدائی بانیوں سے وراثت میں ملے ہیں۔

مثال کے طور پر انگلستان کے قانون کو لیجیے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے تک وہاں صرف زنا اور ظالمانہ برتاؤ یہ دو ایسے وجوہ تھے جن کی بنا پر قانونی تفریق کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ طلاق جس کے بعد زوجین نکاح ثانی کے لیے آزاد ہوں اس وقت تک وہاں ممنوع تھا۔ ۱۸۵۷ء کے قانون میں مذکورۂ بالا دو وجوہ کے ساتھ نشوز زا حد الزوجین (Desertion) کو بھی ایک جائز وجہ تفریق قرار دیا گیا بشرطیکہ وہ دو سال یا اس سے زیادہ تک جاری رہا ہو۔ علاوہ بریں اسی قانون میں طلاق (یعنی عقدۂ نکاح سے قطعی آزادی) کو بھی جائز کیا گیا، مگر اس کے لیے لازم کر دیا گیا کہ مرد اگر طلاق چاہتا ہو تو وہ بیوی کا مرتکب زنا ہونا ثابت کرے۔ اور اگر عورت طلاق چاہتی ہو تو وہ شوہر کے ارتکاب زنا کے ساتھ ساتھ ظالمانہ برتاؤ یا نشوز بھی ثابت کرے۔ اس طرح گویا عورتوں اور مردوں کو مجبور کیا گیا کہ خواہ وہ کسی وجہ سے ایک دوسرے کو چھوڑنا چاہتے ہوں، بہرحال ان کو ایک دوسرے پر زنا کا الزام ضرور لگانا پڑے گا، اور ایک کھلی عدالت میں اس کا ثبوت دیکر ہمیشہ کے لیے سوسائٹی کے ایک فرد کی زندگی کو داغدار بنا دینا ہوگا۔ اس قانون نے زنا کے جھوٹے الزامات تراشنے کا دروازہ کھولا، عدالتوں کو سوسائٹی کے

تمام گندے کپڑے دھونے کی جگہ بنا دیا، اور پھر عدالتہائے طلاق کے مقدمات کی اشاعت گویا بداخلاقی کی اشاعت کا ذریعہ بن گئی۔ مزید براں اس قانون نے شوہروں کو دیوثی کی تعلیم بھی دی کیونکہ اس میں شوہر کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کے ناجائز دوست سے ہرجانہ بھی وصول کر سکتا ہے' یعنی عورت کی عصمت کا معاوضہ! تمتع ناجائز کی قیمت جو قرمساقون کا ذریعہ آمدنی ہوا کرتی ہے!

۱۸۷۸ء کے قانون میں عدالت کو اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو نکاح کو توڑنے کے ساتھ ساتھ خطاکار شوہر پر مطلقہ عورت کے نفقہ کا بار بھی ڈال سکتی ہے بشرطیکہ ۱۹ء کے قانون میں شوہر کے خطاکار ہونے کی شرط اڑا دی گئی' اور عدالت کو مطلقاً یہ حق دیا گیا کہ جہاں مناسب سمجھے مطلقہ عورت کے نفقہ کی ذمہ داری مرد پر ڈال دے۔ یہ عورتوں کے ساتھ کھلی ہوئی جانبداری ہے' اور یہاں صاف طور پر توازن بگڑا ہوا نظر آتا ہے جب عورت اور مرد کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا تو محض سابق تعلق کی بنا پر ایک غیر عورت کو ایک غیر مرد سے نفقہ دلوانا درانحالیکہ اس نفقہ کے بالمقابل اس مرد کو کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، نہ عقلاً درست ہے اور نہ اس کو مبنی بر انصاف کہا جا سکتا ہے۔

۱۸۹۵ء کے قانون میں طے کیا گیا کہ اگر عورت اپنے شوہر کے ظلم وستم کی وجہ سے اس کا گھر چھوڑ کر نکل جائے اور اس سے الگ رہے تو عدالت شوہر کو اس کے پاس جانے سے روک دے گی اور اسے نفقہ دلوائے گی۔ اور بچوں کو بھی اپنے پاس رکھنے کا مجاز قرار دے گی۔ اسی قانون میں یہ بھی طے کیا گیا۔ کہ اگر عورت اپنے شوہر کے بُرے برتاؤ یا تغافل کے سبب سے زنا کی مرتکب ہو تو اس کے خلاف طلاق کے لیے شوہر کا دعویٰ قابل سماعت نہ ہوگا! اس کے معنی پر غور کیجیے کہ شوہر کا ظلم ثابت کر کے عورت اس سے الگ جا رہے، شوہر کو پاس نہ پھٹکنے دے، خرچ کے لیے اس

روپیہ لے اور دوستوں کے ساتھ زندگی کا لطف اٹھائے۔ پھر شوہر اگر ایسی عورت سے پیچھا بھی چھڑانا چاہے تو نہ چھڑا سکے۔ یہ ہے وہ قانون ازدواج جو انیسویں صدی کے آخری دور میں انگلستان کے بہترین دماغوں نے پچاس برس کی پے در پے محنتوں سے مرتب کیا۔

۱۹۱۰ء میں طلاق اور ازدواجی معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا جس نے تین سال کی محنت کے بعد ۱۹۱۲ء کے اواخر میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں جو تجاویز پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) اسباب طلاق کے اعتبار سے مرد اور عورت دونوں کو مساوی قرار دیا جائے یعنی جن وجوہ کی بنا پر مرد طلاق کی ڈگری پانے کا مستحق ہے، انہی وجوہ کی بنا پر عورت بھی طلاق حاصل کرنے کی مستحق ہو۔ مثلاً اگر شوہر ایک مرتبہ بھی زنا کا مرتکب ہو تو عورت اس سے طلاق لے سکے۔

(۲) طلاق کے سابق وجوہ میں حسب ذیل وجوہ کا اضافہ کیا گیا: تین سال تک چھوڑے رکھنا۔ بدسلوکی۔ ناقابل علاج جنون جب کہ اس پر پانچ برس گذر چکے ہوں۔ شرابی پن کی ایسی لت جس کے چھوٹنے کی امید نہ رہی ہو۔ وہ قید کی سزا جو سزائے موت سے معاف کر کے دی گئی ہو۔

(۳) شرابی پن کی بنا پر تین سال کے لیے زوجین میں تفریق کرائی جائے۔ اور اگر اس مدت میں یہ لت نہ چھوٹے تو ضرر رسیدہ فریق کو طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق ہو۔

(۴) نکاح سے قبل اگر کسی فریق کو جنون یا امراض خبیثہ میں سے کوئی مرض ہو اور دوسرے فریق سے چھپایا گیا ہو، یا عورت حاملہ ہو اور اس نے اپنا حمل مخفی رکھا ہو تو اس کو فسخ نکاح کے لیے کافی وجہ قرار دیا جائے۔

(۵) مقدمات طلاق کی رپورٹیں دوران مقدمہ میں نہ شائع کی جائیں اور بعد میں عدالت روداد کے جن حصوں کو شائع کرنے کی اجازت دے صرف انہی کو شائع کیا جائے۔

ان تجاویز میں سے صرف پہلی تجویز کو جو سب سے زیادہ نامعقول تھی قبول کر کے سنہ ۱۹۲۳ء کے قانون معاملات ازدواج (Matrimonial Causes Act) میں شائع کیا گیا۔ باقی جتنی تجویزیں تھیں ان میں سے کسی کو بھی اب تک قانون کی صورت نہیں دی گئی کیونکہ کنٹربری کے اسقف اعظم (Archbishop of Canterbury) اور بعض دوسرے با اثر لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔

(انگلستان کے بہترین قانونی دماغوں کے تفقہ کا اندازہ اس سے کریجیے کہ وہ عورت اور مرد کے ارتکاب زنا کا قانونی اور فطری فرق تک سمجھنے سے قاصر ہیں۔ ان کی اس غلط قانون سازی کی بدولت عورتوں کی طرف سے اپنے شوہروں کے خلاف طلاق کے دعووں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ انگلستان کی عدالتیں ان سے پریشان ہوگئیں اور سنہ ۱۹۲۶ء میں لارڈ مری ویل (Lord Merrivale) کو ان کی روک تھام کی طرف توجہ کرنی پڑی۔

یورپ کے جن ممالک میں رومن چرچ کا اثر زیادہ ہے وہاں اب تک رشتۂ نکاح ناقابل انقطاع ہے البتہ بعض صورتوں میں قانونی تفریق ہوسکتی ہے جس کے بعد زوجین مل سکتے ہیں نہ آزاد ہو کر نکاح ثانی کر سکتے ہیں۔ آئرلینڈ اور اٹلی کے قوانین اسی قاعدہ پر مبنی ہیں۔

فرانس میں قانون ازدواج نے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انقلاب کے بعد طلاق کو نہایت آسان کر دیا گیا۔ نپولین کے قانون (Code Napoleon) میں اس پر چند پابندیاں عائد کی گئیں۔ سنہ ۱۸۱۶ء میں اس کو قطعاً ممنوع کر دیا گیا۔ سنہ ۱۸۸۴ء میں پھر اسے جائز کیا گیا، اور اس کے بعد سنہ ۱۹۰۷ء اور سنہ ۱۹۲۴ء میں اس کے لیے مختلف قوانین بنائے گئے جن کی رو سے طلاق کے لیے حسب ذیل وجوہ قرار دیے گئے ہیں:۔ زوجین میں سے کسی کا ارتکاب زنا، ظالمانہ برتاؤ، احدالزوجین کا کوئی ایسا فعل جس سے

اس کے ساتھی کی عزت پر حرف آئے، حقوق زوجیت ادا کرنے سے انکار، شراب خواری کی لت، عدالت سے کوئی ایسی سزا پانا جو موجب ذلت ہو۔ علاوہ بریں عدالت سے طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد عورت کے لیے تین سو دن کی مدت بھی مقرر کی گئی ہے جو اسلامی قانون کی ناقص تقلید ہے۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں قوانین طلاق ایک دوسرے سے بہت کچھ مختلف ہیں، مگر ناقص اور غیر متعدل ہونے میں سب متفق ہیں۔ آسٹریا، بلجیم، سوئیٹزرلینڈ اور ناروے میں زوجین باہمی رضامندی سے طلاق کی ڈگری حاصل کرسکتے ہیں، یہ خلع سے ملتی جلتی چیز ہے مگر اس کی ناقص نقل ہے۔ جرمنی میں زوجین میں سے کسی ایک کا دوسرے کو چھوڑ دینا اور اس سے بے تعلق ہو کر رہنا موجب طلاق نہیں تاوقتیکہ یہ فعل مسلسل ایک سال تک جاری نہ رہے۔ سوئیٹزرلینڈ میں اس کے لیے تین سال کی مدت ہے، اور ہالینڈ میں پانچ سال کی، دوسرے ممالک کے قوانین اس باب میں ساکت ہیں۔ مفقود الخبر کے لیے سویڈن میں ۶ سال کی مدت انتظار ہے اور ہالینڈ میں دس سال۔ دوسرے ممالک کے قوانین مفقود الخبر کے باب میں خاموش ہیں۔ مجنون کے لیے جرمنی، سویڈن اور سوئیٹزرلینڈ میں تین سال کی مہلت ہے۔ باقی کسی ملک کا قانون مجنون کے حق میں کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ بلجیم میں مطلقہ کے لیے دس مہینے کی مدت ہے، فرانس اور بلجیم کے سوا کہیں عورت کے نکاح ثانی کے لیے مدت انتظار مقرر نہیں کی گئی۔ آسٹریا میں احد الزوجین کا پانچ سال یا اس سے زیادہ کی سزائے قید پانا دعوے طلاق کے لیے کافی ہے۔ بلجیم میں مجرو سزایاب ہونا عورت یا مرد کو اپنے رفیق کے خلاف طلاق کی ڈگری حاصل کرنے کا حق دلا دیتا ہے۔ سویڈن اور ہالینڈ میں اس کے لیے حبس دوام کی شرط ہے۔

یہ ان قوموں کے قوانین ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں۔ مگر ان پر ایک نظر غائر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ان میں سے کسی کو بھی ایک مکمل اور معتدل قانون بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ان کے مقابلے میں اسلامی قانون کو جو شخص انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو تسلیم کرنا

پڑھیا کہ عدل توازن، فطرت انسانی کی رعایت، فتنوں کے سد باب، اخلاق کی حفاظت، تمدنی مصالح کی نگہداشت، اور نزاع و ضرار کی تمام امکانی صورتوں کا علاج کرنے میں اسلامی قانون جس کمال کو پہنچا ہے وہ مغربی قوانین کو نہ صرف فرداً فرداً بلکہ مجموعی حیثیت سے بھی نصیب نہیں ہوا، حالانکہ یہ قوانین انیسویں صدی کے "روشن" زمانے میں یورپ کے سینکڑوں ہزاروں علماء و عقلاء نے قریب قریب ایک صدی کے غور و خوض، چھان بین اور قانونی تجربات کے بعد وضع کئے ہیں، اور اُس قانون کو اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے عرب کا ایک اُمّی بادیہ نشین پیش کر گیا ہے جس نے اس قانون سازی میں کسی پارلیمنٹ، کسی کمیشن، کسی جماعت ماہرین سے مشورہ نہیں لیا۔

اس نمایاں اور عظیم الشان فرق کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی کہتا ہے کہ اسلامی قانون خدا کا نہیں انسان کا بنایا ہوا ہے تو ہم کہیں گے کہ ایسے انسان کو تو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس کی صداقت کا اس سے زیادہ بین ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس نے خود ایسے فوق البشری کارنامے کا کریڈٹ نہیں لیا اور صاف کہا کہ میں اپنے دل و دماغ سے کچھ بھی نہیں پیش کر سکتا، جو کچھ مجھے خدا سکھاتا ہے وہی تم تک پہنچا دیتا ہوں۔

مقالات

مسلم سوسائٹی

از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز۔ ہوم ڈپارٹمنٹ نئی دہلی

(۲)

(۱۰) انانیت۔

"جناب! اس تمام کامیابی کا ہمارے ہی سر سہرا ہے۔ اگر ہم یہ چال نہ سمجھاتے تو منہ کی کھائی ہوتی"۔

یعنی فضل ربانی مشیت ایزدی رحمت خداوندی کو اس میں کچھ دخل نہیں کسی دوسرے کی دوڑ دھوپ، یگ و دو کسی شمار میں نہیں، دنیا میں جو کامیابی ہوتی ہے، وہ بس انہی کی دانش الموداری کی بدولت اور جسے ناکامی ہوتی ہے وہ محض اس لیے کہ وہ ان کے اشارے پر نہ چلا تھا۔ قرآن کریم نے جب ان اقوام کا ذکر کیا ہے جو برباد اور ہلاک ہوگئیں تو منجملہ دیگر امور کے یہ بھی فرمایا ہے کہ:-

"جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہم کو پکارتا ہے اور جب ہم اس کو اپنی طرف سے کوئی نعمت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میری تدبیر سے ملا ہے۔۔۔۔۔۔ یہ بات ان لوگوں نے بھی کہی تھی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں سو ان کی کمائی ان کے کام نہ آئی۔۔۔ $\frac{۳۹}{۵۰-۴۹}$

یہی میں ہے جس کی وجہ سے انسان کے دماغ پر کبر و نخوت، فرعونیت نمرودکا بھوت سوار ہو جاتا ہے، اور پھر وہ کسی دوسرے انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتا، اور اس کا کوئی قدم زمین پر نہیں پڑتا۔

حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ   زمین میں اکڑ کر نہ چلو۔ یقیناً نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو

الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا۔ کُلُّ ذٰلِکَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا۔ ۱۷: ۳۷-۳۸ اور نہ ہی اکڑ کر پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتے ہو۔ یہ سب کچھ خدا کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور گناہ ہے۔

اسی انانیت سے انسان میں وہ جذبہ پیدا ہوجاتا ہے جسے ڈکٹیٹرشپ کہتے ہیں یعنے وہ کسی معاملہ میں کسی دوسرے کی رائے کو کچھ وقعت ہی نہیں دیتا۔ کسی سے کبھی مشورہ نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو منزہ عن الخطا سمجھنے لگتا ہے۔ اپنے ہر لفظ کو قانون کی حیثیت دیتا ہے، اور اگر سمجھتا ہے کہ کوئی اور بھی اپنے دماغ میں عقل و فکر رکھنے کا مدعی ہے تو اسے مدعی نبوت کی طرح دائرہ اسلام سے خارج سمجھتا ہے، حالانکہ باہمی مشاورت وہ چیز ہے جس کے لیے خاص طور پر تاکید کی گئی ہے کہ۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۳: ۱۵۸ اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کیجیے۔

(۱۱) تقدس جتانا۔

"نہیں بھئی اب میں سوؤں گا۔ صبح تہجد کے لیے اٹھنا ہے"

استغفار سحری تیرے اور تیرے رب کے درمیان معاملہ ہے۔ اس کا اشتہار دینے سے کیا فائدہ لیکن یہ محض اس لئے ہوتا ہے کہ عام انسانوں سے اپنا مرتبہ بلند بتایا جائے۔ یہ مرض بھی اتنا عام ہو رہا ہے کہ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں حاجی اور الحاج کی طرح نمازی اور المصلی بھی بطور لقب کے استعمال ہونا شروع نہ ہوجائے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

الَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ ۴: ۴۹ کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو مقدس بناتے ہیں مگر اللہ جس کو چاہے مزکی (دمقدس) بنائے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

(۱۲) منافقت۔

یہ عنوان بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے لیکن اس وقت اس کے صرف ایک گوشے پر روشنی ڈالی جائے گی جس کا تعلق سوسائٹی کی تعمیر و تخریب سے ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص تمام تجاویز میں آپکے ساتھ

ہے، ہر معاملہ میں آپ سے متفق ہے۔ ہر مشورہ میں پیش پیش ہے لیکن درپردہ وہ بھانپتا رہتا ہے کہ کونسی پارٹی زیادہ طاقتور ہے اور کامیابی کس کے ساتھ ہے۔ عین وقت پر آپ دیکھتے ہیں کہ وہ میدان عمل میں آپکے ساتھ نہیں۔ اگر آپ کو ناکامی ہوئی تو کہتا پھرتا ہے کہ میں نے تو پہلے ہی کہدیا تھا۔ اور اگر کامیابی ہوئی تو کوئی عذر یار دیش کر کے صفائی کرلی یقین مانئے کہ اس "ایمان" سے وہ "کفر" ہزار درجہ اچھا جو ظاہر و باطن میں ایک ہو۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں یہ "ہر خوش کن" طبقہ منافقین کہلاتا ہے، اور اللہ تعالی نے ان کا مقام اسفل السافلین طبقہ جہنم میں رکھا ہے۔ غداری وہ جرم ہے جو کبھی بخشا نہیں جاتا۔ وہ ہر مقام پر آپ کو اپنا دوست بتاتا ہے لیکن آپ کی تخریب و رسوائی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ قرآن کریم میں سینکڑوں مقامات پر اس طبقہ کا ذکر ہے۔ فرمایا:-

" بعض ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے جو یہ چاہتے ہیں کہ وہ تم سے بھی امن و امان میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی۔ جب کبھی ان کو شرارت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو وہ اس میں پھر جا گرتے ہیں۔ سو یہ لوگ اگر تم سے کنارہ کش نہ ہوں۔ اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں۔ اور نہ اپنے ہاتھوں کو روکیں۔ تو تم ان کو پکڑو۔ اور قتل کرو۔ جہاں کہیں پاؤ۔ اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دیدی ہے۔" $\frac{۴}{۹۱}$

دوسری جگہ انہی کے متعلق ہے:-

" اگر آپ کے لیے کوئی اچھی بات واقع ہوتی ہے تو ان کے لیے موجب غم بن جاتی ہے۔ اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آپڑتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو اسی لیے پہلے ہی اپنی احتیاط کا پہلو اختیار کرلیا تھا۔ اور یہ کہکر خوش ہو کر چلے جاتے ہیں۔" $\frac{۹}{۵۰}$

پھر اگر یہ لوگ کبھی اس غداری میں نظر کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کو چھپنے کے لئے کوئی آڑ نہیں ملتی تو ہزار رہزار قسمیں کھا جاتے ہیں۔ یقین مانیے ان قسموں کی پرکاہ کے برابر بھی قیمت نہیں ہے

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ۝ ۶۳/۲ انہوں نے اپنی قسموں کو (اپنی حفاظت کے لیے) سپر بنا رکھا ہے۔

اور اگر اس پر بھی کام نہیں بنتا تو جھٹ معافی مانگ لیتے ہیں اور اس کو بھی اپنی خوبی ظاہر کرتے ہیں کہ دیکھیے میں ضدی نہیں ہوں اگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے تو اعتراف قصور میں مجھے کبھی تامل نہیں ہوتا۔ یہ وہ حربہ ہے کہ جس کا جواب ہی نہیں۔ آپ اگر معاف نہ کریں دل سے نہ بھلائیں تو ساری دنیا آپ کو بدنام کرے گی۔ حالانکہ اگر آپ حقیقت پر غور کریں تو واضح ہو جائیگا کہ اس سے سہل ترکیب اور ہے ہی کوئی نہیں۔ جب تک جی چاہے عمداً اور ارادۃً ایک شخص کے خلاف پروپگنڈا کرتے رہیے۔ اس کی تذلیل و تحقیر میں ہر ممکن ذریعہ استعمال کر دیجیے اس کو نقصان پہونچانے کی در پردہ کوشش کیجیے اور جب کبھی دو شریف آدمیوں کے سامنے بات ہو تو جھٹ سے معافی مانگ لیجیے۔ آپ مومن کے مومن اور یہ نہ ماننے والا ضدی اور ہٹ دھرم۔ لیکن دیکھیے قرآن کریم نے قبول توبہ، عفو و درگذر کے لیے کیا شرط عائد کی ہے۔ فرمایا:-

اِنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ۵۴/۶ جو شخص تم میں سے بے سمجھے بوجھے کوئی برا کام کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اپنے آپ کی اصلاح بھی کر لے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تین شرطیں ہیں۔ قصور بے سمجھے بوجھے سرزد ہوا ہو نہ کہ جان بوجھ کر۔ توبہ دل سے کرے۔ پھر اپنی آیندہ روش سے ثابت کر دے کہ اس نے فی الواقع اصلاح کر لی ہے۔ تو معافی مل سکتی ہے۔ نہ یہ کہ دانستہ دوسرے کی تذلیل پر کمر باندھے رکھی۔ ہمیشہ غداری کی اور جب پکڑے گئے تو جھٹ معافی مانگ لی۔ یقین ہے یہ ایسا کیرکٹر ہے کہ اسلام میں اس کی کہیں گنجایش نہیں۔ قتل بھی اگر جہالت سے ہو جائے تو اس کی معافی ہو سکتی ہے لیکن وہ اگر عمداً ہو تو فجزاؤہ جہنم۔ دوزخ سے ورے ٹھکانا نہیں۔ اور ما لعنتنا انشد

من القتل۔ فتنہ پردازی تو قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ اگر یہ ارادۃً ہو تو اس کی معافی کیسی! خدا نہ کرے کہ کسی کو ایسے دوست مل جائیں۔

۱۴۔ استہزاء دینی۔

"مولانا کہاں ہیں بھئی"۔

"وہاں ہوں گے کسی گوشے میں۔ مُرا ایکسٹرا سائز میں چھپتے ہوئے۔"

تعلیم یافتہ طبقہ سے قوم کی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں لیکن ہمارے تعلیمیافتہ، روشن خیال طبقہ کی کسی محفل کا نظارہ دیکھیے، خدا، رسولؐ، قرآن، حشر، نشر، دوزخ جنت، نماز، روزہ، غرض اسلام کے عقائد اور شعائر میں سے ایک ایک پر پھبتیاں کسی جا رہی ہیں۔ فقرے صرف ہو رہے ہیں قہقہوں کے شور سے فضا گونج رہی ہے۔ کھیلنے کا کوئی نظریہ۔ ہزار غور و فکر کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے تو اپنا قصور فہم اور اس کی رفعت تخیل۔ مگر مذہبی شعار کی کوئی لم سرسری نظر میں بھی اپنے مذاق پر پوری نہ اترے تو نہ صرف ناقابل تسلیم بلکہ ہدف استہزاء و تمسخر۔ حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ۔

"اور اللہ تمہارے پاس یہ فرمان بھیج چکا ہے کہ جب احکام الٰہی کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا سنو تو ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھو جب تک وہ کوئی اور بات شروع نہ کر دیں کیونکہ ایسی حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے۔" ۴/۱۴۰

دوسری جگہ ہے۔

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جا۔ یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد ایسے لوگوں کے پاس مت بیٹھ۔" ۶/۶۸

اور ایسے لوگوں سے ربط و تعلق رکھنا تو کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ فرمایا:-

عہ ٹُمرتالی ایک صاحب کا وہ نشن سے کچھ [illegible] ، یہ جن ایکسٹرا کو [illegible] کیا جاتا ہے جا سے روشن خیال طبقہ میں [illegible] ایکسٹرا سائز کے نام سے یاد کیا جاتا

" اے ایمان والو۔ اہل کتاب میں سے وہ لوگ جو تمہارے دین سے ہنسی مذاق کریں اور
کفار اُن کو دوست مت بناؤ۔ ۵۷/۵

• دوستی کن سے رکھو ؟

تمہارے دوست تو اللہ۔ اور اس کے رسول اور وہ ایماندار لوگ ہیں جو نماز کی پابندی
کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔ اور ان میں خشوع ہوتا ہے" ۵۵/۵

۱۴۔ تعاون و عدم تعاون ۔

" بھائی! میں یہ خوب سمجھتا ہوں کہ تم حق پر ہو لیکن چونکہ ان کے ساتھ میرے تعلقات ہیں
اس لیے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔ ساتھ تو میں انہی کا دوں گا "

حالانکہ قرآن کریم کا فرمان ہے کہ۔۔

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اور
عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۳/۲ گناہ اور سرکشی کے معاملہ میں ایک دوسرے سے تعاون
مت کرو۔ اور ڈرو صرف اللہ ہی سے۔

۱۵۔ سرگوشیاں ۔

" دیکھو بھئی پارٹی کی عزت کا سوال ہے، یہ بات باہر اس وقت نکلے جب وہ جیل جا پہنچے "
محض پارٹی کی ناک رکھنے کی خاطر ایک بھائی کے خلاف یہ خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں، اور جو جو
ذرائع استعمال کئے جائیں گے ان میں جائز و ناجائز کا سوال ہی باقی نہیں اس لیے یہ باطنی فدائیوں کی
قسم کا جلسہ کیا جا رہا ہے، برعکس اس کے قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا اے ایمان والو کبھی گناہ اور سرکشی اور معصیت رسول
تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ کے لیے سرگوشیاں مت کیا کرو۔ اور ہمیشہ نیکی اور تقویٰ

وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْٓ اِلَیْہِ تُحْشَرُوْنَ ۔ ۵۸/۹
کی سرگوشیاں کیا کرو۔ اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس کی طرف تم کو جانا ہے۔

۱۶۔ رواج یا شریعت۔

جج۔ "تمہارا فیصلہ رواج کے مطابق کیا جائے۔ یا شریعت کے مطابق"۔

مدعی۔ "صاحب رواج کے مطابق۔ ہمارے ہاں شریعت کا دستور نہیں"۔

یہ سنا آپ نے کہ شریعت پر ترجیح دینے والے کون صاحب ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے خدا کا ان کو حکم ہے کہ:-

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۔ ۵۹/۴
اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان نزاع پڑ جائے تو اسے (تصفیہ کے لیے) خدا اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہ رواج کیا بلا ہے؟ وہی دستور و مراسم جن کی پابندی کفر کے زمانے میں ان کے آباؤ اجداد کرتے تھے، یا جن کو اسلام کے زمانے میں ان کے جاہل اسلاف نے جاری کیا تھا۔ قرآن کریم نے کفار کی یہ صفت بیان کی ہے کہ:-

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ خواہ ان کے باپ دادا نہ سمجھ رکھتے ہوں نہ ہدایت"۔ ۲/۱۷۰

بعینہٖ یہی بات آج وہ مسلمان کہتے ہیں جو رواج کے مطابق فیصلہ چاہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمان ہو کر اسلام کے خلاف فیصلہ طلب کرنا کہاں کا اسلام ہے۔ انہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا تھا کہ۔

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعوی کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو

آپ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے قبل نازل کی گئی ہیں۔ مگر اپنے مقدمات شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کو حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں، اور شیطان ان کو بہکا کر گمراہی کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔" ۴/۶۰

غیر مسلم عدالت تو انہیں اجازت دیتی ہے کہ اگر یہ چاہیں تو ان کا فیصلہ شریعت الٰہی کے مطابق کیا جائے اور یہ مسلمان ہونے کے مدعی شریعت کے خلاف رواج مانگتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر قیامت اور کیا ہوگی۔

متفرقات۔

حکایت دراز تر ہو گئی اس لیے اب چند اور خصوصیات مختصراً عرض کر دی جاتی ہیں جو اسلامی کیرکٹر کی جزئیات میں سے ہیں۔

(۱) خرچ میں میانہ روی اختیار کرو۔ نہ اسراف کرو نہ بخل ۱۷/۲۵-۲۹

(۲) پورا تولو معاوضہ پورا پورا دو۔ ۱۷/۳۵

(۳) برائی کو نیکی سے دفعہ کرو۔ ۲۳/۹۶ ظلم کا بدلہ لے سکتے ہو لیکن برابر کا۔ زیادتی نہ کرو اور اگر معاف کر دو تو اور بھی اچھا ہے۔ ۱۶/۱۲۶ و ۴۲/۳۹-۴۳

(۴) ماننے والے کے سامنے جھک جاؤ۔ منکر کے آگے سخت گیر ہو جاؤ۔ ۵/۵۴

(۵) فحش کاری خواہ علانیہ ہو خواہ پوشیدہ سب حرام ہے ۶/۱۵۲ جب چلو تو آنکھیں نیچی کر کے چلو ۲۴/۳۰ کیونکہ خدا آنکھ کی خیانت سے بھی واقف ہے ۴۰/۱۹

(۶) چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے میں تنگ دلی سے کام نہ لیا کرو۔ ۱۰۷/۷

(۷) توبہ کرنے والے، عبادت گزار، حمد کرنے والے، روزہ رکھنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیک باتوں کا حکم کرنے والے، بری باتوں سے روکنے والے اور حدود اللہ (قانون الٰہی) کی حفاظت کرنے والے، ایسے مومنین کو خوش خبری سنائیے ۹/۱۱۲

(۸) منویات سے منہ پھیرنے والے، وعدہ وفا کرنے والے۔ ۲۳/۱-۳

(۹) بغیر اجازت لیے دوسرے کے گھر میں نہ جایا کرو۔ جب کسی کے ہاں جاؤ تو اہل خانہ کو سلام کیا کرو۔ اور اگر اجازت نہ ملے تو واپس لوٹ آیا کرو۔ ۲۴/۲۷-۲۸

(۱۰) مسلمانوں کے دو گروہوں میں لڑائی ہو جائے تو صلح کرا دیا کرو۔ پھر ان میں سے اگر ایک گروہ زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرے۔ یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے پھر اگر رجوع ہو جائے تو دونوں کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کا خیال رکھو اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۴۹/۹

(۱۱) ایک دوسرے کی ہنسی مت اُڑاؤ، عیب جوئی مت کرو۔ ایک دوسرے کے بُرے نام مت ڈالو۔ بدگمانیوں سے بچا کرو۔ کیونکہ بعض بدگمانیاں (واقعی) گناہ ہوتی ہیں۔ اور دوسروں کی ٹوہ مت لگاتے رہا کرو۔ نہ کسی کی غیبت کرو۔ ۴۹/۱۱-۱۲

اب آخر میں یہ بھی سنتے جائیے کہ رسول اللہؐ کے نزدیک مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا۔

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

دوسری جگہ ہے۔ "ایک مسلمان کا خون۔ مال۔ اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہے"

خدا اور رسول کے ان ارشادات مقدس کو سامنے رکھیے اور۔ باز بگوشتن بگر۔ پھر دیکھیے کہ ہماری سوسائٹی میں آج کون کون سے عیوب موجود ہیں، اور صحیح اسلامی سوسائٹی کی وہ کون کون سی خصوصیات ہیں جن سے یہ عاری ہے یقین مانئے کہ قومی فلاح و بہبود کے لیے جس قدر کوششیں کی جا رہی ہیں وہ کتنی ہی مبارک و مسعود کیوں نہ ہوں کبھی بار آور نہیں ہو سکتیں جب تک مسلمانوں کی اجتماعی تشکیل حیات ان خطوط پر نہ ہوگی جو قرآن کریم اور اسوۂ نبی اکرمؐ نے تجویز فرمائے ہیں ایک دفعہ مسلم سوسائٹی ان خطوط مستقل پر

مشکل ہو جائے تو پھر دیکھیے کہ مسلمان کس طرح اس شجرِ طیب کی طرح کہ۔

اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ جس کی جڑیں مضبوط جمی ہوئی اور شاخیں آسمان کو چھو رہی ہوں۔

دین و دنیا کے معاملات میں برومند و بارآور ہوتے ہیں۔

دگر بشاخِ گل آویز و آب و نم در کش
پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی۔ (اقبال)۔

مرآۃ المثنوی

مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ۔

مثنوی مولانا روم کا بہترین ایڈیشن جس میں مثنوی شریف کے منتشر مضامین کو ایک سلسلہ کے ساتھ اس طور پر مرتب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا مولانا کے مدعا اور ان کی تعلیم کو بڑی آسانی سے سمجھتا چلا جاتا ہے کئی انڈکس اور فہرستیں بھی ہیں جنکی مدد سے آپ حسب منشا جو شعر چاہیں نکال سکتے ہیں۔ ایک بسیط فرہنگ بھی ملحق ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب نے مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسی سہولت مہیا کر دی ہے کہ ایک شخص بڑی آسانی سے کتاب کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتا ہے۔ کاغذ کتابت بہترین جلد نہایت اعلیٰ قیمت ۸ انگریزی للعہ عثمانیہ

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے

اجرِ رسالت

از جناب مولنا عبداللہ العمادی

(۱)

"اَجْر" اور "اُجرت" دونوں یکساں ہیں، ایک ذرا سا فرق یہ ہے کہ ثواب آخرت کے لیے اَجْر اور اعمال دنیا کے بدل و عوض کو اجرت کہتے ہیں۔

دنیا اجر اعمال و مزدکردار کی خوگر ہے، جو کام کرتی ہے اجرت کے لیے کرتی ہے، جو بوجھ اٹھاتی ہے اس کی مزدوری مانگتی ہے، صدیوں پیشتر خواجہ شیراز نے اس کے اصول بھی مرتب کر دیے تھے کہ

ہر عمل اجرے و ہر کردہ جزاے دارد

اگرچہ خود اپنی حد تک اُنہیں یہی شکایت رہی کہ۔

ہر خدمتے کہ کردم بے مزد بود و منت

یارب مباد کس را مخدوم بے عنایت

لیکن جو پاک ہستیاں زمین کو آسمان کا پیغام سناتی ہیں ان کی اور ہی دنیا ہے۔

دونوں عالم کے سوا تیسرے عالم میں رہے

ان کا "مخدوم بے عنایت" نہیں کام کی اجرت اُنھیں بھی ملتی ہے، مگر کائنات سے نہیں! ان کی نظر آفریدگار کائنات پر ہوتی ہے، اللہ کا پیام سناتے ہیں۔ اللہ ہی کا کام کرتے ہیں۔ اور اسی سے دام لیتے ہیں

(۲)

نوح علیہ السلام کی داستان سنیے، سورۂ یونس میں ہے۔

حضرت نوح کی اجرت | وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ — ان لوگوں کو نوح کی خبر پڑھ سناؤ۔

اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ۔ — وہ خبر جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ :۔

يٰقَوْمِ اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ — اے میری قوم اگر میرا ٹھیرنا اور اللہ کی نشانیوں کو یاد

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا — دلاتے رہنا تم پر گراں گزرا تو میں نے اللہ ہی پر بھروسہ

اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ — کرلیا ہے اب تم بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ل کے اپنی

عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ — بات ٹھیرالو، اور اس طرح ٹھیرالو کہ تم سب پر کچھ ڈھکی

چھپی نہ رہے، اس کے بعد تمھیں جو کرنا ہے میرے حق میں کرڈالو اور مجھے انتظار میں نہ رکھو۔

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ — اگر تم منہ موڑ بیٹھے تو میں نے تم سے کچھ مزدوری تو مانگی نہ تھی

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۔ — میری مزدوری تو اللہ ہی پر ہے۔

وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ — اور مجھکو حکم ملا ہے کہ میں اہل اسلام ہی کے زمرہ میں رہوں

سورۂ شعراء میں ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۔ — نوح کی قوم نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ — یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے بھائی نوح نے کہا تھا

اَلَا تَتَّقُوْنَ ، اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ، فَاتَّقُوا — کیا تم لوگ ڈرتے نہیں، میں تمہارے لیے ایک امانت دار

اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۔ — پیغمبر ہوں، اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۔ — میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ — میری اُجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۳)

ہود علیہ السلام کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اسی سورۂ شعراء میں ہے :۔

حضرت ہود کی اجرت | كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ۔	قوم عاد نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ ۔	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا
أَلَا تَتَّقُونَ ۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ۔	کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ تمہارے لیے میں ایک امانت دار پیغمبر ہوں اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ	میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔	میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

سورہ ہود میں بھی یہی قصہ ہے:—

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۔	قوم عاد کی طرف ہم نے انہیں کے بھائی ہود کو بھیجا تھا
قَالَ: يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۔	ہود نے کہا: اے میرے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، تمہارا معبود اس کے سوا اور کوئی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نرے باندھنو باندھنے والے ہو،
يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا	اے میرے لوگو اس پر میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي	میری اجرت تو بس اسی کے ذمہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔
أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔	کیا تم لوگ عقل سے بھی کام نہیں لیتے۔

(۴)

صالح علیہ السلام پر نظر کیجیے:—

حضرت صالح کی اجرت | كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ	قوم ثمود نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے ان کے بھائی صالح نے کہا تھا۔

أَلَا تَتَّقُونَ. إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا	کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تو تمہارے لیے ایک امانتدار
اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ۔	پیغمبر ہوں اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ	میں تم لوگوں سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔	میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۵)

حضرت لوطؑ کی اجرت | لوط علیہ السلام کا قصہ پڑھیے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ الْمُرْسَلِينَ۔	قوم لوط نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے ان کے بھائی لوط نے کہا تھا۔
أَلَا تَتَّقُونَ؟ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا	کیا تم لوگ ڈرتے نہیں؟ میں تمہارے لیے ایک امانتدار
اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ۔	پیغمبر ہوں۔ اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ	میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔	میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

(۶)

حضرت شعیبؑ کی اجرت | شعیب علیہ السلام کے مذکورے عبرت حاصل کیجئے:

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ۔	اصحاب الایکہ (یعنی بن باسیوں) نے پیغمبروں کو جھٹلایا۔
إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ	یہ اس وقت کی بات ہے جب ان سے شعیب نے کہا تھا۔
أَلَا تَتَّقُونَ؟ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا	کیا تم ڈرتے نہیں، میں تمہارے لیے ایک امانت دار
اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ۔	پیغمبر ہوں، اب تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔
اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ میری اجرت تو بس پروردگار عالم ہی کے ذمہ ہے۔

یہ تمام تصریحیں قدمائے انبیا (علیہم الصلوٰۃ والسلام) سے تعلق رکھتی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اہل دنیا سے تبلیغ حق کی اجرت کا طالب نہ ہوا۔ اب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو آیات بینات ہیں، ان میں تفقہ فرمائیے، اور دیکھیے کہ سورۂ یوسفؑ میں تذکیر واقعات کے بعد آنحضرت صلوٰۃ اللہ علیہ سے کیا خطاب ہوتا ہے۔

(۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی انبیاء سابقین کی طرح بندوں سے اجرت کے خواہاں نہیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ یہ غیب کی خبریں ہیں کہ تمہارے پاس ہم نے ان کی وحی بھیجی ہے۔

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ۔ تم تو وہاں حاضر بھی نہ تھے جب وہ اپنے معاملہ میں متفق ہو چکے تھے۔ اور داؤ پیچ میں سرگرم تھے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ اکثر لوگ خواہ تمہیں کتنی ہی خواہش ہو، ایمان لانے والے نہیں

وَمَا تَسْئَلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ حالانکہ اس پر تم کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے۔
اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِيْنَ۔ تمام جہان کے لیے یہ تو صرف یاد دلانے کی چیز ہے۔

سورۂ فرقان میں ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا۔ تمہیں تو ہم نے خوش خبری دینے والے اور ڈرانے والے ہی کی حیثیت میں بھیجا ہے۔

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ تم ان سے کہدو کہ میں اس پر تم سے کسی طرح کی اجرت نہیں مانگتا

اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۔ بجز اس کے کہ جس کا جی چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ

"کسی طرح کی کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ جس کا جی چاہے اپنے پروردگار تک پہنچنے کا راستہ اختیار کرے۔" اس سے بھی ایک طرح کی دنیاوی اجرت کا احتمال ممکن تھا، اس لیے دوسری آیۃ میں اس احتمال کا بھی ازالہ کر دیا، سورہ سبا ملاحظہ ہو:۔

(۸)

سوال امت ہی کے لیے تھا

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۔ کہو کہ میں نے تم سے جو اجرت مانگی تھی (یعنی یہ کہ جی چاہے تو اللہ کی راہ پر چلو) تو یہ بھی تمہارے ہی لیے ہے (میری ذات کے لیے کوئی اجرت نہیں)۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۔ میری اجرت تو اللہ ہی پر ہے جو ہر چیز کا شاہد ہے۔

خاتمہ سورہ صٓ میں ہے۔

قُلْ مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۔ کہو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا اور نہ میں کلفت اٹھانے والوں میں ہوں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ یہ تو تمام جہان کے لیے ایک یاد دلانا ہے۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۔ حقیقت میں کچھ وقت کے بعد تمہیں اس کی خبر لگے گی۔

سورۂ انعام میں اگلے پیغمبروں کا تذکرہ کر کے آنحضرت علیہ السلام کو مخاطب فرمایا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۔ یہ وہ لوگ تھے کہ اللہ نے ان کو ہدایت فرمائی تھی اب تم بھی ان کی ہدایت پر چلو۔

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۔ ان لوگوں سے کہو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۔ یہ تو تمام جہان کو محض یاد دلانے کے لیے ہے۔

سورۂ طور میں حضرت کو تذکیر کا حکم دیا ہے اور پھر استفہام فرمایا ہے کہ دشمنان اسلام کیا آپ کو
اور ایسا کہتے ہیں ۔ اسی ضمن میں ایک آیت استفہامیہ یہ بھی ہے :۔
سْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ کیا تم ان سے کوئی اجرت مانگتے ہو کہ وہ اس بارگراں سے دبے جاتے ہیں

—— (۹) ——

کی شان | مفاد کلام یہ ہے ۔

(۱) دعوت حق و تبلیغ اسلام پیغمبروں کا فریضہ ہے، اس فرض کے ادا کرنے کی کوئی اور کسی طرح
جرت نہ پیغمبروں نے اہل دنیا سے لی، نہ اس کے طالب ہوئے، نہ یہ ان کے شایان شان تھی، اس
ت کا اجر اللہ کے ذمہ تھا، اللہ کے بندوں سے اس کا واسطہ نہ تھا۔
(۲) کلام اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ خصوصیت اور بھی روشن کر دی دوسرے
وں کے حق میں اگر ایک دو آیتیں اتریں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے کہیں زیادہ
ب فرمایا گیا اور بار بار اس کی تشریح و توضیح کی گئی ۔
کچھ اہل وحی و تنزیل ہی تک یہ شان محدود نہیں اللہ کے دوسرے نیک بندے بھی اللہ کے کام کی اجرت
نا پر معمول رکھتے ہیں ، سورۂ یٰسین میں ہے ۔

—— (۱۰) ——

ءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اس نے کہا
ِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ اِتَّبِعُوْا مَنْ لَّا اے میری قوم رسولوں کی پیروی کرو اُن رسولوں کی
لُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۔ پیروی کرو جو تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتے اور خود وہ ہدایت پر ہیں
سورۂ کہف میں موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان بزرگ کا قصہ بیان کیا ہے جن کی نسبت :۔ عَبْدًا
ْ عِبَادِنَا اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا ۔ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ۔ (ہمارے بندوں میں سے

ایک بندہ جسے اپنے پاس سے ہم نے کچھ رحمت (اور اپنے ہی پاس سے کوئی خاص علم دیا تھا) وارد ہے، اس ضمن میں فرمایا۔

(۱۱)

اجرت کا نام آتے ہی جدا ہوگئے | فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَآ اَتَیَآ اَهْلَ قَرْیَةِ اسْتَطْعَمَآ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَبَیْنِكَ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا۔

موسیٰ اور وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ جب ایک آبادی والوں کے پاس پہنچے تو وہاں کے لوگوں سے کھانے کو مانگا، انھوں نے ان کو ضیافت دینے سے انکار کیا، وہاں انھیں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی، اللہ کے اس بندے نے اس دیوار کو درست کر دیا، موسیٰ نے کہا: تم چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لیتے، اللہ کے اس بندے نے جواب دیا کہ بس یہ مجھ میں تم میں جدائی ہے۔ البتہ جن (چیزوں پر) تم سے صبر نہ ہو سکا میں ابھی اس کا مطلب بتائے دیتا ہوں۔

(۱۲)

اجرت لینے سے انکار | اس کے بعد ذو القرنین کا بیان ہے کہ قوم جب ان سے درخواست کرتی ہے اور اس کی پذیرائی کے لیے ترغیب دلاتی ہے کہ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا؟ (کیا ہم آپ کے لیے کچھ محصول مقرر کر دیں) تو وہ اس سے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ مَا مَكَّنِّیْ فِیْهِ رَبِّیْ خَیْرٌ (میرے پروردگار نے جس چیز میں مجھے تمکین بخشی ہے وہی میرے لیے بہتر ہے)۔

(۱۳)

ردّ ہدیہ | اجرت درکنار سبا سے جب ہدیہ آتا ہے تو وہ بھی واپس کیا جاتا ہے کہ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ؟

لہ خرج: الاتاوۃ و فسّرہ الفرّاء با لاجر۔

فَمَآ اٰتٰىنِیَ اللّٰهُ خَیْرٌ مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِیَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ. کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنی چاہتے ہو؟ مجھے اللہ نے جو دیا ہے وہ تمہارے دنے سے بہتر ہے، اپنے ہدیہ سے تمہیں کو فرحت ہو رہی ہے؛

انبیاء مرسلین کی شان تو بہت بالا، بہت ہی اعلیٰ ہے" سورۂ دہر میں ابرار اسلام و اتقیاء توحید کی شان دکھائی ہے۔

(۱۴)

مسلمان کی شان اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا	حقیقت میں نیک کردار لوگ کافوری مزاج کے پیالے سے پئیں گے، یہ اللہ کے بندے ایک ایسے چشمے سے پیتے ہوں گے جسے جہاں چاہیں گے جاری کر سکیں گے۔
(۱) یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ	(۱) وہ وفائے نذر کریں گے۔
(۲) وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا	(۲) اس دن سے ڈریں گے جس کی چنگاری پھیلی ہوئی ہوگی
(۳) وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا۔	(۳) کھانے کی محبت رکھتے ہوئے بھی مسکین و یتیم و اسیر کو کھانا کھلائیں گے۔
(۴) اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ	(۴) (کھلائیں گے اور کہیں گے) درحقیقت اللہ ہی کا مونھ کر کے ہم تمھیں کھلاتے ہیں۔
(۵) لَا نُرِیْدُ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا	(۵) نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر۔
(۶) اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا۔	(۶) ہم تو اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اس دن کا خوف کرتے ہیں جو بہت ہی خشک اور سخت دن ہوگا۔
فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْیَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا	اس کردار کی بنا پر اللہ نے ان لوگوں کو اس دن کے شر سے بچا لیا، تازگی و خوشی سے ان کو ملا دیا اور جیسی

جَنَّةً وَّحَرِيْرًا۔ استقامت کی تھی ویسی ہی جزا بھی دی، رہنے کو بہشت پہننے کو حریر۔

(۱۵)

مودت فی القربیٰ | سورۂ شوریٰ میں نزول فی الکتاب، اقامت میزان، قرب قیامت، حرث دنیا و آخرت، شرک فی الشرع، کلمۃ الفصل، عذاب الیم، عمل صالح، فضل کبیر، و ما یحذو حذوہ کی طرف اشارات کر کے ارشاد ہوتا ہے:

ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۔

یہ وہی ہے جس کی بشارت اللہ اپنے اُن بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور (خالی ایمان ہی نہیں) نیک کام بھی کئے ان سے کہو کہ میں اس پر کوئی اجرت تم سے طلب نہیں کرتا بجز اس کے کہ "قربیٰ" میں مودت رکھو اور جو کوئی نیکی کرے گا اس کے لیے ہم اس نیکی میں اور بھی خوبی بڑھا دیں گے۔

مودت تو ایک طرح کی محبت ہوئی، "قربیٰ" سے یہاں کیا مراد ہے؟

ایک جماعت "قربیٰ" کو خاندانی قرابت پر محمول کرتی ہے اور "مودت فی القربیٰ" سے اہل بیت نبوی کے ساتھ الفت و محبت رکھنے کی تاکید مراد لیتی ہے کہ یہی ان کے نزدیک اجر رسالت ہے۔

(۱۶)

اہل بیت کی مودت لازم ہے | مودت اہل بیت ایک مومن و مسلم کی حیات اسلامی کا لازمہ ہے، شعار ایمان ہے، شان حق ہے، اثر تقوی ہے، جس میں کسی کو کلام نہ ہونا چاہیئے مسلّمات سے انکار شیوۂ فجار رہے ابرار مومنین و اتقیائے مخلصین کا یہ شیوہ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ جس پیغمبر کے اہل بیت پہ ہر نماز میں درود بھیجیں انھیں اہل بیت کی مودت کے منکر ہوں، اعاذنا من ذالک بفضلہ۔

محال سخن اس میں نہیں محل نظریہ ہے کہ آیت شریفہ سے کیا نمایاں ہو رہا ہے؟

(۱۷)

طلب اجر ایک طرف تبلیغ دین ودعوت اسلام کی دنیاوی اجرت ممنوع قرار پاتی ہے، اللہ ہی پر اس کا اجر محوّل کیا جاتا ہے، دوسری جانب اُسی تبلیغ کی یہ اجرت مانگی جاتی ہے کہ میرے اہل بیت سے مودت رکھو۔

فاستثناء المودۃ من الاجر دلیلٌ علیٰ انّ النبی صلی اللّٰہُ علیہ وسلم طلب الاجر علیٰ تبلیغہ الوحی وذٰلک غیر جائز لما جاء حکایۃ عنہ وعن سائر الانبیاء۔

یہ کہنا کہ میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا" اور پھر "مودت فی القربیٰ" کو اس سے مستثنیٰ کر دینا، اس کے تو یہ معنے ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ وحی کی اجرت طلب فرمائی، مگر یہ تو جائز نہیں، کلام اللہ میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق بار بار اس کی تصریح کی گئی ہے اور باقی پیغمبروں کی نسبت بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔

فانّ التبلیغ واجب علی الرسول لقولہ تعالیٰ:۔ یٰاَیُّھَا الرّسول بلّغ مَا انزل الیك فان لم تبلّغ فما بلغت رسالتہ، واللہ یعصمك من الناس۔

بات یہ ہے کہ پیغمبر پر تبلیغ تو واجب ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے پیغمبر تجھ پر جو نازل ہوا ہے اس کی تبلیغ کر، اگر تو نے تبلیغ نہ کی تو فرض رسالت ہی ادا نہ کیا، لوگوں سے اللہ تجھے بچائے گا۔

وطلب الاجر علیٰ اداء الواجب لایلیق بالمروۃ بل قد یوجب التھمۃ ونقصان الحشمہ

ایک امر واجب کو ادا کرنا اور پھر اس پر اجرت مانگنا یہ تو شایان مردمی نہیں، اس سے تو بعض اوقات شبہہ پیدا ہو سکتا ہے اور حشمت رسالت میں کمی آ سکتی ہے۔

(۱۸)

قربیٰ کے معنی اس بحث کو ملتوی کر کے پہلے "قربیٰ" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

قربیٰ اصل میں قرب سے ماخوذ ہے جو بعد کی جانب مقابل ہے، کلام اللہ میں اس مادہ کا اطلاق

متعدد معانی پر ہوا ہے۔

(۱) قرب مکانی، مثلاً:۔ ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ۔

(۲) قرب زمانی مثلاً:۔ اقترب للناس حسابھم

(۳) حظ و کامیابی مثلاً:۔ قربات عند اللہ۔

(۴) رعایت، مثلاً: فانی قریب أجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔

(۵) قدرت، مثلاً:۔ ونحن اقرب الیہ منکم۔

(۶) نسبت، باتفاق مفسرین آیۂ کریمہ میں "قربی" سے یہی مراد ہے۔

ومن ھذا المعنی ما اخبر بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن ربہ:۔	اسی ذیل میں حدیث قدسی ملاحظہ ہو۔
من تقرب الی شبرا تقربت الیہ ذراعا	جو ایک بالشت مجھ سے قریب ہوا میں ایک ہاتھ اس کے
فقرب العبد من اللہ عز وجل قربہ	قریب ہو گیا اللہ کے ساتھ بندہ کا قرب یہ ہے کہ وہ
بالذکر والعمل الصالح لا قرب الذات	اللہ کو یاد کرتا رہے اور نیک کام کیا کرے، قرب ذاتی
والمکان، وقرب اللہ من العبد قرب	و قرب مکانی مراد نہیں، اللہ کا بندے سے قریب ہونا
نعمہ والطافہ وبرّہ واحسانہ الیہ	یہ ہے کہ اللہ کی نعمتیں اس سے قریب ہوں، اللہ اس پر
وترادف منہ عندہ۔	متواتر مہربانی کرتا رہے۔
ومن ذلک ما فی الحدیث:۔	اور دوسری حدیث میں ہے:۔
سددوا وقاربوا	سداد اختیار کرو۔ قرب حاصل کرو۔
ای اقصدوا فی الامور کلھا واترکوا	مطلب یہ ہے کہ تمام امور میں اقتصاد و میانہ روی
الغلو فیھا والتقصیر۔	کو اپنا شعار بناؤ، غلو و کوتاہی اور افراط و تفریط کو چھوڑ دو

یت کی تفسیر ابو جعفر النحاس نے آیۂ کریمہ کی تفسیر نہایت متانت کے ساتھ کی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہا

فی ھذہ الآیۃ اربعۃ اقوال :- اس آیت کے چار مطلب بیان کیے گئے ہیں۔

۱۔ قُل لّا اسألکم علیہ اجراً قل لا اسألکم علی الایمان جُعلاً الا ان تودونی لقرابتی وتصدقونی وتمنعوانی۔

(۱) "کہو کہ میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا" یعنی کہو کہ ایمان لانے کا کوئی محصول تم سے نہیں مانگتا بجز اس کے کہ بربنائے قرابت مجھ سے مودت رکھو، میری تصدیق کرو، اور میری حفاظت کرتے رہو۔

فنعل ذٰلک الانصار رحمھم اللہ، و منعوا منہ عن انفسھم واولادھم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار نے یہی کیا، جیسی اپنی جان اور اولاد کی حفاظت کرتے تھے ویسی ہی آپ کی حفاظت کی۔

ثم نسختھا :- قل ما سألتکم من اجرٍ فھو لکم، ان اجری الا علی اللہ۔

بعد کو یہ آیت اتری ہے "کہو کہ میں نے تم سے جو اجرت مانگی تھی وہ تمہارے ہی لیے تھی، میرا اجر تو اللہ ہی کے ذمہ ہے"۔ اس آیت نے آیت مودت فی القربیٰ کو منسوخ کر دیا۔

۲۔ ومذھب عکرمۃ انھا لیست بمنسوخۃ، قال: کانوا یصلون ارحامھم فلما بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم قطعوہ، فقال لا اسألکم علیہ اجراً الا ان تودونی و تحفظونی لقرابتی ولا تکذبونی۔

(۲) عکرمہ کا مذہب یہ ہے کہ آیت مودۃ فی القربیٰ منسوخ نہیں، ان کا بیان ہے کہ عرب صلۂ رحم کے خوگر تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو قطع رحم کر بیٹھے، اس حالت میں آنحضرت علیہ السلام نے فرمایا، میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا بجز اس کے کہ مجھ سے مودت رکھو، قرابت کی بنا پر میری حفاظت کرتے رہو، اور میری تکذیب نہ کرو۔

(۳) وفی روایۃ قیس ..... قال لما انزل اللہ تعالیٰ (۳) قیس کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب

حدثنا سعيد عن قتادة قال قال الحسن في قوله قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة في القربى قل لا اسألكم على ما جئتكم به وعلى هذا الكتاب اجرا الا المودة في القربى الا ان تودّدوا الى الله بما يقربكم اليه وعمل بطاعته.

سعید نے قتادہ کے ذریعہ سے حسن کی یہ حدیث روایت کی کہ "کہو میں تم سے اس پر کوئی اجرت نہیں مانگتا، البتہ مودۃ فی القربیٰ کا خواست گار ہوں" اس آیہ کا مطلب یہ ہے کہ میں جو شریعت تمہارے پاس لایا ہوں اور یہ جو قرآن تمہارے لیے اترا ہے میں بجز اس کے اور کوئی اجرت اس کی نہیں مانگتا کہ عمل سے عبادت سے اور ان چیزوں سے جو عبادت تم کو قریب کرنے والی ہوں اللہ کے ساتھ مودۃ پیدا کرو اور اس کی محبت کے [illegible] بنو۔

عن معمر عن قتادة في قوله تعالى قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة في القربى الا ان تودّدوا الى الله فيما يقربكم اليه.

معمر نے قتادہ نے آیت شریفہ "میں اس پر تم سے بجز مودۃ فی القربیٰ کے اور کوئی اجرت نہیں مانگتا" کی یہ تشریح کی کہ میں بجز اس کے اور کسی بات کا خواہاں نہیں ہوں کہ جو باتیں اللہ سے تم کو قریب کرنے والی ہیں ان کے ذریعہ تم اللہ کے دوست بنو۔

حقوق الزوجین

(۴)

قضاءِ شرعی طلاق اور خلع کی بحث میں قانونِ اسلامی کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ یہ قانون اس قاعدۂ کلیہ پر وضع کیا گیا ہے کہ عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق اگر قائم رہے تو حدود اللہ کی حفاظت اور مودت و رحمت کے ساتھ قائم رہے جس کو قرآن میں امساک بالمعروف کے جامع لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اگر اس طرح ان کا باہم مل کر رہنا ممکن نہ ہو تو تسریح باحسان ہونا چاہیے یعنی جو میاں بیوی سیدھی طرح مل کر نہ رہ سکتے ہوں وہ سیدھی طرح الگ ہوجائیں اور ایسی صورتیں پیدا نہ ہونے پائیں کہ ان کے تعلقات سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی تلخ ہو بلکہ خاندانوں میں فتنے برپا ہوں، سوسائٹی میں گندگی پھیلے، اخلاقی مفاسد کی اشاعت ہو اور آیندہ نسلوں تک ان کے برے اثرات متعدی ہوجائیں۔ انہی خرابیوں کا سد باب کرنے کے لیے شریعت نے مرد کو طلاق کا اور عورت کو خلع کا حق دیا ہے تاکہ اگر وہ چاہیں تو خود تسریح باحسان کے اصول پر عمل کرسکیں لیکن بہت سی ایسی جھگڑالو طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جو نہ امساک بالمعروف پر عمل کرسکتی ہیں اور نہ تسریح باحسان پر آمادہ ہوتی ہیں نیز ازدواجی معاشرت میں ایسی صورتیں بھی پیش آجاتی ہیں جن میں زوجین کے درمیان یا تو حقوق کے باب میں اختلاف واقع ہوتا ہے یا امساک بالمعروف اور تسریح باحسان دونوں پر عمل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ اس لیے شریعت نے طلاق اور خلع کے علاوہ ایک تیسرا طریقہ بھی حقوق کے تصفیہ اور حدود کی حفاظت کے لئے مقرر کردیا ہے جس کا نام قضاء شرعی ہے۔

قبل اس کے کہ ان مسائل کو بیان کیا جائے جو قضاءِ شرعی سے تعلق رکھتے ہیں چند اصولی مباحث کی توضیح ضروری ہے۔

قضاء کے لیے اولین شرط قضاء شرعی کی جو شرائط تفصیل کے ساتھ کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ قاضی لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ اس کی ایک وجہ تو وہی ہے جس کو فقہا نے بتصریح بیان کیا ہے، یعنی یہ کہ اصول شرع کے تحت شرعی مسائل میں مسلمانوں پر غیر مسلم حاکم کا حکم خواہ ظاہراً نافذ ہو جائے مگر باطناً نافذ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر ایک غیر مسلم حاکم ایک مسلمان کا نکاح فسخ کرے تو خواہ اس کا یہ حکم احکام شرع کے مطابق ہی کیوں نہ ہو، اور زوجین میں عملاً تفریق ہی کیوں نہ ہو جائے، لیکن درحقیقت نہ اس کے فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہوگا اور نہ شرعاً عورت کے لیے دوسرے شخص سے نکاح کرنا جائز ہوگا۔ اگر وہ نکاح کرے گی تو اس کا نکاح باطل ہوگا اور اسلامی شریعت کی نگاہ میں اس کی اولاد ناجائز ہوگی۔ ممکن ہے کہ اس وجہ کو آج کل کی ذہنیتیں محض وہمی (Sentimental) قرار دے کر رد کر دیں، لیکن اگر مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کیا گیا ہے کہ ان کے شخصی معاملات خود انہی کے شخصی قانون Personal law کے مطابق چکائے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے شخصی قانون کے قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ کو غیر اسلامی قانون کے نظریات کی بنا پر ساقط کر دیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جن مسائل کا تصفیہ قاضی کے فیصلہ پر چھوڑا گیا ہے ان کے لیے اگرچہ شریعت میں مفصل قوانین موجود ہیں لیکن شخصی معاملات میں ہر مقدمہ کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر ان قوانین کی صحیح تعبیر و تنقید، اور اصول قانون سے حسب موقع جزئیات کا استنباط، اور روح قانون کے مطابق فصل خصومات کے لیے شرائط کا لحاظ، یہ سب کے لیے ممکن نہیں کہ قاضی میں قوت اجتہاد اور اس کے ساتھ اعتقاداً اس قانون کا احترام بھی موجود ہو جس کو نافذ کرنے کے لیے وہ منصب قضاء پر مامور ہوا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں اسی شخص میں متحقق ہو سکتی ہیں جو نہ صرف مسلمان ہو، اسلامی قانون کے اصول و فروع پر حاوی ہو، اس کی سپرٹ کو اچھی طرح سمجھتا ہو، اس کے اصل مآخذ پر دسترس رکھتا ہو، اور مسلم سوسائٹی کے نظام ترکیبی سے اندرونی طور پر بھی واقف ہو۔ ایک غیر مسلم جج میں ان صفات کا پایا جانا کسی طرح ممکن نہیں اور اس وجہ سے یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ مسلمانوں کے شرعی قضایا کا صحیح فیصلہ کر سکے گا۔

ہندوستان میں قضاءِ شرعی نہ ہونے کے نقصانات

ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے جن کا انتخاب علماء کے گروہ میں سے کیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا، اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود و اختیار میں داخل کر دیے گئے۔ اس کا پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اصول شریعت کے مطابق جس چیز پر "قضائے شرعی" کا اطلاق ہوتا ہے وہ قریب بالکلیہ مفقود ہو گئی، اور مسلمانوں کے لیے اپنے شرعی معاملات میں ان عدالتوں سے ایسا فیصلہ حاصل کرنا غیر ممکن ہو گیا جو ان کے مذہب کی رو سے جائز شرعی فیصلہ کہا جا سکتا ہو۔ دوسرا نقصان (جو اہمیت میں پہلے نقصان سے کسی طرح کم نہیں) یہ ہے کہ ان عدالتوں کے پاس نہ وہ ذرائع ہیں جن سے وہ قانون اسلامی کے اصول و فروع پر اتنی وسیع نظر بہم پہنچا سکتے ہوں کہ ان میں صحیح قوت اجتہاد پیدا ہو جائے، اور نہ ان کے دل میں اس قانون کا اتنا احترام موجود ہوتا ہے کہ اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو تأمل ہو۔ ان کے علم کا مدار جن کتابوں پر ہے وہ ایسے مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں جو عربی سے ناواقف تھے قانون کے اصلی ماخذ سے بے بہرہ تھے اور اصطلاحات قانون تک کو سمجھنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے۔ مثلاً ہیملٹن (Hamilton) جس نے ایک فارسی شرح کی مدد سے ہدایہ کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ وہ غریب ہدایہ کو سمجھنے کی قابلیت ہی نہ رکھتا تھا، اور فقہ کی معمولی اصطلاحات میں بھی اس نے اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ اکثر مقامات پر اصل ہدایہ کی طرف رجوع کیے بغیر اس کی عبارت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اور بیلی (Baillie) جس کا Digest of Mohammadan Law فتاویٰ عالمگیری کے اقتباسات کے ترجمے سے ماخوذ ہے۔ اور میکناٹن (Macnaghton) جس کی کتاب Principles of Mohammadan Law ناقص معلومات اور اس پر ناقص فہم و تعبیر کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ انگریزی عدالتیں خود اپنے غیر

معلومات کی اس تنگی کا اعتراف کرتی ہیں، چنانچہ جسٹس مارکبی[۱] ایک مقدمہ کے فیصلہ میں لکھتا ہے:-

"شرع اسلام کو معلوم کرنے کے جو ذرائع عدالت کو حاصل ہیں وہ اس قدر تنگ اور محدود ہیں ..... کہ میں اس سے تعلق رکھنے والے مسائل کے تصفیہ سے بچنے کے ہر طریقہ کو اختیار کرنے پر بخوشی آمادہ ہوں۔"

مگر ایسی محدود معلومات کے ساتھ یہ عدالتیں اسلامی قانون میں اجتہاد کرنے کی جرأت کرتی ہیں اور اس کے حدود سے تجاوز کرنے میں ان کو کوئی تامل نہیں ہوتا کیونکہ نہ اس قانون کا احترام ان کے عقائد میں داخل ہے، اور نہ حکومت سلطہ کے نظام عدلیہ کی طرف سے ان پر کوئی ایسی پابندی عائد کی گئی ہے کہ وہ اس قانون کے حدود سے تجاوز نہ کرسکیں۔ ایک مقدمہ[۲] کے فیصلہ میں جسٹس گارتھ نے جو الفاظ لکھے ہیں وہ ان عدالتوں کی صحیح پوزیشن کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہیں۔

"قانون اسلام جس کی طرف ہمیں توجہ دلائی گئی ہے اور جو قدیم کتابوں میں مندرج ہے اب سے صدیوں پہلے بغداد اور دوسرے اسلامی ممالک میں جاری ہوا تھا جن کے قانونی اور تمدنی حالات ہندوستان کے حالات سے بالکل مختلف تھے۔ اگرچہ ہم ایسے مقدمات میں جو مسلمانوں کے درمیان ہوتے ہیں حتی الامکان احکام شرع اسلامی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اول تو یہی معلوم کرنا مشکل ہے کہ دراصل وہ احکام کیا تھے، پھر ان اختلافات میں توفیق دینا بھی مشکل ہے جو اکابر مجتہدین یعنی امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کے درمیان بکثرت پیش آئے ہیں۔ اس لیے امکانی حد تک ہمیں اس صحیح اصول کو دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے جس پر کوئی حکم مبنی ہو۔ اور پھر قواعد انصاف، نیک نیتی اور دوسرے ملکی قوانین اور تمدنی حالات کو پیش نظر رکھ کر اسے نافذ کرنا چاہیے۔"

---

[۱] خواجہ حسین بنام شہزادی ہزاری بیگم۔ [۲] ملک عبدالغفور بنام ملکا۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایک حاکم عدالت جو اسلامی قوانین سے اپنی ناواقفیت کا معترف ہے اور اختلافات ائمہ میں توفیق دینے کا اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، وہ اسلامی قوانین پر اس ناقص علم کے ساتھ اجتہاد سے کام لینے کو علانیہ جائز ٹھیراتا ہے، اور اُسے ایک عدالتی فیصلہ میں یہ بات ظاہر کرتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہوتا کہ وہ مسلمانوں پر اسلامی قانون کو نافذ کرنے میں صرف اسلامی قانون ہی کے حدود کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ دوسرے قوانین ملکی اور تمدنی حالات، اور قواعد انصاف کے متعلق خود اپنے نظریات کا لحاظ کرنا بھی اس کے لیے ضروری ہے۔ یہ اسی اجتہاد بلا علم و تقوی کا نتیجہ ہے کہ جو ادھورا اور ناقص قانون محمڈن لا کے نام سے ہمارے ملک کی عدالتوں میں متداول ہے اس کا بھی ٹھیک ٹھیک نفاذ ہمارے شرعی معاملات میں نہیں ہوتا اور عدالتی فیصلوں سے اس کی صورت روز بروز مسخ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

اصلاح کی راہ میں پہلا قدم پس معاملات نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق اسلامی قوانین کی توضیحات کرنے اور قانونی وسائل سے ان کو عدالتوں میں رائج کرانے سے پہلے حکومت سے یہ اصول تسلیم کرا لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کے شرعی مقدمات کا تصفیہ مسلمان حاکم کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ اگر حکومت مسلمانوں کے لیے قضائے شرعی کے اس پرانے طریقے کو پھر سے زندہ کر دے جو ۱۷۷۲ء سے ۱۸۶۴ء تک برٹش انڈیا میں قائم تھا۔ اور جس پر اب بھی فلپائن، جاوا، تونس، الجزائر، شام، فلسطین، یوگوسلاویا، پولینڈ، اور دوسرے اسلامی ممالک میں غیر مسلم حکومتیں عامل ہیں، تو اس سے بہتر کوئی بات نہیں، لیکن اگر حکومت کو اس میں تامل ہو تو مسلمانوں کی شرعی مشکلات کو دور کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مذہب مالکی کے مطابق ہر ضلع میں تین مسلمانوں کی ایک پنچایت مقرر کی جائے جس کے ارکان پر عموماً اس ضلع کے مسلمانوں کو اعتماد ہو اور جن میں سے کم از کم ایک رکن مستند عالم دین ہو۔ پھر ایک مخصوص قانون کے ذریعہ سے اس پنچایتی نظام کو تسلیم کرایا جائے جس میں اس امر کی تصریح ہو کہ مسلمانوں کے معاملات نکاح و طلاق وغیرہ میں پنچایت کے فیصلوں کی حیثیت عدالتی فیصلوں کی سی ہوگی، اور انگریزی عدالتوں میں اس کے خلاف کوئی چارہ جوئی نہ ہو سکے گی

وہ خود انگریزی عدالتیں ہیں۔ جو مقدمات نکاح و طلاق وغیرہ تجویز ہوں گے، ان کو بھی پنچایتوں کی طرف منتقل کر دیا جائے گا۔[1] برٹش انڈیا کے علاوہ غیر مسلم ریاستوں، اور ان اسلامی ریاستوں میں بھی جنہوں نے انگریزی حکومت کی تقلید میں قضائے شرعی کو موقوف کرکے شرعی معاملات کو عام دیوانی عدالتوں کے دائرۂ سماعت میں داخل کر دیا ہے، اصلاح معاملات کے لیے سب سے پہلے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یا تو قضائے شرعی کا بندوبست کیا جائے، یا پھر پنچایتی سسٹم قائم کرکے اس کو از روئے قانون تسلیم کرایا جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا مجالس وضع قوانین میں کسی مسودۂ قانون کو پیش اور پاس کرا لینا اسلامی اغراض کے لیے ہرگز سود مند نہ ہوگا۔

ایک جدید مجموعۂ قوانین کی ضرورت انضمام قضاء شرعی کے ساتھ ایک اور چیز بھی ضروری ہے، اور وہ ایک ایسے کتابچہ کی تدوین ہے جس میں مسلمانوں کے شرعی معاملات کے متعلق فقہی احکام کو دفعات کی شکل میں تشریحات سمیت مرتب کر دیا جائے، تاکہ عدالتوں یا پنچایتوں میں موجودہ انگریزی محمڈن لا کی جگہ اس کو رواج دیا جا سکے۔ مصر میں جب (Mixed Tribunals) قائم کیے گئے تھے تو وہاں بھی ایسے ایک مجموعۂ قوانین (Code) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی جس میں نہایت مستند مآخذ سے تمام ضروری قوانین کو جامع مرتب کر دیے گئے ہوں۔ چنانچہ حکومت مصر کے ایماء سے قدری پاشا کی صدارت میں علماء کی ایک مجلس نے اس کام کو انجام دیا، اور اس مجلس کے مرتب کیے ہوئے مجموعہ کو سرکاری طور پر تسلیم کرکے عدالتوں میں رائج کیا گیا۔[2] ضرورت ہے کہ ہندوستان میں بھی ایک ایسی مجلس مقرر کی جائے جس میں ہر گروہ کے

---

[1] حنفیہ کے نزدیک پنچایت کا فیصلہ قضاء قاضی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا، لیکن اگر حکومت وقت کی طرف سے ان پنچایتوں کے اختیار سماعت کو تسلیم کر لیا جائے اور انھیں اپنے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے ضروری اختیارات دیے جائیں تو مذہب حنفی کے مطابق بھی ان کے فیصلے قضاء شرعی کے حکم میں ہوں گے۔

[2] اس مجموعہ کا ترجمہ فرنچ زبان میں Droit Mussulman کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور مصر کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک کی عدالتوں میں بھی اس سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

چند علما، چند ماہرین قانون کے ساتھ مل کر ایک مفصل ضابطہ، ضروری تشریحات کے ساتھ مرتب کریں اس ضابطہ کو ابتداءً ایک مسودہ کی شکل میں شائع کر کے مختلف جماعتوں کے علما کی رائے دریافت کی جائے پھر ان آرا اور تنقیدات کا مناسب لحاظ کر کے اس پر نظر ثانی کی جائے، اور جب یہ ضابطہ اپنی آخری صورت میں مرتب ہو جائے تو مجالس قانون ساز میں ایک ایکٹ کے ذریعہ سے یہ طے کر دیا جائے کہ آئندہ سے مسلمانوں کے شرعی معاملات کے لئے اسی مجموعہ کو محمڈن لا کی مستند کتاب قرار دیا جائے گا اور اس کے خلاف کسی عدالت کے سابق نظائر یا محمڈن لا کی کسی کتاب کے بیانات قابل اعتبار نہ ہوں گے۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب ہماری کتب فقہ میں تمام مسائل تفصیل کے ساتھ موجود ہیں تو ایک نیا مجموعہ مرتب کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ اعتراض صرف ممکن ہی نہیں بلکہ ایک گروہ کی ذہنیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یقین ہے کہ اس تجویز کی ضرور مخالفت کی جائے گی، اس لیے ہم اختصار کے ساتھ وہ وجوہ بیان کرتے ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک یہ کام ضروری ہے۔

یہ بات تو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل منتشر ہیں، قدیم طرز بیان وانداز ترتیب پر لکھے ہوئے ہیں، اور ایسی زبان میں ہیں جس سے اس ملک کے قانون پیشہ اصحاب اور حکام عدالت عموماً واقف نہیں ہیں۔ آج کل کے لوگوں کو نہ اتنی فرصت کہ کسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے مبسوطات کی طرف مراجعت کر سکیں، نہ اتنی استعداد کہ ان کو سمجھ سکیں۔ ایسی حالت میں جب کوئی پیچیدہ مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ مجبور ہوتے ہیں کہ علما سے فتوی لیں۔ فتوی کی صحت کا مدار اس پر ہے کہ مفتی کے سامنے مقدمہ کی پوری روداد ہو اور وہ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر شرعی حکم بیان کرے۔ لیکن بہت کم معاملات میں اس طرح فتوے حاصل کئے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ ہر فریق کے وکلا صورت مقدمہ کو اپنی اغراض کے مطابق ڈھال کر مفتی کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور مفید مطلب فتوی حاصل کر کے عدالتوں کے سامنے لے جاتے ہیں، جن سے درحقیقت اغراض انصاف کے لیے کوئی رہنمائی نہیں ہو سکتی

ان خرابیوں کا علاج ایک مستند مجموعہ قوانین کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔

لیکن اس سے زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ قدیم فقہی کتابوں میں جتنے احکام بیان کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر عام انسانی حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ان احکام کو لفظ بلفظ لے کر ہر جگہ ہر معاملہ پر بے تکلف جاری کر دینا اصلاً غلط ہے۔ ان کی صحیح تنفید موقوف ہے اس پر کہ:

اولاً جس اسلامی جماعت میں ان کو نافذ کیا جا رہا ہے اس کی اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالت کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ ان کے اجتماعی عادات و خصائل اور رسم و رواج کس قسم کے ہیں، وہ کس ماحول میں جیتے ہیں، اس ماحول کے ان پر کیا اثرات ہیں، ان کی سیرت اور ان کے معاملات میں اسلام کا اثر کس قدر قوی یا ضعیف ہے، بیرونی اثرات سے ان کے اسلامی خصائص میں کس قدر فرق واقع ہوا ہے اور عام تمدنی حالات سے معاملات کی فقہی حیثیت میں کیا تغیرات رونما ہوئے ہیں۔

ثانیاً ہر مقدمہ کے مخصوص انفرادی حالات پر نظر رکھی جائے، فریقین کی سیرت، عمر، تعلیم، جسمانی حالات، معاشی و تمدنی حیثیت، گذشتہ تاریخ، خاندانی روایات اور ان کے طبقہ کی عام حالت سب پر نگاہ ڈال کر رائے قائم کی جائے کہ ایک خاص جزئی معاملہ میں ان پر قانون کا نفاذ کس طریقہ سے کیا جائے جس سے قانون کا مقصد بھی ٹھیک ٹھیک پورا ہو جائے، اور اصول قانون سے انحراف بھی نہ ہونے پائے۔

ان دونوں پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اگر کوئی شخص فقہ کی کسی پرانی کتاب میں سے ایک جزئیہ نکالے اور آنکھیں بند کر کے اس کو ہر اس مقدمہ میں جو اس جزئیہ سے تعلق رکھتا ہو چسپاں کرتا چلا جائے تو اس کی مثال اس طبیب کی سی ہوگی جو بقراط اور جالینوس کے نسخے لے کر بیٹھ جائے، اور ملک کی آب و ہوا، موسم، مریضوں کے مزاج، اور امراض کی جداگانہ کیفیتوں سے آنکھیں بند کر کے ان نسخوں کو برتنا شروع کر دے۔ حکمائے قدیم کے مرتب کئے ہوئے نسخے اپنی جگہ نہایت صحیح اور حکیمانہ سہی، مگر وہ

اس لیے کب مرتب کیے گئے تھے کہ جاہل عطار ان کو برتیں؟ انہیں استعمال کرنے کے لیے بھی علم، تجربہ، حکمت اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے۔ بالکل اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے شریعت کے قواعد اور اساسی احکام سے جو جزئی مسائل مستنبط کئے ہیں وہ اپنی جگہ نہایت درست سہی لیکن یہ بات تو ان بزرگوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ ہوگی کہ ان اجتہادی احکام کو تفقُّہ اور تدبُّر کے بغیر اس طرح استعمال کیا جائے گا جیسے ڈاک خانہ کی مہر کو ایک جاہل چپراسی ہر لفافہ پر لگاتا چلا جاتا ہے۔

قانون اسلام ایسے حکیمانہ اصول پر بنایا گیا تھا کہ اس کے ماتحت کسی مرد یا عورت کا مجبوراً بد اخلاقی میں مبتلا ہونا، یا سوسائٹی میں موجب فتنہ وفساد بن جانا قریب قریب محال تھا، اور یہ تو بالکل ہی ناممکن تھا کہ اس قانون کی کسی سختی سے مجبور ہو کر کوئی مسلمان عورت یا مرد دائرۂ اسلام سے نکل جائے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں میں نہ صرف بے شمار خاندانی جھگڑے بلکہ سخت اخلاقی مفاسد، حتیٰ کہ ارتداد تک کے واقعات محض اس وجہ سے رونما ہو رہے ہیں کہ اکثر معاملات میں قانون اسلام کے تحت لوگوں کے لیے صحیح اور عادلانہ فیصلہ حاصل کرنا محال ہو گیا ہے۔ تفقہ اور تدبر نہ مفتیوں میں ہے نہ حکام عدالت میں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ہم ایک عام حکم کو جس ملک، جس سوسائٹی اور جس خاص مقدمہ میں نافذ کر رہے ہیں اس کی کون کونسی خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر اس حکم کے عموم میں اصول شریعت کے ماتحت تخصیص کرنے کی ضرورت ہے تاکہ شریعت کے مقاصد میں سے کوئی مقصد فوت نہ ہونے پائے اور اصول میں کسی اصل کی خلاف ورزی لازم نہ آئے۔ جہاں تک حکام عدالت کا تعلق ہے ان کی معذوری تو ظاہر ہے، رہے علماء، تو ان میں سے بعض تو اس سے زیادہ کی استعداد ہی نہیں رکھتے کہ قدیم کتب فقہ میں جو جزئیات جس عبارت کے ساتھ لکھے ہوئے ہیں ان کو ٹھیک اسی عبارت کے ساتھ نکال کر پیش کر دیا کریں۔ اور بعض کو اگرچہ اللہ تعالیٰ نے وسعت نظر اور تفقہ فی الدین سے سرفراز کیا ہے، لیکن فرداً فرداً ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں کہ کسی مسئلہ میں تفقہ سے کام لے کر کسی قدیم

جزئیہ کی عبارت سے یک سرِ مو بھی انحراف کر جائیں، کیونکہ ایک طرف خود انھیں اپنے مبتلائے غلط ہونے کا خوف اس جرأت سے باز رکھتا ہے اور دوسری طرف یہ خوف دامنگیر ہوتا ہے کہ دوسرے علما کی طرف سے ان پر غیر مقلدیت کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اس کا علاج بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہر صوبے کے جلیل القدر اور با اثر علما کی ایک جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے اور اجتماعی قوت و اثر سے کام لے کر شرعی معاملات کے لیے ایسا ضابطہ بنائے جو مسلمانانِ ہند کی موجودہ اخلاقی تمدنی اور معاشی حالت سے مناسبت رکھتا ہو اور جس میں اتنی لچک بھی ہو کہ مخصوص انفرادی حالات میں اصول کے تحت جزئی احکام کے اندر مناسب تغیر کیا جا سکے۔

اگر کوئی شخص اس طریقہ کو "غیر مقلدیت" قرار دیتا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے، وہ نہیں سمجھتا کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید اور انبیاء کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جانتا کہ جاہل کی تقلید اور عالم محقق کی تقلید میں کیا فرق ہونا چاہیے۔ اسے اتنا شعور بھی نہیں کہ کسی مذہب فقہی کا اتباع کرنے کے معنی کیا ہیں۔ اس نے تقلید کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ اپنے مذہب فقہی کو بمنزلۂ دین، اور اس مذہب کے امام کو بمنزلۂ نبی، اور اس کے مسائل کو نصوص کتاب اللہ کی طرح منزل سمجھا جائے، اور یہ بات عقیدہ کے طور پر دل میں بٹھالی جائے کہ اس مذہب کے کسی مسئلہ میں اصلاح ترمیم اور اضافہ تو درکنار اس پر تحقیق اور تنقید کی نظر ڈالنا بھی گناہِ عظیم ہے اور کسی مسئلہ میں اس مذہب کے کسی جزئیہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب فقہی سے کوئی جزئیہ اخذ کرنا زمانۂ اجتہاد یعنی چوتھی صدی ہجری تک تو حلال تھا مگر اس کے بعد حرام ہو گیا لیکن اس طرح کی تقلید علمائے سلف میں سے کسی سے بھی ثابت نہیں، اور نہ اس کے لیے کوئی شرعی ثبوت کہیں سے مل سکتا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ کے تلامذہ نے سینکڑوں مسائل میں اپنے امام سے اختلاف کیا اور اس کے باوجود وہ حنفیت سے خارج نہ ہوئے۔ علمائے احناف نے امام اعظم اور ان کے تلامذہ کے اختلافات میں سے بعض کو بعض پر ترجیح دی اور بعض کو ترک کر کے بعض کو مفتیٰ بہ قرار دیا مگر اس تحقیق و تنقید کے باوجود کوئی ان کو

غیر مقلد نہیں کہہ سکتا۔ چوتھی صدی ہجری سے لیکر آٹھویں اور نویں صدی تک کے علمائے احناف متقدمین کے اجتہادی مسائل میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تغیر وتبدل کرتے رہے اور حسب ضرورت دوسرے ائمہ مجتہدین کے دوسرے مذاہب سے مسائل اخذ کرکے ان کے مطابق فتوے دیتے رہے مگر کسی نے اس اجتہاد پر غیر مقلدیت کا حکم نہیں لگایا کسی میں یہ جرأت نہیں کہ ابو اللیث سمرقندی شمس الائمہ سرخسی، صاحب ہدایہ، قاضی خان، صاحب کنز، علامہ شامی اور ایسے ہی دوسرے علماء کو محض اس بنا پر غیر مقلد کہدے کہ انھوں نے مذہب حنفی کے مسائل میں اپنے زمانے کے حالات وضروریات کے لحاظ سے لچک پیدا کی اور جن معاملات میں اس مذہب کے بعض احکام کو موجب ضرر یا عام حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ناقابل عمل پایا ان میں دوسرے مذاہب فقہیہ کے مطابق فتوی دیا، اور اس بات کو مذہب حنفی کے اصول میں داخل کرلیا کہ بوقت ضرورت مذہب غیر پر حکم اور فتوی دینا جائز ہے بشرطیکہ اس میں اتباع ہوا نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ اگر لوگ بطور خود اپنی ضرورتوں کے مواقع پر دوسرے مذاہب کے مطابق عمل کرنے یا خود اپنے مذہب کی رخصتوں سے فائدہ اٹھانے میں آزادی برتیں تو اندیشہ ہے کہ اس سے اتباع ہوا اور تلفیق خارق اجماع اور تتبع رخص مذاہب اور تلاعب بالدین کا دروازہ کھل جائے گا اور معاملات میں سخت ابتری پیدا ہو گی لیکن اگر علمائے دین تقویٰ اور نیک نیتی کے ساتھ باہم مشورہ کرکے مسلمانوں کی ضروریات اور حالات کا لحاظ کرتے ہوئے ایسا کریں، تو اس میں کسی دینی یا دنیوی نقصان کا اندیشہ نہیں بلکہ اگر کسی مسئلہ میں نادانستہ ان سے غلطی بھی ہو تو نصوص صریحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حق تعالیٰ ان کو معاف فرمائے گا اور ان کی نیک نیتی کا ان کو اجر دے گا۔ اس راستہ کو اختیار کرنے میں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی خطرہ ہے کہ ایک جماعت ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو گی اور ان کے متبعین میں سے بھی ایک گروہ ان سے بدظن ہو جائے گا لیکن اس سے بڑا خطرہ اس راستہ کے

اختیار نہ کرنے میں ہے اور وہ یہ ہے کہ جب مسلمان اپنی ضرورتوں سے تنگ آکر قانون اسلامی کے بجائے ہوائے نفس کا اتباع کریں گے اور ان میں تلاعب بالدین اور حدود اللہ کی خلاف ورزی اور دینی اخلاق کی خرابی، اور کفر و معصیت کی وبائیں پھیلینگی اور عیسائی قوموں کی طرح وہ بھی اپنے مذہب کے قانون کو چھوڑ کر انسانی قوانین کو اختیار کرلیں گے، تو قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اسی لیے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو؟ کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسی لیے تھی کہ تم اس کو لیے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں؟ ہم نے اپنے دین کو یُسر بنایا تھا تم کو کیا حق تھا کہ اسے عُسر بنا دو؟ ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا، تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟ اس بازپرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔ البتہ جہلاء کو یہ جوابدہی کرنے کا موقع ضرور مل جائے گا کہ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّونَا السَّبِيْلَا رَبَّنَا اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا۔

یہ ضمنی بحثیں چونکہ ضروری اور اہم تھیں اور ان کا تفصیلی بیان ناگزیر تھا اس لیے ان کو اتنی جگہ دینی پڑی اس کے بعد ہم اپنے اصل بحث کی طرف رجوع کریں گے۔

(باقی)۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

مصنفہ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترجمہ جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(۳)

نماز اور قربانی میں باہمی مناسبت ۱۰۔ نماز اور قربانی میں بہت سے پہلو ہیں قرآن نے ان سب کی طرف اشارے کیے ہیں لیکن یہاں ان سب کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتاب المفردات میں پوری تفصیل ملے گی۔ اس جگہ ہم ان دونوں کے صرف ان پہلوؤں کا تذکرہ کریں گے جن سے ان کی باہمی مناسبت واضح ہو۔

ہر چند قرآن نے ان کو تصریح کے ساتھ نہیں بیان کیا ہے لیکن جو شخص قرآن کی آیات اور ان کے کلمات کے باہمی نظم پر غور کرے گا وہ کسی طرح ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ غور کے لیے اصلی چیز قرآن کے حسن نظم کا یقین ہے۔ اور تعجب ہے کہ جس قرآن میں یہ آیت بھی موجود ہے۔

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔ (محمد ۲۴)۔ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے چڑھے ہیں۔

اس پر غور و فکر کرنے سے کوئی شخص کیوں کر بے پروا ہو سکتا ہے۔

اس تمہید سے مقصود یہ ہے کہ یہاں صرف یہ بات کہ خدا نے نماز اور قربانی کا ایک ساتھ ذکر

کیا ہے، ہم کو دعوت دیتی ہے کہ ہم ان دونوں کی باہمی مناسبت پر غور کریں۔ اسی اشارے نے ہمارے سامنے بے شمار حقایق حکمت کی راہ کھول دی ہم اس فصل میں ان کو بیان کرتے ہیں تاکہ ایک طرف آیت کا حسن نظم واضح ہو، اور دوسری طرف ان حقائق کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکیں کہ قرآن کی جو سورتیں اپنے الفاظ کے اعتبار سے ایک قطرہ کی حیثیت رکھتی ہیں، اپنے معانی کے اعتبار سے بحر بے کراں ہیں۔ ذیل میں ان دونوں کی باہمی مناسبت کے تمام پہلوؤں کی تفصیل کی جاتی ہے۔

۱۔ نماز اور قربانی میں اسی طرح کی مناسبت ہے، جس طرح کی مناسبت ایمان اور اسلام میں ہے، یہ اجمال ہے: اس کی تفصیل سے پہلے ایک مختصر تمہید سن لینی چاہیے :۔

دین کی بنیاد علم و عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں۔ اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت اور شکر کی ایک قلبی کیفیت وحالت پیدا ہوتی ہے، اسی قلبی کیفیت سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح گویا علم و عمل میں وہی تعلق ہے جو اثر اور موثر، ظاہر اور باطن میں ہوتا ہے۔ یعنی علم باب ایمان سے ہے، اور عمل باب اسلام سے ہے!

پھر ایک دوسری حقیقت پر غور کرو! عمل جس طرح علم کا مقابل ہے، اسی طرح قول کا مقابل ہے یعنی قول، علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول ارادہ کا اولین ظہور، اور عمل کا عنوان و دیباچہ ہے۔ اس تمہید کی روشنی میں، نماز اور قربانی کے باہمی تعلق پر غور کرو۔

نماز ظاہر ہے کہ قول و اقرار ہے، یہ اٹھنا، بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا، انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے؟ یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا قول و اقرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد، راہ اطاعت میں ہمارا پہلا قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے، اسی لیے یہ تمام شریعت کے دروازہ کا عنوان قرار دی گئی ہے۔ بکثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، مثلاً۔

الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ جو غیب میں ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں۔

تفسیر سورۂ فاتحہ میں اس پر مفصل بحث گذر چکی ہے۔

حضرت ابراہیم کے قصہ میں اس حقیقت کی پوری تشریح ہے۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو، اس کی صفت توحید کے ساتھ پہچان لینے کے بعد فرمایا:-

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (انعام-۷۹) میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کرلیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔

نماز اسی توجہ الی اللہ کی عملی تصویر ہے۔ اسی وجہ سے ہماری نمازوں کا عنوان یہی مبارک کلمہ قرار پایا۔ یہی حقیقت حضرت موسیٰ کے قصہ میں بھی موجود ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو توحید کی معرفت بخشنے کے بعد فرمایا:-

فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِكْرِیْ۔ (طٰہٰ-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴) پس جب وہ اس کے پاس آیا، ندا آئی، اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں پس اپنے جوتے اتار دو تم وادی مقدس طویٰ میں ہو، اور میں نے تم کو برگزیدہ کیا پس جو کچھ وحی کی جائے اس پر کان دھرو۔ میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو اور میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔

ایک دوسرے مقام پر ابطال شرک کے بعد فرمایا۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ اپنا رخ یکسو ہو کر اطاعت الٰہی کی طرف سیدھا کر دو یہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا،

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (روم ۳۰۔۳۱)

اس میں فطرت الٰہی کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہے یہی فطرت کا سیدھا دین ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اس کی طرف متوجہ ہوکر، اور اسی سے ڈرو اور نماز قائم کرو، مشرکین میں سے نہ بنو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ۔ (بنی اسرائیل ۴۴)

ساتوں آسمان اور زمین، اور جو ان میں ہیں اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور ہر شئے اس کے حمد کی تسبیح پڑھتی ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ۔ (نور ۴۱)

نہیں دیکھتے کہ جو آسمان و زمین میں ہیں، سب اللہ کی تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور چڑیاں قطار در قطار، ہر ایک نے اپنی نماز اور تسبیح جان لی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تمام اعمال میں سے، نماز ایمان سے سب سے زیادہ اقرب، بلکہ ایمان کا اولین فیضان ہے۔ یہ بیک وقت توحید، انابت، شکر، توکل اور تبتل الی اللہ کا شیرازہ اور تمام مخلوقات الٰہی کی فطرت ہے۔

اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو! قربانی حقیقت اسلام کی جامع ہے۔ اسلام کا مفہوم، اطاعت، سرفگندگی، اور نفس کو بالکلیہ سونپ کے حوالہ کر دینا ہے۔ نماز کی طرح یہ بھی بندوں کی فطرت ہے، کیونکہ تمام مخلوق امر الٰہی کی اطاعت سے وجود میں آئی ہے۔ خدا نے کلمۂ "کن" کے ذریعہ حکم دیا اور تمام مخلوق بہ خلقت میں اس کلمہ کی اطاعت سے وجود میں آئی۔ اب اگر وہ خدا کی نافرمانی کرے، تو اپنی فطرت

کی خلاف ورزی کرے گی۔ اس اعتبار سے اسلام تمام کائنات کو محیط ہے۔

وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (آل عمران ۸۳) آسمان اور زمین میں جو ہیں، سب طوعاً و کرھاً اسی کے سامنے سرفگندہ ہیں اور اسی کے پاس سب لوٹائے جائیں گے

یعنی بدء خلقت میں تم نے اس کے امر کی تعمیل کی، اسی طرح آخرت میں تم اس کے حکم پر دوڑو گے۔

چنانچہ فرمایا ہے۔

اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖ مِّنَ الْاَرْضِ اِذَاۤ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ (روم ۲۵) جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک بار پکارے گا دفعۃً تم نکل کھڑے ہوگے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

فَتَسْتَجِیْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا۔ (بنی اسرائیل ۵۲) اور تم اس کی حمد کے ساتھ اس کی پکار پر دوڑو گے اور گمان کروگے کہ نہیں تم ٹھیرے مگر بہت کم۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام اور تسبیح و سجدہ اور نماز دونوں عین فطرت اور باہم گر نہایت قریبی رشتہ دار ہیں۔

جب حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا امام، ان کی مسجد کو ہمارا قبلہ اور ان کے طریقہ کو ہمارے لیے دستور العمل بنایا تو ایک واقعہ بیان کرکے قربانی کی حقیقت بھی آشکارا کر دی جس سے ضمناً نماز کے باطن پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا۔

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ۔ . . . . میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں، وہ میری رہبری فرمائیگا۔ (یعنی میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرتا ہوں، وہ مجھپر اپنی راہ کھولے گا)۔

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اے پروردگار مجھے صالحین میں سے بخش۔ (یعنی اولا

صالح، تاکہ میں ان کو لیکر تیری راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لیے حق و ہدایت کی راہ باز ہو)۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ۔ . . . . . پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی ولادت کی بشارت

دی (یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی۔ اسمٰعیل کے معنی ہیں: "اللہ نے سُنا" چونکہ ان کی ولادت ابراہیم کی دعا کے

مطابق ہوئی تھی، اس لیے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا)۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر سکیں

فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ۔ انھوں نے کہا: بیٹے! میں نے خواب میں یوں دیکھا کہ

. . . . تم کو ذبح کر رہا ہوں (یعنی اللہ کے لیے) اب تم بتاؤ تمہاری

کیا رائے ہے؟ (یہ سوال اس لیے تھا کہ اس طاعت میں فرمان بردار بیٹا بھی شریک ہو جائے، کیوں کہ

حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کیلیے تسلیم و اطاعت آلہی کی ایک راہ کھول رہے تھے، اور چونکہ اطاعت شعاری فرزند

دعا ہائے سحر کی قبولیت تھا، اس لیے اس کا عاقل و حلیم ہونا یقین تھا اور کسی اختلاف کا خدشہ نہ تھا)۔

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي انھوں نے جواب دیا: والد ماجد! جو حکم ملا ہے اس کی

إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ۔ . . . . تعمیل فرمائیے انشاءاللہ آپ مجھکو ثابت قدموں میں

پائیں گے۔ (حضرت اسمٰعیل سمجھ گئے کہ ان کو حکم آلہی کی تعمیل میں ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس لیے انھوں نے وہ

جواب دیا جو متوکلین کے شایان شان تھا)۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ . . . . پس جب دونوں امر آلہی کے سامنے جھک گئے، اور

ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ (یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمال اطاعت و اسلام کو مشہود

کر دیا، کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کر لیا، جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی،

اور بیٹے کی کل کائنات صرف اس کی جان تھی)۔

وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ اور ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تم نے خواب کو

الرُّءْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ .... سچ کر دکھایا بیشک ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں، بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے (اس اطاعت کا ملہ نے ان کو درجہ احسان کی سرفرازی بخشی، اور یہی کمال اسلام ہے، اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا)۔

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (صفٰت ۹۹ تا ۱۰۷) اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا (یعنی اس قربانی کی یادگار رہیں، قربانی کی عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کی؛ جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ ہے)۔

اس واقعہ میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح، اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتی کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کر دینا ہے، اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے وجود میں نہیں آسکتی، پس گویا ان دونوں کا رتبہ کمال مقام احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ "اعبد ربک کانک تراہ" اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے جو تعلق ایمان و اسلام میں یا قول و عمل میں ہے، اور احسان ان دونوں کا نقطہ اتصال ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے، جو نسبت زندگی اور موت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یاد الٰہی ہے۔

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ ۱۴) اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ۔ (اعلیٰ ۱۵) اپنے رب کے نام کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

قرآن مجید میں اس طرح کی آیتیں بہت ہیں، اور مقصود دوام ذکر الٰہی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ۔ (آل عمران ۱۹) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

صالح، تاکہ میں ان کو لیکر تیری راہ پر چلوں، اور لوگوں کے لیے حق و ہدایت کی راہ باز ہو)۔

فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ...... پس ہم نے اس کو ایک حلیم لڑکے کی ولادت کی بشارت دی (یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کی۔ اسمٰعیل کے معنی ہیں "اللہ نے سنا" چونکہ ان کی ولادت ابراہیم کی دعا کے مطابق ہوئی تھی، اس لیے ان کا نام اسمٰعیل رکھا گیا)۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ...... جب وہ اس عمر کو پہنچے کہ ان کے ساتھ دوڑ پھر سکیں تو انھوں نے کہا: بیٹے! میں نے خواب میں یوں دیکھا کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں (یعنی اللہ کے لیے)، اب تم بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟ (یہ سوال اس لیے تھا کہ اس طاعت میں فرمان بردار بیٹا بھی شریک ہو جائے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ ہمیشہ کیلیے تسلیم و اطاعت آلہی کی ایک راہ کھول رہے تھے، اور چونکہ اطاعت شعار فرزند دعا ہائے سحر کی قبولیت تھا، اس لیے اس کا عاقل و حلیم ہونا متیقن تھا اور کسی اختلاف کا خدشہ نہ تھا)۔

قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ...... انھوں نے جواب دیا: والد ماجد! جو حکم ملا ہے اس کی تعمیل فرمائیے انشاء اللہ آپ مجھکو ثابت قدموں میں پائیں گے۔ (حضرت اسمٰعیل سمجھ گئے کہ ان کو حکم آلہی کی تعمیل میں ذبح کیا جا رہا ہے، اس لیے انھوں نے وہ جواب دیا جو متوکلین کے شایان شان تھا)۔

فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ ...... پس جب دونوں امر الٰہی کے کے سامنے جھک گئے اور ابراہیم نے بیٹے کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ (یعنی اس طرح دونوں نے اپنے کمال اطاعت و اسلام کو مشہود کر دیا، کیونکہ باپ نے اس چیز کو قربان کرنے کا عزم کر لیا، جو اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی اور بیٹے کی کل کائنات صرف اس کی جان تھی)۔

وَنَادَيْنَاهُ أَن يَا إِبْرَاهِيمُ قَدْ صَدَّقْتَ ...... اور ہم نے اس کو پکارا، اے ابراہیم! تم نے خواب کو

الرُّؤیَآءِ اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ۔ اِنَّ ھٰذَا سچ کر دکھایا بیشک ہم محسنین کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں،
لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلاشبہ کھلی ہوئی جانچ یہی ہے (اس اطاعت کا ملہ نے

ان کو درجہ احسان کی سرفرازی بخشی، اور یہی کمال اسلام ہے، اس امتحان کے بعد ان دونوں کو خدا نے قوموں کا امام اور ہادیوں کا رہبر بنایا۔

وَ فَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ (صف ۹۹ تا ۱۰۷) اور ہم نے اس کو بڑی قربانی کے عوض چھڑا لیا (یعنی اس قربانی کی یادگار رہیں، قربانی کی عالمگیر اور عظیم الشان سنت قائم کی، جو قربانی کرنے والوں کی مغفرت کا وسیلہ بنا۔

اس واقعہ میں خدا نے ہمارے سامنے یہ حقیقت کھولی ہے کہ اسلام کی روح، اطاعت اور اپنی عزیز سے عزیز متاع حتی کہ جان کو بھی خدا کے حوالہ کر دینا ہے، اور یہ بات بغیر کامل ایمان و اخلاص کے وجود میں نہیں آسکتی، پس گویا ان دونوں کا رتبہ کمال مقام احسان ہے۔ احسان کی حقیقت یہ ہے کہ " اُعْبُدْ ربک کانک تراہ" اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ قربانی اور نماز میں وہی تعلق ہے، جو تعلق ایمان و اسلام میں یا قول و عمل میں ہے، اور احسان ان دونوں کا نقطہ اتصال ہے۔

۲۔ نماز اور قربانی میں وہ نسبت ہے، جو نسبت زندگی اور موت میں ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نماز کی حقیقت یاد الٰہی ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (طہ ۱۴) اور میری یاد کیلئے نماز قائم کرو۔

دوسری جگہ ہے :۔

ذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی۔ (اعلیٰ ۱۵) اپنے رب کے نام کو یاد کیا، پس نماز پڑھی۔

قرآن مجید میں اس طرح کی آیتیں بہت ہیں، اور مقصود دوام ذکر الٰہی ہے۔ چنانچہ فرمایا :۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ۔ (آل عمران ۱۹۱) جو اللہ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے۔

نیز فرمایا:-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّهَ ذِكْرًا كَثِيرًا وَسَبِّحُوهُ	اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کرو، اور صبح و شام اس
بُكْرَةً وَأَصِيلًا هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ	کی تسبیح پڑھو۔ وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں
وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ	تاکہ تم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لیجائے، اور وہ
وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا۔ (احزاب ۴۱ تا ۴۳)	مومنین کے ساتھ مہربان ہے۔

یعنی جس طرح تم اس کی یاد کرتے ہو، اور اس کی تسبیح پڑھتے ہو، اسی طرح وہ اور اس کے ملائکہ تم پر رحمت بھیجتے ہیں جس سے تمہاری روشنی بڑھتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ ۱۵۲)	پس مجھکو یاد کرو اور میں تمکو یاد کروں گا۔

نیز فرمایا -

فَالَّذِينَ عِنْدَ رَبِّكَ يُسَبِّحُونَ لَهُ بِاللَّيْلِ	جو لوگ تیرے رب کے پاس ہیں، وہ رات دن اس کی
وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْأَمُونَ۔ (حم سجدہ)	تسبیح پڑھتے ہیں۔ اور کسی وقت اس سے برداشتہ خاطر نہیں ہوتے

یہی راز ہے کہ ہمارے رات دن کے تمام اوقات نمازوں سے گھیر دیے گئے ہیں۔ اور کسی حالت میں اس سے معافی نہیں دی گئی ہے۔ نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور و سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح ہے کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز کی صلاحیت بخشدینے کے بعد خدا کی نظر رافت ان کی طرف اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی توجہ و انابت سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے، و پائی ہوئی نعمتوں کو کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:-

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (محمد ۱۷)	جو طلب ہدایت میں سرگرم رہتے ہیں، ان کے نور ہدایت کو بڑھاتا ہے۔

توجہ الی اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا کے تقرب کی راہ یہی ہے۔ اللہ سے قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت ہو جائے (اعاذنا اللہ منہا) جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے اس سے قریب ہو جاتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (علق-۱۹) سجدہ کرو اور قریب ہو جاؤ۔

اس وقت اللہ کی نظر رحمت اس کو نوازتی ہے، اور اس کا سینہ انوار قدس کا مہبط بن جاتا ہے روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی جاتی ہے زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر قریب ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے۔

مایزال العبد یتقرب الی بالنوافل حتی احببتہ فاذا احببتہ کنت سمعہ الذی بہ یسمع و بصرہ الذی بہ یبصر و یدہ التی بہا یبطش۔	بندہ نوافل کی راہ سے برابر میری طرف بڑھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں، اور جب میں اس کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ

بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے، جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ اور اس حیات سفلی سے نجات حاصل کرنے کا زینہ ہے اب قربانی کی حقیقت پر غور کرو۔ اس کا اصلی مفہوم۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیلؑ کے واقعے سے ظاہر ہے نفس کو اللہ کے حوالہ کرنا ہے، یہ تسلیم و اطاعت کے ایک عظیم الشان واقعہ کی یادگار ہے اور اس میں زبردست امتحان کی سرگذشت پنہاں ہے جس میں خدا نے ابراہیم خلیلؑ کو آزمایا تھا۔ اہل ایمان راہ الٰہی میں اپنی جانیں قربان کر کے اسی اطاعت و عبدیت کی یادگاریں قائم کرتے ہیں پس جس طرح نماز اللہ کے ساتھ ہماری زندگی ہے، اسی طرح قربانی اس کی راہ میں ہماری موت ہے۔ اور یہی حقیقی

دین اور حقیقی اسلام ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔

کہدو میرے رب نے مجھکو صراط مستقیم کی ہدایت بخشی ہے۔ اور فطری دین۔ دین ابراہیم کی جو صرف اللہ کا پرستار تھا، کہدو میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔

(انعام ۱۶۱ - ۱۶۲)

باتفاق تمام مفسرین اس آیت میں "نسک" سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے یہاں "صلوٰۃ" اور "نسک" کو ایک ساتھ رکھا ہے، اور اس کے بعد علی الترتیب "محیا اور ممات" کے الفاظ ہیں، یہ نظم کلام توافق کے اصول پر ان دونوں کی حقیقت اور ان کے باہمی تعلق کو بے نقاب کرتا ہے، یعنی نماز، ظلم کی زندگی ہے اور اس کی قربانی راہ الٰہی میں اس کی موت ہے۔ پھر غور کرو تو یہ دونوں بالکل ایک ہیں، کیونکہ یہ موت ہی حقیقی زندگی کا دروازہ ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (بقرہ ۱۵۴)

جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں، ان کو مردہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے۔

۳۔ نماز اور قربانی "حقیقی قربانی" کے دو بازو ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو صاحب عقل و ارادہ اور خیر و شر میں تمیز کرنے والا بنایا، تو ایک طرف تو اس کو عظمت و رفعت کا وہ مقام بلند بخشا جس سے برتر اور بلند کوئی مقام نہ تھا، اور دوسری طرف ذلت و پستی کے اس کنارہ پر کھڑا کر دیا جس سے بڑھ کر کوئی ذلت و پستی نہ تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ

بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی پھر ہم نے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا، مگر

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۔ (تین ۔ ۴ ۔ ۵ ۔ ۶)۔
جو کہ ایمان لائے، اور بھلائیاں کیں، سو انھیں ہمیشہ کے لیے انعام ملے گا۔

نیز فرمایا:-

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (شمس ۔ ۷ ۔ ۸ ۔ ۹ ۔ ۱۰)
اور شاہد ہے نفس اور اس کا تسویہ، چنانچہ اس کو اسکی بدی اور نیکی الہام کی، جس نے اس کو سنوارا، اس نے فلاح پائی، جس نے اس کو خاک میں ملایا، وہ نامراد ہوا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب اس منعم حقیقی سے بے پروا ہو جاتا ہے، جمال الٰہی کی روشنی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اور وہ باطل کے دام فریب میں پھنس کر اپنے تئیں ہوائے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے:-

اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (جاثیہ ۲۳)
کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا ہے، اور خدا نے اس کو علم دینے کے باوجود گمراہ کر دیا ہے۔

یعنی اس نے عقل، آنکھ، کان پاکر گمراہی کی راہ اختیار کر لی ہے، جیسا کہ سورۂ دہر میں ہے۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (دہر ۲ ۔ ۳)
ہم نے آدمی کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، اس کو مختلف اطوار میں الٹتے پلٹتے رہے۔ پس اس کو سننے والا اور دیکھنے والا بنایا۔ بیشک ہم نے اس کو راہ سجھا دی چاہے وہ شکر گذار بنے یا ناشکری کی راہ اختیار کرے۔ (یعنی اگر وہ خدا کی بخشی ہوی نعمتوں کو کام میں نہ لائے ناشکری کی راہ اختیار کرے گا)۔

وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ
اور اس کے کان، آنکھ پر مہر کر دی ہے، اور اس کے دل پر پردہ ڈال دیا ہے۔

اللہ کے بعد اس کو کون ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ کیا تم سوچتے نہیں؟ یعنی جب اس نے خدا سے منہ پھیر لیا، اپنے نفس کا غلام بن گیا تو خدا نے اس کو اس کی خواہشوں کے حوالہ کر دیا، جو اس کے قلب کے لیے حجاب بن گئی ہیں۔

کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۔ ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کی سیاہی جم گئی ہے۔ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَمَحْجُوبُوْنَ ۔ ہرگز نہیں! وہ اس دن اپنے پروردگار کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔ (مطففین ۱۴-۱۵)

یعنی جس طرح وہ اس حیات دنیاوی میں خدا کے نور ایمان سے محروم تھے، اسی طرح حیات اخروی میں اس کے دیدار جمال سے محروم ہوں گے۔ آدمی جو کچھ چاہتا ہے خدا کی طرف سے وہی پاتا ہے جنہوں نے نفس اور شہوات نفس کی غلامی پسند کی، وہ نفس کے غلام بن گئے۔ اور قیامت کے دن نفس کی حقیقت ان پر ظاہر ہو جائے گی۔ یعنی ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ۔ پھر وہ جہنم میں داخل ہوں گے۔

اس حالت کی وجہ سے انسان کے لیے ضروری ہوا کہ نفس کے صنم اکبر کو توڑے، اور جنہوں نے نفس کی حقیقت پر غور کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ نفس کے دو بازو ہیں: سبعیت اور بہیمیت۔ اس لیے ضروری ہوا کہ انسان کو ان دونوں بازوؤں کے توڑنے کی تدبیر بتائی جائے۔ اب ان دونوں کی تفصیلات پر غور کرو!

۱۔ اول یعنی سبعیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ اللہ کے حضور خشوع و تذلل اور نماز کی پابندی ہو۔ نفس کے کبر و نخوت کا سر صرف نماز سے کچلا جا سکتا ہے۔ کیونکہ خشوع نماز کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۔ (مومنون ۱-۲) بیشک ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں خدا کے سامنے سرفگندہ ہیں۔

نیز فرمایا ہے:۔

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ عِندَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيُسَبِّحُونَهُ وَلَهُ يَسْجُدُونَ۔

اپنے رب کو دل میں یاد کرو، گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے اور پست آواز میں صبح اور شام، اور بیخبر دلوں میں سے مت بنو۔ جو لوگ تمہارے رب کے پاس ہیں وہ اس کی زندگی سے ابا نہیں کرتے۔ اور اس کی تسبیح کرتے ہیں۔ اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں۔

(اعراف ۲۰۵-۲۰۶)

دوسرے مقام پر ہے:۔

وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ۝ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا۔ (فرقان ۶۳-۶۴)

اور خدائے رحمان کے بندے وہ ہیں، جو زمین پر خاکساری کے ساتھ چلتے ہیں، اور جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں تم پر اللہ کی سلامتی ہو، اور جو اپنی راتیں خدا کے حضور سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں۔

اس آیت پر غور کرو۔ اس میں نماز سے پہلے ان کی خاکساری کا تذکرہ کیا ہے کیونکہ نماز کی حقیقت نفس کو نخوت سے پاک کرتا ہے، جو لوگ برابر ذکر الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، اور خدا کے جلال وجبروت اور اس کی نعمت و رحمت کی یاد تازہ رکھتے ہیں: ان کے چہروں سے تواضع اور محبت کا جمال ٹپکتا ہے۔ اسی قسم کا نظم اس آیت میں ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا۔ (فتح ۲۹)

محمد اللہ کا رسول۔ اور جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں، آپس میں نرم دل ہیں، تم ان کو دیکھو گے رکوع اور سجدہ میں۔

یہاں ابطال رہبانیت کی غرض سے پہلے 'شدت' کا ذکر کیا ہے، کیونکہ جو خدا سے محبت کرتا ہے اس کا دل اس مقام کی بے پایاں عظمتوں کے احساس سے اس قدر لبریز ہو جاتا ہے کہ اس میں مخلوق کی عظمت و بڑائی کے خیال کی سمائی نہیں رہ جاتی اس لیے وہ تمام مخالفتوں سے بخوف اور نڈر ہو کر علی الاعلان اس کی شہادت دیتا ہے پس اس جگہ 'شدت' کا ذکر محض ایک وہم کے ازالہ کے لیے ہے کیونکہ تذکرہ ایک ایسی امت کا ہو رہا تھا جو اعتدال کے نقطۂ کمال پر ہے۔ آیت میں مسلمانوں کی وہ صفات بیان ہوئی ہیں، جو توراۃ و انجیل میں مذکور ہیں، اور جو اس کو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امتوں سے متمیز کرتی ہیں ضمناً اس میں کمال عدل و اعتدال اور جمع بین الضدین کی اس فضیلت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ جو امت مرحومہ کی خصوصیات خاصہ میں سے ہے، اور جس کے بعد فضیلت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا، پس اس جگہ شدت کے ذکر سے محض اس صفت تواضع و رحمت کی تکمیل مقصود ہے۔ جس کا سرچشمہ خشیت الٰہی ہے۔ کیونکہ خدا کی خشیت تمام خوفوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ۔ (آل عمران) پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ (مائدہ، ۳) پس ان سے مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔

اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔

۲۔ دوسرے بازو یعنی بہیمیت کے توڑنے کی تدبیر یہ ہے کہ نفس اس دنیا کی جن مرغوبات میں لذت پاتا ہے ان سے اس کو علیحدہ کیا جائے۔ اس کے تین درجے ہیں:—

پہلا یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان قربان کی جائے، اس کا بلند ترین مقام لخت جگر کی قربانی ہے، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اکلوتے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی سے جانچا گیا، جو ان کی محبوب ترین اولاد تھے۔ چنانچہ جب فرشتہ نے ان کو حضرت اسحاق کی ولادت کی خوشخبری دی، انھوں نے کہا "اسمٰعیل زندہ ہے" جس سے حضرت اسمٰعیل کے ساتھ ان کی بے اندازہ محبت کا جوش ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ طاعت الٰہی کی راہ میں مصائب و آلام جھیلے جائیں، اور لذات سے کنارہ کشی اختیار کی جائے، کیونکہ زندگی کے بعد نفس کو سب سے زیادہ محبوب لذات ہی ہیں۔ روزہ اس منزل میں بہترین رہبر ہے۔ مقام قربانی کے مدارج میں سے ضعفاء طریق کی پہنچ اسی درجہ تک ہے۔ اسی لیے جب حضرت مسیح علیہ السلام سے سوال کیا گیا کہ سب سے بلند درجہ کے حصول کی راہ کیا ہے تو انہوں نے فرمایا یہ روزہ اور نماز سے حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا درجہ بذل مال کا ہے، جو تمام لذات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس منزل میں رمز زکوٰۃ ہے متعینہ زکوٰۃ سے زیادہ خرچ کرنے میں ایک پہلو، سبب کبر کے ابطال کا بھی ہے۔ چونکہ مقصود نفس کی بہیمیت نفس کو اُن چیزوں کی غلامی سے چھڑانا ہے جن کی لذتیں اس پر گھیرے ڈالتی ہیں اس لیے ضروری ہوا کہ خدا کی راہ میں وہ چیز خرچ کی جائے جو نفس کو محبوب ہو۔ اسی لیے فرمایا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ تم اس وقت تک نیکی کا درجہ نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جو تمہیں محبوب ہیں۔ (آل عمران۔ ۹۲)

یہ جو قربانی کے جانوروں کو فربہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں بھی یہی حکمت مخفی ہے حضرت ابراہیم کو محبوب ترین اولاد کے ذبح کا حکم دے کر یہ حقیقت بالکل آشکارا کر دی گئی۔ چونکہ قربانی کا حقیقی مرتبہ کمال جان کی قربانی تھا، اس لیے خون بہانا اُس کی علامت قرار پایا۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز اور قربانی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ذبح نفس کے دو پہلو ہیں، ایک حدیث میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

قربان ھٰذہ الامۃ بدمائھا وصلوٰتھا اس امت کی قربانی بذل نفس اور نماز کے ذریعہ ہے۔

(باقی)

رسائل و مسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

"اشاعت گذشتہ میں، ڈاکٹر سیادت علی صاحب (استاذ قانون، کلیہ جامعہ عثمانیہ) کے خطبۂ صدارت کے متعلق ایک مفصل استفسار، جناب مولوی ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب کی جانب سے شائع ہو چکا ہے، جس میں مسائل بحث طلب (سود، پردہ، طلاق اور مہر) کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی اصل عبارتیں بھی نقل کر دی گئی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس چند اور استفسارات بھی آئے ہیں، مگر ان کو شائع کرنا موجب تطویل ہوگا۔ آیندہ صفحات میں ہم ان مسائل کے متعلق ایک جامع اور مفصل بحث کریں گے، جس میں امید ہے کہ تمام حضرات مستفسرین کے پیش کردہ سوالات کا جواب آجائے گا۔"

یہ امر ایک گونہ موجب اطمینان ہے کہ ہماری جدید تعلیمیافتہ جماعت میں زندگی کے مسائل کو تہذیب مغربی کے اصول و نظریات کے بجائے اصول اسلام کے مطابق حل کرنے کا میلان پایا جاتا ہے، اور اسی لیے وہ ہر اس مسئلہ میں جو ان کے نزدیک اہمیت رکھتا ہے، اسلام کی طرف رجوع کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے مطالعہ، تحقیق، اور غور و فکر کی جو کم سے کم حد ہونی ضروری ہے، اور جس کو وہ خود اپنی علمی تحقیقات میں ملحوظ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اس کو اسلامی مسائل پر بحث کرنے میں ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اجتہاد کی کوشش کی جاتی ہے جو بجائے خود کوئی نامحمود شے نہیں ہے۔ نہ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں، لیکن اس کے لیے جو ضروری اور ناگزیر شرائط

ہیں ان میں سے کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اصول اسلامی کو جدید حالات و ضروریات پر منطبق کرنے اور اس طریقے سے زندگی کے جدید مسائل کو حل کرنے کے لیے اب تک جتنے اقدامات اس گروہ کی طرف سے کیے گئے ہیں ان میں سے کسی میں بھی اتنی صلاحیت استواری اور قوت موثرہ نہ پائی گئی کہ تہذیب اسلامی کا مزاج اس کو قبول کرتا اور امت مسلمہ کی زندگی میں اس سے کوئی مفید انقلاب رونما ہوتا۔ بلکہ اس قسم کے غیر محققانہ اجتہادات نے، جن کی بنیاد ناکافی مطالعہ اور ناکافی غور و فکر پر قائم ہوتی ہے، ملت کے مزاج پر وہی اثر کیا ہے جو کسی کمزور مریض کو کچی یا ادھ کچری غذا دینے سے ہوتا ہے۔ ضعف اور ضمحلال تو دور نہ ہوا کیونکہ وہ غذا ملی ہی نہیں جو خون صالح بناتی، اور جسم میں زندگی کی تازہ روح پھونکتی، البتہ پہلی شکایات پر سوء ہضم، بحران اور اختلال دماغی کا اور اضافہ ہو گیا!

اس تنقید سے ہمارا مقصد کسی کی تنقیص نہیں، بلکہ ہم اپنی قوم کے جدید تعلیم یافتہ گروہ کو اس کی اصلی کمزوری سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر ایک مدت سے جو ضعف و اضمحلال اور جمود و خمود طاری ہے وہ اس وقت تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان میں جہاد و اجتہاد کی وہ روح بیدار نہ ہو جائے جو ان کی تہذیب کو پھر سے ایک متحرک اور نامی تہذیب بنا دے لیکن جب ہم ان لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں جن سے اس باب میں کوئی امید وابستہ کی جا سکتی ہے، تو ساری امیدیں مایوسی سے بدل جاتی ہیں۔ ایک طرف علماء ہیں جن کے پاس دین کا علم ہے علوم اسلامی کے مآخذ اصلیہ تک دست رس ہے، مجتہدین سلف کے آثار و نقوش سے استفادہ کرنے کے وسائل ہیں، تحقیق کی استعداد ہے، غور و فکر کے مواقع ہیں مگر اجتہاد کی روح نہیں، تحقیق کا شوق نہیں حتیٰ کہ اگلوں کے بنائے ہوئے راستوں سے ایک قدم آگے بڑھنے کی بھی ہمت نہیں دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ حضرات ہیں جن میں تحقیق کا شوق ہے، اجتہاد کی روح ہے، جدید ضروریات کے لحاظ سے پیش قدمی کرنے اور نئے راستے نکالنے کی خواہش اور جرأت ہے مگر اسلام کا علم نہیں، تحقیق کے وسائل تک دست رس نہیں

کے لیے کرنا چاہیے نہ کہ تکالیف شرعیہ سے بچنے اور ابطال حق و اثبات باطل کے لیے۔ اس تصریح کے بعد اگر کوئی کہے کہ سود فلاں فلاں حیلوں سے کھایا جا سکتا ہے، یا زکوٰۃ سے بچنے کی فلاں فلاں صورتیں ممکن ہیں، تو اس کے معنی یہ نہیں کہ کہنے والا ایسا کرنے کو "پسند" کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل کی رائے میں اگر کوئی ایسا کرے تو قانون کی گرفت سے بچ سکتا ہے، یا بالفاظ دیگر خواہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کے ساتھ کچھ ہی معاملہ پیش آئے مگر دنیا میں اس کو سود خواری کا الزام دینے یا اس سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرنے کے لیے کوئی قانونی گنجائش نہیں ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے متعلق یہ انکشاف بالکل جدید ہے کہ انہوں نے دارالحرب میں "جواز سود" کا فتویٰ دیا تھا۔ کسی چیز کو سود قرار دینے کے بعد اسے "جائز" کہنے کی جرأت شاہ صاحب تو درکنار اگر کوئی بڑی سے بڑی شخصیت بھی کرتی تو تمام امت بالاتفاق اس کو کافر قرار دیتی کیونکہ یہ تو قرآن کا انکار ہے۔ مسئلہ جس کو اس قدر غیر قانونی الفاظ میں ڈاکٹر صاحب نے بیان کیا ہے دراصل ان الفاظ کے ساتھ کتب فقہیہ میں آیا ہے کہ مسلم اور کافر کے درمیان دارالحرب میں جو معاملہ ہو اس پر سود کا اطلاق نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بہت پہلے امام ابوحنیفہ اور امام محمدؒ یہ فتویٰ دے چکے ہیں، اور یہ ان کی اپنی ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ حدیث لاربا بین المسلم والحربی فی دارالحرب اس کا ماخذ ہے۔ امام ابویوسف، شافعی، مالک اور احمد رحمہم اللہ کے نزدیک یہ حدیث ثابت نہیں لیکن امام اعظم اور ان کے جلیل القدر شاگرد کے نزدیک یہ حدیث قابل اعتماد ہے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ شائد نہ کہا جاتا اگر آپ کے اصل الفاظ پیش نظر ہوتے آپ نے سود کے متعلق دراصل یہ فرمایا تھا کہ۔

ان آیۃ الربا من اخر ما نزل من القرآن وان النبی صلعم قبض قبل ان یبینہ — آیت ربوٰ قرآن مجید کی آخری نازل شدہ آیات میں سے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبل اس کے کہ

لنا فدعوا الربا والریبۃ۔ اس کے احکام پوری طرح واضح فرماتے وفات پا گئے
اس لیے تم سود بھی چھوڑ دو اور جس چیز میں سود کا شبہ ہو۔ اسے بھی چھوڑ دو۔

اس قول سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک چونکہ بعض ابواب میں شبہ تھا کہ وہ ربا کی حد میں آتے ہیں یا نہیں، اس لیے آپ تاکید فرماتے تھے کہ جس چیز میں ربا کا شبہ بھی ہو اس کو چھوڑ دو تاکہ کہیں نادانستہ تم حرام میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس قول سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں کہ ربا کی وسعت اور اس کے حدود چونکہ حضرت عمرؓ جیسے ماہر احکام شریعت تک کے نزدیک مشتبہ تھے اس لیے بجز ربا کی اس خاص شکل کے جس کو خاص طور پر قرآن مجید میں حرام فرمایا گیا ہے، باقی تمام اقسام کے سود ھنیئاً مریئاً کھاؤ اور اپنے ضمیر پر سے اس کی ممانعت کے بارگراں کو بھی اٹھا دو تاکہ اندیشے کبھی دل بھی ملامت نہ کرے!

یہ ارشاد کہ قرآن میں صرف سود در سود کی ممانعت کا حکم ہے، اگر دانستہ تحریف نہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قائل نے قرآن مجید کو پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مطلقاً ربا سے باز رہنے کا حکم دیا گیا ہے (بقرہ۔ رکوع ۳۸) اور دوسری جگہ خاص طور پر سود در سود کھانے کو منع کیا ہے (آل عمران رکوع ۱۴) ان میں سے ایک کو چھوڑ کر دوسری آیت سے استدلال کرنا۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ کا مصداق ہے قرآن مجید کا انداز بیان یہ ہے کہ کبھی کبھی وہ ایک ہی چیز کو منع کرنے کے لیے اس کی کسی خاص بدترین صنف کو لے کر اس سے منع کرتا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ صرف وہی خاص صنف حرام ہے اور باقی سب حلال ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں منع کیا گیا ہے وہاں ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ "اپنے بچوں کو مفلسی کے خوف سے مت قتل کرو" اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی اور غرض کے لیے بچوں کو قتل کرنا ممنوع نہیں ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں قرآن میں موجود ہیں اس قسم کی آیات میں جو شخص معنی کو نظر انداز کر کے سراسر لفظ پر نگاہ رکھے گا وہ خدا جانے کن کن مکروہات و منہیات میں مبتلا ہو جائے گا۔ پھر اگر

ایسی ہی لفظ کی پابندی کرنی ہے تو یہ کیوں نہ کہا جائے کہ سود در سود بھی صرف "کھانا" ممنوع ہے، باقی ر
کپڑے بنانا مکان تعمیر کرنا اور موٹر خرید نا وغیرہ تو ان اغراض کے لیے سود در سود لینا ہرگز ممنوع نہیں
کیونکہ قرآن میں لَا تَأْكُلُوا (نہ کھاؤ) کہا گیا ہے لَا تَأْخُذُوا (نہ لو) نہیں کہا گیا۔

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ الخ سے شارع کا جو منشا ڈاکٹر صاحب
سمجھا ہے، اس کی غلطی محض پوری حدیث کے الفاظ پڑھ لینے ہی سے واضح ہو سکتی ہے۔

الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواءً بسواءٍ یداً بید فاذا اختلفت ھٰذہ الاجناس فبیعوا کیف شئتم اذا کان یداً بید	سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چا ے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے کھجور کا کھ نمک کا نمک سے صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ دونو ایک دوسرے کے مثل اور ایک دوسرے کے ما ہوں اور دست بدست لین دین ہو جائے۔ ا اگر ان اجناس میں اختلاف ہو تو تم جس طرح چاہ سکتے ہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

اس حدیث سے شارع کا یہ منشا سمجھنا کہ "مبادلہ" موقوف کیا جائے اور نجر بتان میں ایک و
سکہ کی ترویج ہو، صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس نے کہیں صرف "الذھب بالذھب و الف
بالفضۃ" کے الفاظ پڑھ لیے ہوں اور کتب حدیث میں پوری روایت نکال کر دیکھنے کی زحم
نہ اٹھائی ہو، ورنہ یہ تو قطعاً بعید از قیاس ہے کہ کوئی عربی دان شخص اس پوری حدیث کو پ
(جس میں بالفاظ صریح مبادلہ کی شرائط بیان کی گئی ہیں) اور اس کا مفہوم یہ سمجھے کہ اس سے مبا
موقوف کر کے بیع بواسطہ زر سکوکہ رواج دینا مقصود ہے۔

اسی قسم کی شان تحقیق کا اظہار پردہ کے مسئلہ میں بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ عہد ن

پردہ کا رواج نہ تھا۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہجرت کے موقع پر انصار کی لڑکیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا تھا۔ حالانکہ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ لڑکیاں جوان جوان تھیں اور آج کل کی ساڑیوں اور بلاؤز جیسے لباس پہن کر گھروں سے نکل پڑی تھیں تب بھی اس واقعہ سے اس مسئلہ میں کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ واقعہ عین ہجرت کے موقع کا ہے اور پردہ کے احکام ہجرت کے بہت بعد نازل ہوئے ہیں۔

دوسرا ثبوت یہ پیش کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتیں بے پردہ آکر بیعت کرتی تھیں لیکن احادیث میں کہیں بھی یہ تصریح نہیں کہ عورتیں بے پردہ آتی تھیں۔ البتہ بخاری، مسلم اور نسائی میں یہ حدیث موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں سے محض بذریعہ کلام دور ہی سے بیعت لیتے تھے اور بیعت کی غرض سے بھی ان کے ہاتھ کو مس کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ بلاشبہ احادیث میں یہ ارشاد نبوی ضرور آیا ہے کہ کم من کاسیۃٍ فی الدنیا عاریۃٌ یوم القیٰمۃ (بہت سی ایسی عورتیں ہیں جو دنیا میں لباس پہنے ہوئے ہیں مگر قیامت کے روز برہنہ ہونگی) اور ایک دوسرا فرمان نبوی ہے کہ نساء کاسیات عاریات مائلات ممیلات لا یدخلن الجنۃ و لا یجدن ریحھا (بہت سی عورتیں جو لباس پہنے پر بھی ننگی رہتی ہیں اور مردوں کی طرف مائل ہوتی اور ان کو اپنی طرف مائل کرتی ہیں وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور اس کی ہوا تک انکو نصیب نہ ہوگی) لیکن ان احادیث سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ عورتیں حضور کی مجلس میں ایسے لباس پہن کر آنے کی جرأت کیا کرتی تھیں جن کے اندر سے ان کے جسم جھلکتے ہوتے تھے۔ اس قسم کا ایک آدھ واقعہ شاذ حضور کی مجلس میں پیش آیا ہے جس پر حضور نے ایسی سخت تنبیہ فرمائی تھی کہ کسی کو پھر اس طرح آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس واقعہ کو ماضی استمراری کے صیغہ میں بیان کرنے کے تو یہ معنی ہیں کہ ایسا ہوتا رہتا تھا، حالانکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

اس سے زیادہ بے ثبوت بلکہ خلاف واقعہ بات ہے کہ عہد نبوی میں عورت اور مرد ایک ہی صف میں نماز پڑھتے تھے۔ بخاری میں حضرت انس سے یہ روایت آئی ہے کہ ان کے مکان میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کھڑے ہوئے ، مقتدی صرف تین تھے یعنی حضرت انس، ایک یتیم لڑ
اور حضرت انس کی والدہ ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کو بیٹے کے پہلو میں کھڑے ہو کر نماز
کی اجازت نہ دی اور وہ پیچھے تنہا کھڑی ہوئیں۔ بخاری ہی میں حضرت ام سلمہ سے مروی ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھانے کے بعد کچھ دیر ٹھیر جاتے یہاں تک کہ پیچھے کی صفوں سے
تمام عورتیں اٹھ کر چلی جاتیں ۔ پھر آپ اور دوسرے مرد باہر نکلتے ۔ مردوں اور عورتوں کا ایک
صف میں خلط ملط ہو کر نماز پڑھنا تو درکنار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو عورتوں کا مسجد میں آنا بھی
نہ تھا۔ چنانچہ ابوداؤد میں حضرت ابن عمر سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
لاتمنعوا نساءکم المساجد و بیوتھن خیر لھن۔ (اپنی عورتوں کو مسجدوں میں آنے سے نہ
اگرچہ ان کا گھروں میں نماز پڑھنا زیادہ بہتر ہے پھر ان کو مسجد میں آنے کی اجازت بھی عام نہ تھی
بلکہ صرف رات کے لیے تھی بخاری میں حضرت ابن عمر سے مروی ہے حضور نے فرمایا ۔ اذا است
نساؤکم باللیل الی المسجد فاذنوا لھن (بخاری، باب خروج النساء الی المساجد
باللیل والغلس) حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
نماز پڑھنے کے لیے صبح بہت سویرے اپنی چادروں میں ڈھکی چھپی جاتی تھیں اور واپسی کے وقت
اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ کوئی ان کو پہچان نہ سکتا تھا۔ اس پر مزید حکم یہ تھا کہ مسجد میں خوشبو لگا کر
نہ جائیں۔ موطا میں امام مالک نے حضور کا یہ فرمان نقل کیا ہے کہ اذا شہدت احداکن
صلوۃ العشاء فلا تمس طیبا (جب تم میں سے کوئی عورت عشا کی نماز میں شریک ہو
تو خوشبو نہ لگائے) تعجب ہے کہ ان میں سے کوئی حدیث بھی پروفیسر سیادت علی صاحب کو نہ ملی اور
معلوم کہاں سے یہ غیر معروف اطلاع مل گئی کہ حضرت عمر کے عہد تک مسلمان عورتیں مسجدوں میں
مردوں کے ساتھ ایک ہی صف میں پہلو بہ پہلو کھڑی ہو کر نماز پڑھا کرتی تھیں۔

آخری ثبوت جو عہد رسالت میں پردہ کا رواج نہ ہونے کے باب میں پروفیسر صاحب نے پیش فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مراسم حج میں آج تک بھی یہ "ضروری" ہے کہ میدان عرفات میں عورتیں بے نقاب کھڑی رہیں۔ یہ مسئلہ ہم کو حدیث یا فقہ کی کسی کتاب میں نہیں ملا، اور نہ کسی حاجی نے اس کی تصدیق کی۔ حیدرآباد میں مطوفین بکثرت آتے رہتے ہیں اور مناسک حج کے جزئیات پر ان سے زیادہ کسی کو عبور نہیں ہوتا۔ پروفیسر سیادت علی صاحب کو اگر کتابوں سے مراجعت کرنے کا موقع نہ ملا تھا تو اس بات کو پبلک میں بیان کرنے سے پہلے کم از کم کسی مطوف ہی سے دریافت کر لینا چاہیے تھا۔

سود اور پردہ کے باب میں جس انداز تحقیق سے کام لیا گیا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب طلاق کے مسئلہ کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ پروفیسر سیادت علی صاحب نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ اس راز کا انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق السنۃ یعنی قرآن و حدیث کے مقرر کردہ طریق طلاق کو بدل کر طلاق بدعی کو رائج کر دیا۔" اور جو طلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں بائن نہ تھی اس کو اپنے اختیار سے بائن قرار دیا۔ تقریر کے اس حصہ کو جب ہم پڑھ رہے تھے تو دفعتاً ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے بعد شائد یہ فقرہ آئے گا کہ جب حضرت عمرؓ نے ایسا کیا تو مدینہ میں ہنگامہ برپا ہوا اور حضرت عمرؓ قتل کر دیے گئے۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کی آنکھیں دیکھے ہوئے لوگ ہزارہا کی تعداد میں موجود تھے، اور ان کی موجودگی میں کوئی شخص یہ جرأت نہ کر سکتا تھا کہ قرآن و حدیث کے احکام میں تغیر و تبدل کرے۔ اور خدا اور رسول کے احکام کی رو سے جو عورت اپنے شوہر سے جدا نہ ہوتی ہو اس کو اپنے حکم سے جدا کر دے!

لطف یہ ہے کہ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے حضرت عمرؓ کے اس فعل کی توجیہ جو فرمائی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق بدعی کو رائج نہیں کیا بلکہ لوگوں میں یہ بدعت رواج پا رہی تھی، اس لیے آپ نے اس کو روکنے کے لیے سزا کے طور پر فرمایا کہ جو شخص اپنی بیوی کو بیک وقت

تین طلاق دے گا اس کی بیوی اس سے جدا کر دی جائے گی۔ اس مسئلہ کو جس طریقہ سے ڈاکٹ
نے بیان کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے طلاق بدعی کی فقہی حیثیت اور ما
بارے میں فقہاء کے اختلافات اور مختلف مذاہب کے استدلالات کا مطالعہ کیا ہی نہیں۔

طلاق کے مسئلہ میں سب سے زیادہ عجیب بات جو ڈاکٹر صاحب نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ
سے طلاق دینے کا حق شوہر سے چھین کر قاضی یا پنچایت کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ یہ تجویز دو
سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یا تو ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کی وہ آیات سرے سے پڑھیں ہی نہیں
طلاق دینے کا اختیار بلا شرکت غیرے صرف مرد کو دیا گیا ہے، یا اگر ان کو پڑھا ہے تو وہ
قاعدہ "لا ینکر و انعیر الاحکام بتغیر الازمان" کی رو سے اس بات کے قائل ہ
زمانہ کے ساتھ قرآن مجید میں بھی ترمیم کی جا سکتی ہے! ہمیں نہیں معلوم کہ وہ ان دونوں
میں سے کون سی شق اختیار کرنا پسند فرماتے ہیں۔ (باقی)

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۱۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔ جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کر رہے ہیں انہیں اپنے جدید پتہ کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر ملزم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے

منیجر ترجمان القرآن بدرالدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)

اُردو زبان کی ایک پُرشکوہ کتاب

تمدن عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے ایڈیشن ۱۸۹۸ء

کی صفحہ بصفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۲۵) امریکن بلاک (۶۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مؤرخ ڈاکٹر گستاولی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بے مثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی — مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن مدظلہ کے

جشن سیمین کی شادمانی میں فروری ۱۹۳۶ء تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپے بعد طبع پچیس روپے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر و نایاب کتابوں کے لیے

سید عبدالقادر

پبلشر [illegible] اعظم اسٹیم پریس [illegible]

جلد [illegible] عدد [illegible]

[illegible]

رجسٹرڈ [illegible] صفحہ ۱۲۰

رجسٹرڈ نمبر [illegible]

۶۸۹

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ [illegible]

قیمت فی پرچہ [illegible]

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت | اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ | وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ | اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا حل جو اس نوع کی جنگ پر کئے جاتے ہیں

اشاعت اسلام اور تلوار | دعوت و تبلیغ کے متعلق اصول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعت اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ | اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہ ہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات

جنگ دوسرے مذاہب میں | جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بدھ مت، مسیحیت اور یہودیت کی تعلیمات کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ

جنگ اور تہذیب جدید | بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ

ضخامت (۶۰۰) صفحات، مجلد ۵، انگریزی رفیع کاغذ نمبر ۱ غیر مجلد (للعہ) انگریزی کاغذ چار روپیہ بارہ آنے

دفتر ترجمان القرآن۔ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

ماہ شوال ۱۳۵۴ھ جلد ۷، عدد ۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انسان نے خود اپنی تلاش و جستجو سے جتنے طریقے یا مذاہب ایجاد کیے ہیں ان سب کو دو قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک قسم ان مذاہب کی ہے جو تخیل کی بلند پروازیوں سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان کی اُپج پسندی کو اپیل کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان طریقوں کی ہے جو خواہشات اور اہوائے نفس سے پیدا ہوئے ہیں اور انسان کے حواس کو اپیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ان دونوں قسم کے طریقوں میں عقل اور استعداد علمی سے کام لیا گیا ہے لیکن عقل نہ ان کی محرک ہے، نہ وہ عقل کو اپیل کرتے ہیں، نہ عقلی نتائج کا حصول ان کا منتہائے مقصود ہے۔ عقل اور استعداد علمی ان کے پاس محض ایک آلہ کے طور پر ہے جس سے وہ ادنیٰ درجہ کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کام لیتے ہیں۔ ایک عالم مادی سے قطع نظر کر کے عالم باطنی کی طرف توجہ کرتا ہے اور علم و عقل کی تمام قوتوں کو ایسے ذرائع دریافت کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے جن سے وہ نفس کی باطنی قوتوں کو مادی تقیدات سے آزاد کر کے مکاشفات اور لذات روحانی اور خوارق عادت کے حصول پر قادر ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا عالم باطنی سے قطع نظر کر کے اپنی تمام توجہ عالم مادی کی طرف پھیر دیتا ہے اور یہاں وہ علم و عقل کی ساری طاقتوں کو ان طریقوں کے دریافت کرنے میں استعمال کرتا ہے جن سے وہ مادی اسباب و وسائل سے زیادہ سے زیادہ انتفاع کر کے اپنے جسم کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائش اور اپنے حواس کے لئے

زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کر سکے غرض علم وعقل ان کے خادم ضرور ہیں، مگر بجائے خود ان کی بنا جہل اور نادانی پر ہے۔

ان کے مقابلہ میں ایک مذہب وہ ہے جو خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ یہ مذہب خالص علم سے پیدا ہوا ہے، سراسر عقل کو اپیل کرتا ہے، اور اس کا اصل مقصد انسان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانا ہے تاکہ وہ کائنات میں اپنی اصلی حیثیت سے واقف ہو، موجودات کے ساتھ اپنے تعلق کی حقیقی نوعیت کو سمجھے، اور علم وفہم کی اس روشنی میں اپنی تمام ظاہری وباطنی قوتوں اور مادی و روحانی وسائل کو اس مقصد تک پہنچنے میں استعمال کرے جو درحقیقت انسانی زندگی کا عقلی مقصد ہے یعنی اس دنیا میں اس منصب کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا خلیفہ بنا کر اس کے سپرد کیا ہے، اور آخرت میں اپنے مالک کی خوشنودی سے سرفراز ہونا جو ادائے فرض کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ مذہب انسان کی کسی قوت کو بیکار نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کو صرف کرنے کا صحیح راستہ بتاتا ہے۔ وہ انسان کی کسی خواہش کو پامال نہیں کرتا بلکہ ہر ایک کے لیے ایک جائز اور معقول حد مقرر کر دیتا ہے، وہ تخیل کو بلند پروازی سے روکتا نہیں بلکہ اس کی پرواز کے لئے ایک بہتر فضا اور ایک صحیح رخ متعین کرتا ہے وہ انسان کی عملی قوتوں کو بھی مادی اسباب ووسائل کے انکشاف اور ان سے انتفاع کرنے سے باز نہیں رکھتا بلکہ صحیح مقاصد کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے، وہ ہر شخص کو اسی کام میں لگاتا ہے جس کی اہلیت لے کر وہ پیدا ہوا ہے، خواہ اس کا میلان روحانیت کی طرف ہو یا مادیت کی طرف۔ لیکن ان دونوں قسم کے انسانوں کو وہ ایسے علم اور ایسے تعقل سے بہرہ ور کر دینا چاہتا ہے جس کی مدد سے وہ افراط وتفریط کو چھوڑ کر ایک راہ مستقیم پر چل سکیں، انسان ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض کو سمجھیں، اور بجا لائیں، ان کی ذات پر خدا اور مخلوقات اور خود ان کے اپنے نفس کے

جو حقوق ہیں ان کو جانیں اور ادا کریں، روحانیات کی طرف جائیں تو ان میں اس قدر گم نہ ہو جائیں کہ تمام تر مکاشفات اور لذات روحانی ہی ان کی جد وجہد کا محور بن کر رہ جائیں، اور مادّیات کی طرف متوجہ ہوں تو ادھر بھی ان کا انہماک اس قدر نہ بڑھ جائے کہ وہ بالکل جسّی لذتوں اور جسمانی آسائشوں اور مادی کامیابیوں ہی کو اپنا کعبہ مقصود بنالیں۔

یہ سر تا سر علمی و عقلی مذہب ہے، اس لیے اس کا صحیح اتباع بھی علم اور عقل کے بغیر نہیں ہو سکتا یہاں ہر ہر قدم پر تفقہ اور تدبر کی ضرورت ہے جو شخص اس مذہب کی روح سے ناآشنا ہو، اس کی حکمتوں سے ناواقف ہو، اس کے اصول کو نہ سمجھتا ہو، اس کی تعلیم میں غور و فکر نہ کرتا ہو۔ وہ اس راہ راست پر استقامت کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا جس کی طرف یہ مذہب رہنمائی کر رہا ہے۔ اس کا عقیدہ بے قیمت ہے جب تک کہ وہ اقرار لسانی سے گذر کر تصدیق قلبی نہ بن گیا ہو۔ اس کا عمل بے اثر ہے جب تک کہ وہ علم اور فہم کی روح سے معمور نہ ہو جائے۔ اس کا اتباع قانون بے معنی ہے جب تک کہ قانون کی اسپرٹ اس کے جوارح سے گذر کر اس کے دل و دماغ پر حاوی نہ ہو گئی ہو۔ اگر محض تقلید کی راہ سے وہ بغیر سمجھے بوجھے اس مذہب کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کا اتباع کر رہا ہو، تو اس کا ایمان اور اتباع بالکل ایک ریت کے تودے کی طرح ہوگا جسے ہوا کا ہر جھونکا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ جا سکتا ہے۔ ایسے جاہل کے ایمان اور اندھے کے اتباع میں کوئی پائداری نہیں ہو سکتی۔ ہر گمراہ کرنے والا اس کو صحیح مرکز سے ہٹا سکتا ہے۔ ہر خوشنما راستہ اس کو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے، ہر توہم، ہر مفروضہ، ہر نظریہ اس کے اعتقاد کی بنیادوں کو متزلزل کر سکتا ہے۔ ہوائے نفس کی ہر لہر اور ضلالت عام کی ہر رو اس کو بہا کر کہیں سے کہیں لے جا سکتی ہے۔ اگر وہ عقیدت مند ہوگا تو اعتقاد اور عمل کی ہر اس گمراہی پر اصرار کریگا جو آباؤ اجداد سے اس کو وراثت میں ملی ہو، اگر تجدد کا ذوق رکھتا ہوگا تو خواہشات نفس کو اپنا خدا بنا کر ہر اس نئے راستہ پر بھٹکتا پھریگا جسے اس کے نفس کا شیطان اس کے سامنے مزین بنا کر پیش کر دے۔ اگر کمزور

طبیعت کا ہوگا تو ہر اس راہ رو کے پیچھے چل کھڑا ہوگا جو اسے زندگی کے راستے پر کسی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ قطع منازل کرتا نظر آئے۔ اگر خود اپنے اجتہاد سے کوئی راہ نکالنے کی اس میں صلاحیت ہوگی تو دین میں صحیح بصیرت نہ رکھنے اور الٰہی قانون کے اصول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے زندگی کے سفر میں ہر دوراہے پر پہنچ کر وہ علم کے بجائے ظن و تخمین سے کام لیگا اور آخر کہیں نہ کہیں جا کر سیدھے راستے سے بھٹک ہی جائے گا۔ غرض اس خدائی مذہب کا صحیح اتباع اور اس اتباع میں استقامت جہل اور نافہمی کے ساتھ ممکن ہی نہیں۔ اس کے لیے علم اور سمجھ بوجھ اور غور و فکر ناگزیر ہے، اور انہی چیزوں کے مراتب کمال پر کمالِ اتباع کے درجات مترتب ہوتے ہیں۔

اس مذہب کی تاریخ پر نگاہ ڈالیے تو ہمارے اس بیان کی صداقت آپ کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔ جتنے انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے آئے وہ صرف ایک قانون اور ایک کتاب ہی لیکر نہیں آئے بلکہ اس کے ساتھ حکمت بھی لائے تاکہ لوگ ان کی تعلیم کو سمجھیں اور علی وجہ البصیرت اس قانون کی پیروی کریں جو ان کے ذریعہ سے بھیجا گیا تھا۔ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۴: ۸) وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳: ۵) وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ (۳۸: ۲) قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ (۴۳: ۶) یہ حکمت کیا چیز تھی؟ دین کی سمجھ، علم کی روشنی، بصیرت کا نور، تدبّر کی صلاحیت، اور تفقّہ کی قابلیت۔ جب کبھی کوئی نبی آیا اس نے اپنے پیروں کو کتاب کے ساتھ یہ چیز بھی دی اور اسی کی مدد سے لوگ سیدھے رستے پر قائم رہے۔ مگر اس کے بعد ایک دورِ جہالت اور اندھی تقلید کا آیا جس میں حکمت غائب ہوگئی اور صرف کتاب باقی رہ گئی۔ کچھ عرصہ تک لوگ محض کتاب کو لیے ہوئے اس ڈگر پر چلتے رہے جس پر ان کے اسلاف انہیں چلا گئے تھے مگر اب ان میں گمراہیوں کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی، کیونکہ وہ چیز ان میں باقی نہیں رہی

جس سے وہ کتاب کو سمجھتے اور ہدایت کو ضلالت سے ممتاز کر سکتے۔ رفتہ رفتہ ان کے
سے ہٹنے شروع ہوئے کسی نے ہوائے نفس کا اتباع کیا کسی نے ظن و تخمین کی پیروی کی
کے اثرات قبول کیے، کسی نے جھوٹے رہنماؤں کو ارباب من دون اللہ بنایا، آخر کار حکمت
بھی جفت ہو گئی، اور خدا کے بھیجے ہوئے دین کو مسخ کر کے اوہام اور خرافات اور فکر و
مجموعہ بنا دیا گیا۔

اس طرح بار بار دین الٰہی کے مسخ ہونے اور کتب آسمانی کے گم یا محرف ہونے
ہدایت کے بعد ضلالت کے پھیل جانے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دین الٰہی میں اصل
کتاب کی تلاوت اور رسوم مذہب کی بجا آوری نہیں ہے بلکہ تمام تر دار و مدار صحیح علم و فہم
لوگوں میں حکمت رہی، اور وہ آیات الٰہی میں تدبر کرتے رہے، اور انبیاء کی بتائی ہ
پر نور بصیرت کے ساتھ چلتے رہے، اس وقت تک کوئی چیز ان کو گمراہ نہ کر سکی۔ اا
سے مفقود ہو گئی تو گویا ان میں بیماریوں کی استعداد پیدا ہو گئی۔ ان کے اندر بھی امرا
اور باہر سے بھی وبائی جراثیم نے ان پر حملہ کیا یہاں تک کہ دین اور کتاب اور قانون
وہ ضلالت کے ہزار ہا راستوں میں بھٹک گئے۔

انبیائے سابقین کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کتاب اور ایسی ہدایت
جس کو پچھلی کتابوں کی طرح مسخ اور محرف ہونے کا کوئی خطرہ نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ
میں باقی رکھنے کا ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اگر انسان اس کو بدلنے اور مٹانے کی کو
تو کامیاب نہیں ہو سکتا لیکن اب بھی اس کتاب اور اس ہدایت سے فائدہ اٹھانا
سیدھے راستے پر قائم رہنے، اور اعتقاد و عمل کی گمراہیوں سے بچنے کا انحصار کلیۃً اسی

ابتداء سے دین الٰہی کی بنا رکھی گئی ہے، یعنی علم اور عقل۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہر زمانے اور ہر حال میں بہترین رہنما ہے، مگر ان کے لیے جو علم اور عقل رکھتے ہوں، اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کو سمجھیں، اس میں غور و خوض کریں، اس سے اکتساب نور کریں، اور زندگی کی ہر راہ میں اس نور کو لے کر چلیں۔ رہے وہ جو تفقہ و تدبر کی نعمت کھو چکے ہیں، اور صرف اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے باپ دادا ان کو مسلمان چھوڑ گئے ہیں تو درحقیقت ان کے لیے دین میں کوئی استقامت ہی نہیں۔ وہ ہر وقت گمراہی کے خطرہ میں ہیں۔ گمراہی ان کے اندر سے بھی پھوٹ سکتی ہے اور باہر سے بھی حملہ کر سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ان کی اپنی جہالت اور نافہمی ان کو راہ راست سے بھٹکا دے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے گرد و پیش جو ضلالتیں پھیلی ہوئی ہیں ان میں سے کسی کے پیچھے وہ بغیر جانے بوجھے لگ چلیں، کیونکہ ان کے پاس وہ چیز ہی نہیں ہے جو ان کو دین کے سیدھے رستے پر مضبوطی کے ساتھ قائم رکھ سکتی ہے۔

قرآن مجید میں انسان کی گمراہی کا اصل سبب صرف ایک چیز کو قرار دیا گیا ہے اور وہ آیات الٰہی کو نہ سمجھنا ہے، چنانچہ وہ بار بار اس پر تنبیہ کرتا ہے اور نہایت شدت کے ساتھ اس کی مذمت کرتا ہے:

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۔ (۸: ۲۲)۔	اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ۔
لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔ (۷: ۲۲)	ان کے پاس دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں، اور ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے پاس کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ وہ اور بھی زیادہ گمراہ ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ (۹:۱۲۷)۔	اللہ نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ بوجھ نہیں رکھتے"۔
لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ۔ (۴۷:۳)۔	ان کے دلوں میں خدا سے زیادہ تمہارا (یعنی بندوں کا) خوف ہے، یہ اس لیے کہ وہ سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔
اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (۴۷:۳)	کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟
اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ۔ (۲۳:۴)	کیا انہوں نے اس بات پر (جو ان سے کہی جارہی ہے) غور نہیں کیا۔

اس عدم تدبر اور نافہمی کے نتائج دو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور وہ دونوں گمراہی کی بدترین صورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ انسان بغیر سمجھے بوجھے اپنے دین و ایمان کو دوسروں پر چھوڑ دیتا ہے خواہ وہ اس کو نجات کے رستے پر لے جائیں یا ہلاکت کے رستے پر۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۵:۱۴)	اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس کتاب کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف، تو بولے کہ ہمارے لیے وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباو اجداد کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ باپ دادا ہی کی تقلید کریں گے خواہ وہ کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں؟

اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹:۵) انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علما، اور مشائخ کو خدا بنا لیا ہے (کہ جس کو وہ حرام کہیں وہی ان کے نزدیک حرام ہے خواہ اللہ نے اس کو حلال کیا ہو اور جس کو وہ حلال کہیں وہ ان کے نزدیک حلال ہے خواہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہو)۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا۔ (۳۳:۸) جب ان کے چہرے آگ میں الٹ پلٹ کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے کہ کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔ اور کہیں گے خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو چھوڑ کر خود اپنی رائے پر اعتماد کرتا ہے۔ مگر اس راہ میں اول تو علم یقین نہیں ہوتا (جو راہ راست پر چلنے کا یقینی ذریعہ ہے) بلکہ زیادہ تر ظن وگمان ہوتا ہے، دوسرے بڑا خطرہ یہ ہے کہ انسان کی عقل پر نفس کی خواہشات غالب آجاتی ہیں، اور اس کو اعتدال کے خط مستقیم سے ہٹا کر افراط و تفریط کی جانب لے جاتی ہیں۔ جب انسان اس رستے پر چلتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں گامزن ہو، کہیں علم صحیح اور عقل سلیم کی بجلی اتفاق سے چمک گئی تو راستہ نظر آگیا اور کچھ دور چل لیے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ۔ ورنہ حیران ہو کر کھڑے ہو گئے وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا۔ یا چلے تو کسی خارزار میں جا پھنسے یا کسی گڑھے میں گر گئے۔

وَمَا یَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا (۱۰:۴)۔ اور ان میں سے اکثر بجز گمان کے کسی اور چیز کی پیروی نہیں کرتے اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق (علم یقینی) سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوٰهُ ...... أَمْ تَحْسَبُ أَنَّ أَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُونَ أَوْ يَعْقِلُونَ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا (۲۵:۴)

کیا تو نے دیکھا اس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہے.... کیا تو گمان کرتا ہے کہ ایسے لوگوں میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں؟ نہیں وہ تو بس جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸:۵)۔

اس سے زیادہ بدراہ اور کون ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا (۱۸:۴)

اور اس شخص کی بات ہرگز نہ ماننا جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور جس نے اپنی خواہش کی پیروی اختیار کی ہے اور جس کے کام میں اعتدال سے تجاوز ہے

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۴۵:۲)

اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرنا جو علم نہیں رکھتے

یہ نتائج ہیں آیات الٰہی میں غور و خوض نہ کرنے اور تدبر و تفقہ سے کام نہ لینے کے۔ جو لوگ آیات کی تلاوت کرتے ہیں مگر ان کو نہیں سمجھتے، کتاب رکھتے ہیں مگر خود اس کی تعلیم میں بصیرت حاصل کرنے اور اس کے احکام کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے، رسول کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس ہدایت کی طرف سے اندھے ہیں جو رسول نے پیش کی ہے، اسلام کی حقانیت پر اعتقاد رکھتے ہیں مگر اس کے اصول اور اس کی روح سے ناواقف ہیں، ان کے لیے ہر ہر قدم پر یہ خطرہ ہے کہ گمراہی کی ان دونوں صورتوں میں سے کسی صورت میں مبتلا ہو جائیں۔ اسی لیے اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ دین میں بصیرت پیدا کریں، اس کی تعلیم اور اس کے احکام کو سمجھیں اور کم از کم ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ ایسا رہے جو تفقہ فی الدین حاصل

رنے کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دے تاکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی صحیح رہنمائی کر سکے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۳۸:۳)

یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تجھ پر اتاری ہے برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و خوض کریں اور جو عقل رکھتے ہیں وہ اس سے سبق لیں۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ۔ (۶:۱۲)

ہم نے آیات کو مفصل بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۳:۱۶۰)

اللہ نے مومنوں پر بڑا ہی احسان کیا کہ ان میں خود انہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (۲:۲۶۷)۔

اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بہت کچھ بھلائی دے دی گئی۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ (۹:۱۵)

پھر کیوں ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نہ نکلی تاکہ وہ دین میں تفقہ حاصل کرے اور واپس جا کر اپنی قوم کو آگاہ کرے۔

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بکثرت ہدایات فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ۔

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسن رکھو

اَلا لاَخیرَ فی عِبَادۃٍ لیس فیہا تَفقہ ولاعلم لیس فیہ تفہم ولا قرأۃ لیس فیہا تدبّر۔	کہ اس عبادت میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تفقہ نہیں ہے، اور اس علم میں کوئی بھلائی نہیں جس میں کچھ بوجھ نہیں ہے، اور اس قرآن خوانی میں کوئی بھلائی نہیں جس میں تدبّر نہیں ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

مَن یُرِدِ اللہ بہٖ خیراً یفقّہہ فی الدین	اللہ جس کے لیے بہتری کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین میں تفقہ عطا کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

اَفضَلُ النّاس افضلھم عملاً اذا فقھوا دینھم۔	لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہیں جو عمل کے اعتبار سے بہتر ہیں بشرطیکہ دین میں کچھ بوجھ رکھتے ہوں

اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی بلکہ اصلی مصیبت یہی ہے کہ ان میں تفقّہ فی الدین اور تدبّر فی الکتٰب والسنہ نہیں ہے۔ اسی چیز کے فقدان نے ان کے اعتقادات کو کھوکھلا، ان کی عبادات کو بے روح، ان کی مساعی کو پراگندہ و پریشان، اور ان کی زندگیوں کو بے ضابطہ و بدنظم کر دیا ہے۔ اسلام کے شیدائی ان میں بہت ہیں، مگر اسلام کو سمجھنے والے بہت ہی کم ہیں۔ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر مرمٹنے والوں کی کمی نہیں، مگر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس دین اور شریعت کو پیش کیا ہے اس کی روح اور اس کے اصول کو سمجھنے والے کالملح فی الطعام بلکہ اتنے بھی نہیں۔ یہ اسی نافہمی کے نتائج ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے ہیں ان میں بدترین قسم کے توہمات اور مشرکانہ عقائد سے لے کر الحاد، دہریت اور کفر کی حد کو پہنچے ہوئے خیالات تک پائے جاتے

اور ان کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ جس اسلام کی پیروی کے وہ مدعی ہیں اس میں اور ان خیالات میں کلی تباین ہے۔ اس سے بدتر حالت اخلاقی و عملی زندگی کی ہے۔ بت پرستانہ رسوم و رواجات سے لیکر جدید مغربی تہذیب کے بدترین ثمرات تک ہر قسم کے اطوار اُس قوم میں رائج ہیں جو اپنے آپ کو اسلام کا پیرو کہتی ہے، اور الّا ماشاء اللہ کسی گروہ کو یہ احساس تک نہیں کہ وہ کہاں کہاں اس قانون کے اصول اور قواعد سے صریح انحراف کرگئی ہے جس پر ایمان رکھنے کا اس کو دعویٰ ہے۔ ہر غلط خیال اور غلط طریقہ جو کہیں سے آتا ہے ان میں رواج پا جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں اس کی بھی گنجایش ہے۔ ہر گمراہ کن شخص جو کسی خوش آیند طریقہ پر چل رہا ہے، بآسانی ان کا رہنما بن جاتا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم اس کی پیروی بھی کرسکتے ہیں۔ ہر چیز جو غیر اسلام ہے وہ بے تکلف اسلام کے ساتھ ایک ہی دماغ اور ایک ہی زندگی میں جمع کرلی جاتی ہے، کیونکہ اسلام اور غیر اسلام کا امتیاز علم و فہم پر موقوف ہے، اور اسی کا یہاں فقدان ہے۔ جو شخص مشرق اور مغرب کا فرق جانتا ہو وہ کبھی اس حماقت میں مبتلا نہیں ہوسکتا کہ مشرق کی طرف چل رہا ہو اور یہ سمجھے کہ مغرب کی سمت جا رہا ہوں۔ یہ فعل صرف ایک جاہل ہی کا ہوسکتا ہے، اور یہی جہالت ہم ایک نہایت قلیل جماعت کے سوا مشرق سے لے کر مغرب تک کے مسلمانوں میں عام دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ ان پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علما، یا خرقہ پوش مشائخ، یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات۔ ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ یکساں ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نہایت ہی حکیمانہ ارشاد ہے کہ ۔

صنفان اذا صلحا صلحت الامۃ واذا دو گروہ ہیں کہ اگر وہ درست ہوں تو امت درست

فسدا فسدت الامة، السلطان والعلماء۔ ہے۔ اور اگر وہ بگڑ جائیں تو امت بگڑ جاتی ہے، حکمران اور علماء۔

مسلمانوں کی تاریخ کا ہر باب اس ارشاد نبوی کی صداقت پر گواہ ہے، اور سب سے زیادہ آج ہم اس کی صداقت کو نمایاں دیکھ رہے ہیں اگر ہمارے حکمرانوں اور علماء میں تقویٰ اور دین کا صحیح علم ہوتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی، اور آج بھی اگر مسلمان قوموں کو ایسے رہنما میسر آجائیں تو حالات کے اس درجہ بگڑ جانے پر بھی اصلاح سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

مقالات

قرآن مجید کا رسم الخط

از جناب مولانا عبد القدیر صاحب صدیقی

"اس مقالہ میں جناب مولانا عبد القدیر صاحب صدیقی نے قرآن مجید کے رسم الخط کی اصلاح و ترقی کے لیے چند تجاویز پیش کی ہیں۔ مصر، ترکی اور ہندوستان کے مختلف مصاحف میں جن مختلف رسوم الخط کی پابندی کی گئی ہے ان سب کی خصوصیات پر نظر ڈال کر مولانا نے ایک ایسا رسم اختیار کیا ہے جس میں سب کی مفید خصوصیات جمع کر دی گئی ہیں۔ اگر اہل علم حضرات اس پر غور کرکے اپنی اپنی تجاویز پیش کریں تو اس رسم الخط میں مزید اصلاح ہو سکتی ہے اور پھر ہندوستان میں اسی رسم کو جاری کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔"

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ - قرآن شریف الواح میں لکھا ہوا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں ملا بلکہ آپ نے جبرئیل امین کی زبان سے سنا اور اپنی امت کو سنایا۔ حضرت کے زمانے ہی میں حضرت کے حکم سے قرآن شریف لکھا گیا مگر متفرق طور پر کہیں کاغذ پر کہیں پتوں پر کہیں شانے کی ہڈیوں پر۔ مگر حافظ قرآن بکثرت تھے ان میں سے ممتاز جن سے قرآن شریف کی روایت ہے حسب ذیل ہیں۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کاتب وحی رسول اللہ تھے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جنگ مسیلمہ میں حفاظ قرآن بہت شہید ہوئے تو انہوں نے تمام نوشتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ان نوشتوں کو ایک مصحف کی صورت میں ترتیب دیا۔ اور ان کی سات نقلیں کر کے مختلف ممالک میں روانہ کیں۔ ابتدائی زمانہ میں نہ رسم الخط درست تھا نہ قرآن شریف کو اعراب لگا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک شخص نے پڑھا اِنَّ اللہَ بَرِیٌٔ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلِہٖ بجسر لام حالانکہ قرآن شریف میں وَرَسُوْلُہٗ ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نحو کی طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا اور حضرت علیؓ نے ابوالاسود دُئلی کو چند اصولی قواعد سنا کر قواعد نحو جمع کرنے کے لیے حکم دیا۔

مسلمانوں نے قرآن شریف کی حفاظت میں اتنی سعی و کوشش کی کہ لاکھوں حافظ اور لاکھوں ہی اس کے قاری ہیں کسی آیت کی کمی و زیادت تو کجا، زیر زبر کی غلطی تو کد ہر قلقلہ و ہمس۔ اخفا، اظہار، ادغام وغیرہ صفات میں بھی فرق نہیں آسکتا۔ مراکو سے چین تک صحیح قرآن شریف پڑھنے والے سب قاف کو مستعلیہ اور با قلقلہ ہی پڑھیں گے۔ لحن چاہے بدلا ہوا ہو۔ مگر تلفظ سب کا ایک ہوگا۔ یہ تو صوت اور تلفظ قرآن کی حفاظت ہے۔

قرآن شریف کے خط کی اتنی حفاظت کی گئی کہ بیان کر دیا گیا کہ اس میں الف کتنے ہیں اور با کتنے ہیں اور یا کتنے۔ کس لفظ پر قرآن شریف نصف ہوتا ہے (کہف میں وَلْیَتَلَطَّفْ پر)۔ تین روز میں قرآن پڑھنا چاہیں تو روز کتنا پڑھنا چاہیے۔ (منزل فیل یعنے فاتحہ۔ یونس لقمان)۔ ایک ہفتہ میں قرآن ختم کرنا چاہیں تو روز کتنا پڑھنا چاہیے۔ (فمی بشوق) یعنے فاتحہ مائدہ۔ یونس۔ بنی اسرائیل۔ شعراء و الصّٰفّٰت۔ قاف (ق)۔ مہینے بھر میں پڑھنا چاہیے کتنا پڑھنا چاہیے۔ (۱) الم (۲) سیقول۔ ۳۰ پارے۔

مسلمانوں نے حضرت عثمان کے زمانے میں لکھے ہوئے قرآن شریف کے رسم الخط کی تقلید کا

اہتمام کیا کہ کسی قسم کا فرق ہونے نہیں دیا۔ البتہ ترکوں کے ہاں ایک قرآن طبع ہوا ہے جس میں رسم الخط قرآنی کا اتباع نہیں کیا گیا ہے بلکہ جس طرح تلفظ ہوتا ہے اُسی طرح لکھا ہوا ہے۔

مطبوعہ ہند اور سلطنت مصریہ کے زیر نگرانی جو قرآن شریف طبع ہوا ہے، ان میں تلاوت کرنے والے کے لیے بڑی بڑی سہولتیں پیدا کی گئی ہیں۔ حالانکہ رسم مصحف عثمانی کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ قرآن شریف کو مشکل باعراب حجاج بن یوسف ثقفی نے لکھوا کر شائع کرایا جو عبدالملک کا سپہ سالار اعظم تھا۔ یہ اس مشہور ظالم کی ایک ایسی نیکی ہے جو قیامت تک رہے گی۔

اب میں اہل ہند و عرب و سلطنت مصریہ کے زیر نگرانی جو قرآن شریف طبع ہوئے ہیں ان کے اختلافات کو بیان کرتا ہوں

(۱) ا۔ الف ہمیشہ ساکن بے ضغطا و بغیر زبان کے جھٹکے سے کے نکلتا ہے اگر کسی الف نما حرف پر جزم دیکھو تو اس کو ہمزہ سمجھو جیسے ہندی ان یشا کو اہل مصر اس طرح لکھتے ہیں اُن یشأ یہ چیز قابل تقلید ہے۔

(۲) الف زائد کبھی رسم الخط میں کوئی علامت نہیں رہتی مگر الف رہتا ہے جیسے ملك کہ وہ مالك ہے۔ اہل ہند "میم" پر کھڑا زبر دیتے ہیں۔ مٰلك اور مصری سلطانی قرآن شریف میں میم کے زبر کے ساتھ چھوٹا الف لکھتے ہیں۔ مَٰلك۔

(۳) کبھی الف زائد ہوتا ہے لیکن پڑھا نہیں جاتا جیسے ثمود ا لااذ بحنہٗ عام قرآن شریفوں میں اس امر پر متنبہ کرنے کے لیے کوئی علامت نہیں۔ البتہ یسرنا القرآن کے قرآن شریف میں غیر ملفوظ الف پر کہیں کہیں چلیپا بنایا ہے مثلاً لا أذ بحنہٗ مصری قرآن شریف میں گول صفر ہر جگہ دیا گیا ہے۔ ثمودَاْ لَاۡاَذۡبَحَنَّهٗ جو قابل تقلید ہے۔

(۴) کبھی و لکھا جاتا ہے اور الف پڑھا جاتا ہے جیسے الصلوۃ۔ ہندی رسم الصّلوٰۃ مصری رسم الصَّلوٰۃ۔

(۵) کبھی ایک شوشہ یا دندانہ ہوتا ہے۔ اور الف پڑھا جاتا ہے جیسے۔ مکیل ہندی رسم مِیکَیل هو لهٗ۔ مصری میکیل۔ هَوَ لهٗ۔

(۶) کبھی وصل کی حالت میں صرف فتحہ پڑھا جاتا ہے۔ اور وقف کی حالت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے۔ انا۔ لکنا۔ سلا سلا۔ مصری مصحف میں اس کی علامت لمبا صفر دیا گیا ہے جیسے۔ انا۔ لکنا۔ سلا سلا جو قابل تقلید ہے۔

(۷) کبھی الف یا واو یا یا لکھی نہیں جاتی مگر پڑھی جاتی ہے جیسے ہندی لا لف مصری لای الف۔ ہندی بہ مصری بِهٖ۔ ہندی لہ مصری لَهٗ۔ ہندی النبیین مصری النَّبِيّٖنَ۔ ہندی داود مصری داوٗد۔

(۸) ہمزہ وصل حالت وصل میں گر جاتا ہے اور بوقت ابتدا متحرک و باقی رہتا ہے۔ رسم ہندی میں ہمزہ وصل وصل میں گر گیا ہو تو اس پر حرکت نہیں دیتے۔ اگر ابتدائے آیت میں ہو تو اس کو حرکت دیتے ہیں۔ رسم مصری میں ہمزہ وصل پر (ص) کی علامت دیتے ہیں اور حمیدیہ مصحف میں ہر جگہ سرخی حرکت بھی دیتے ہیں۔ ہندی الحمد للہ رب العلمین مصری حمیدی الحمد للہ ربّ العلمین۔ ہندی الرحمٰن الرّحیم۔ مصری حمیدی الرحمٰن الرحیم۔

(۹) مد دو طرح پر ہے (۱) مد متوسط کی علامت یہ ہے اور مد طویل کی علامت یہ ہے مگر اس کی پابندی کوئی نہیں کرتا حتیٰ کہ مصری مصحف میں بھی دونوں کی علامتوں میں تمیز نہیں۔

(۱۰) نون ساکن قبل حروف یرملون نون ساکن حروف یرملون میں مدغم ہوتا ہے۔ اس حرف پر شدّ دیا جاتا ہے۔ جیسے ہندی رسم میں۔ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ۔ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا مصری رسم میں خُشُبٌ

مسندہ۔ غفورا رحیما۔ یومئذ ناعمہ۔ اعراب اس طرح دیتے ہیں ـُـُـ معلوم ہے کہ غیر را ولام میں غنہ رہتا ہے۔ لہذا اس کی علامت (غ) بھی ضرور ہے۔

(۱۱) نون ساکن قبل حروف حلقی مظہر رہتا ہے۔ وہاں کسی علامت کی ضرورت نہیں لہذا مصری اعراب اس طرح ہے ـُـً

(۱۲) نون ساکن قبل حروف غیر حرف حلقی و یرملون میں صرف بمبئی کے ایک قرآن شریف میں اخفا کی علامت (خ) لکھی ہوئی ہے۔ اور دوسرے مصاحف میں کوئی علامت نہیں ہے۔ مصری میں ـُـُـ میری رائے میں بمبئی کے قرآن شریف کا اتباع ضروری ہے۔

(۱۳) نون ساکن قبل با میم ہو جاتا ہے لہذا اس کی علامت چھوٹی میم ہے جیسے من بعد انبئت ہندی الیم ابما مصری الیم بما۔

(۱۴) میم قبل با میم ساکن قبل با میں بھی غنہ پیدا ہوتا ہے۔ اس پر بھی (غ) کی علامت ہونی چاہیے

(۱۵) میم۔ اگر میم مشدد ہو تو غنہ پیدا ہوتا ہے جیسے ثُمَّ۔ عَمَّ۔ بمبئی کے ایک قرآن میں جہاں جہاں غنّہ پیدا ہوتا ہے اس حرف پر (غ) کی علامت دی گئی ہے۔ عام طور پر یہ علامت نہیں ہوتی جو ضروری ہے۔

(۱۶) بعض دفعہ رفع اجتماع ساکنین کے خیال سے نون تنوین کو متحرک کر دیتے ہیں اس کے لئے عرب و مصر کے مصاحف میں کچھ انتظام نہیں مصاحف ہند میں اس طرح ہے اور ہونا بھی چاہیے مبین ن اقتلوا قدیر ن الذی۔ اس نون کو اہل ہند نون قطنی کہتے ہیں۔

(۱۷) غیر یا و دور پر فتحہ کے ساتھ تنوین ہو تو وقف کی حالت میں الف سے بدل جاتی ہے اور اسی لیے اس کے ساتھ الف بھی لکھتے ہیں۔ جیسے۔ شیئًا۔ شیبًا بعض دفعہ الف نہیں ہوتا وہاں علامت کی ضرورت ہے مثلاً (ف ا) یا جیسے ضُحٰی۔ نِسَآءً مُصَلًّی۔

(۱۸) ت ۔ تا تا کہیں دراز ہے کہیں گول ۔ دراز ہر تا پر وقف کرنا چاہیے ۔ گول پر ہا ۔ مطابع
ہند میں اس کی کما حقہ تحقیق نہیں کی جاتی ۔ مطبع نظامی کے قرآن شریف میں المار قرآنی کو حاشیہ پر
فارسی زبان میں لکھا ہے ۔

(۱۹) بعض دفعہ لکھا ہوا (ص) رہتا ہے اور ص سے س یا دونوں جائز ہیں مگر ص اولیٰ ہے
جیسے یبصّط فی الخلق ۔ یصّطہ ان میں س کا تلفظ ہے ۔ (المصیطرون (س ۔ ص) دونوں
صحیح ہیں مگر ص اولیٰ ہے مگر یہ مصری مصحف میں ہے ہندی مصحفوں میں اس کا انتظام نہیں ۔ صرف بعض کے
اوپر س لکھ دیتے ہیں میری رائے میں تقلید مصری ضروری ہے ۔

(۲۰) بعض مقامات میں را سے پہلے کسرہ عارضی یا اس کے بعد حرف مستعلیہ ہو تو را مفخم پڑھی
جاتی ہے ۔ میری رائے میں ایسے را پر (ف) لکھنا چاہیے ارجعوا مرصاد ۔

(۲۱) روایت حفص میں ایک جگہ امالہ ہے امالہ کی علامت ٥ بسم اللہ مجریھا ۔ یہ
علامت صرف مصحف مصری ہی میں ہے ۔ میری رائے میں (امالہ) لکھ دینا چاہیے ۔

(۲۲) روایت حفص میں ایک جگہ اشمام ہے اشمام کی علامت مالک لا تامنا علیٰ
یوسف یہ اشارہ صرف مصحف مصری میں ہے ۔ میری رائے میں شم لکھنا چاہیے ۔

(۲۳) روایت حفص میں ایک جگہ تسہیل ہے تسہیل کی علامت ءاعجمی وعربی یہ اشارہ
مصحف مصری میں ہے میری رائے میں (تسہیل) لکھ دینا چاہیے ۔

(۲۴) حفص کی روایت میں چند ہی جگہ سکتۂ صحیحہ ہے اور ہندی مصاحف میں بہت جگہ سکتہ
لکھا ہوا ہے جو درست نہیں ۔ لہٰذا ان مقامات میں (سکتہ صحیحہ) لکھنا چاہیے ۔ اور باقی تمام مقامات
میں سکتہ کا لفظ نہ لکھنا چاہیے ۔

(۲۵) عموماً قرآن شریف میں یومیذ ہے صرف دو جگہ یومئذ ہے اور عموماً فیہ ہے ایک جگہ

فیہ یا فیہٖ ہے اور عموماً علیہ ہے اور ایک جگہ علیہُ ہے ان سب مقامات میں ایک خط کھینچ دیا جائے تو تیز پڑھنے والا متنبہ ہو جائے گا۔ کیونکہ تیز پڑھنے والے کی زبان حسب عادت چل جاتی ہے۔ یومئذ۔ فیہ۔ علیہ نیز ہر اس جگہ کہ آدمی بے توجہی سے غلطی کرتا ہے بخیال تنبیہ اس پر خط کھینچنا بہتر ہے۔

(۲۶) وقف کے علامات بلا تحقیق لکھے جاتے ہیں مصحف مصری علامات وقف بڑے اہتمام سے مجلس علماء و قراء کے تصفیہ کے بعد لکھتے ہیں۔ میری رائے میں مصری علامات وقف پر اعتماد کرنا چاہیئے۔

(۲۷) ہندی مصاحف میں رکوع کی علامت (ع) ہے مثلاً ع ۲/۲۰ سورت سے دوسرا رکوع ہے۔ (۲۰) اس رکوع میں بیس آیتیں ہیں۔ (۴) پارے سے چوتھا رکوع ہے میری رائے میں رکوع کا ہونا ضرور ہے۔

(۲۸) آیات کا نمبر مصری مصحف میں ہے اور بعض ہندی مصحف میں بھی ہے۔ میری رائے میں آیت کا نمبر دینا بھی ضروری ہے۔

(۲۹) مصحف ہندی میں سی پارہ یا جزو ابتدا صفحہ سے لکھتے ہیں۔ تاکہ کئی آدمی ملکر ختم کر سکیں مصحف عرب میں اس پر کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ میری رائے میں مصحف ہند کا اہتمام ضروری ہے۔

(۴۰) عربی مصاحف میں جزو کو ۴ مقراہیں تقسیم کیا گیا ہے غیث النفع وغیرہ میں اس کے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا حسب مصحف مصری مقرا بھی لکھا جائے۔

میں نے تمام مختار علامات کے ساتھ جو مصحف ہندی و مصری سے جمع کئے گئے ہیں چند سورتیں اور آیات لکھی ہیں تاکہ قرآن شریف تلاوت کرنے والوں کو ان سے جو سہولت ہوتی ہے اس کا اندازہ ہو سکے۔

انسانیت کی تقسیم کے چند مختلف پہلو

از جناب مولانا مناظر احسن گیلانی استاذ کلیہ جامعہ عثمانیہ

(۳)

سلسلہ اشاعت رجب ۱۳۵۴ھ

ظاہریوں کی باطنیت و معنویت یا خارجی اوصاف اور بیرونی اضافات و امتیازات کی بنیادوں پر انسان کی تقسیم اگر غلط ثابت ہوئی تو اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا؟ آخر جس کا سب کچھ اندر تھا، دھوکہ کھانے والوں نے کیوں دھوکہ کھایا جب انھوں نے اس کو باہر میں ڈھونڈھا؟ پتھر سے پانی کون نچوڑ سکتا ہے کیا تم مرچ سے شکر نکالو گے؟ نیم کی شاخوں سے کس نے انگور توڑے ہیں؟

دلوا نو! جو اندر تھا، کیوں نہیں تقسیم کے وقت بھی تم نے اس کے اندر ہی جھانکا؟ اور جن کی نظر انسان کے چرم و استخوان پر نہیں اس کی خوابگاہ، سیرگاہ پر نہیں، اصطلاحی اور من مانے الفاظ اور بولیوں پر نہیں نسبی اور اضافی رشتوں پر نہیں بلکہ ان کمالات و جذبات پر پڑی جنہوں نے انسان کو انسان بنایا ہے اور جن کا نام واقع میں انسانیت ہے، ہر زمانہ میں ہر ملک میں ان صادق دانش والوں نے انسان کو باطنی اوصاف ہی کی بنیاد پر مختلف صفوں میں کھڑا کیا بلکہ وہ بھی جو فریب کھانے یا فریب دینے کے وقت انسان کی سطح پر تیرتے اور دوسروں کو تراتے ہیں جب واقعات کے عالم میں آتے ہیں اور وہم و فرض کے دائروں سے نکل کر حقیقت کے میدان میں اترتے ہیں تو کیا نہیں دیکھتے کہ وہی جو رنگ و بیرنگی کے وسوسوں کی پچکاریوں سے انسانیت کی فضا کو مکدر کر رہے تھے، اور کاغذی خطوط، اطلسی نقوش کو دکھا دکھا کر ابلہوں کے شعوری غنود سے نفع اٹھا کر اس مغالطہ کے

جال میں دنیا کو تڑپا رہے تھے، کہ جو لکیریں کاغذ کی سطح پر ہیں، دیکھو نہیں بلکہ سمجھو اور صرف سمجھو کہ وا قعی
زمین کا چہرہ بھی ان سے داغدار ہے، اُف! جن ظالموں نے انسان کے منہہ کو بگڑا اور اس کی زبان
کو اس لیے مروڑا کہ دل کے خیالات ظاہر کرتے ہوئے ہوا میں تم وہی تموجات کیوں نہیں پیدا کرتے
جو ان کے لب دنداں سے پیدا ہوتے ہیں اور جنہوں نے شیر کے بچوں کو بزغالوں پر نہیں بلکہ آدم
ہی کی اولاد اور حوا ہی کے لڑکوں میں سے ایک کو دوسرے پر خون کا پیاسا بناکر اس لیے چھوڑا
کہ ان کا خون وہ نہیں ہے جو دوسرے میں ہے حالانکہ دونوں میں آدمی ہی کا خون تھا اور کوئی
ان میں نہ بھیڑیے کی نسل سے تھا نہ چکاروں کی پشت سے نکلا تھا نہ کوئی ان میں گھوڑوں کا پوتا تھا
اور نہ اونٹوں کا نواسہ گر بگاڑ کے ان بانیوں کو جب سنوارنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس
وقت بھی تقسیم کے بیرونی وجوہ کا کیا اسی طرح انکار نہیں کرتے جس طرح میں ان کی واقعیت کو مسلسل
جھٹلاتا چلا آرہا ہوں؟

ذہنی رجحانات، باطنی احساسات، خیالی حیات کے سوا ان کے سامنے اور کیا رہتا ہے،
جب یہ پارٹیاں بناتے ہیں اور جماعت بندیوں کی طرح ڈالتے ہیں؟ گرم و نرم قدامت پسند
رجعت پسند لبرل و لیبر خدا جانے کیا کیا اصطلاحیں ہیں۔ بتایا جائے کہ انسان کی یہ صرف باطنی
تقسیم ہی نہیں ہے؟ لیکن یہ تقسیم اصلاح کے لیے ہوتی ہے، اور وہ بانٹ افساد کے لیے تھی، یقیناً
وہ بھی جب ملانا چاہتے ہیں تو اندر ہی دیکھتے ہیں پر جب لڑانا چاہتے ہیں تب باہر آکر مغالطوں
کی وہ گیس پھیلاتے ہیں جسنے کتنوں کو ختم کیا اور کتنے دنیا کے ہر خطہ میں اب تک بے ہوش پڑے ہیں۔
پھر جو الجھے ہوؤں کو سلجھانے کے لیے آئے اور ہر جگہ آئے (صلوٰت اللہ علیہم والسلام)
کس قدر غلط بات ہوتی اگر وہ بھی انسانیت کی تقسیم کے وقت انسان کو باہر سے دیکھتے! بلاشبہ
جو تقسیم، تفریق کے لیے ہوگی اس میں ہمیشہ باہر کو دیکھا جائے گا۔ جیسا کہ بار بار دہراتا آرہا ہوں کہ

یہی وہ فصل ہے جو وصل سے بدل نہیں سکتا۔ یہی وہ ڈھکیل ہے جس سے میل پیدا نہیں ہو سکتا، اور یہی وہ راہ ہے جس کی کوئی منزل نہیں، ایسی راہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن جن کی تقسیم نظم کے لیے ہے، جن کا انفصال اتصال کے لیے ہے، جن کا توڑ جوڑ کے لیے ہے تم نے کیوں آرزو کی کہ کاش ملانے والوں کا یہ پاک و برگزیدہ گروہ بھی وہی کرتا جو لڑانے والوں نے کیا؟

هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ

بیناؤں سے تم نے وہ امید باندھی جو اندھے کرتے ہیں، داناؤں سے تم وہ مانگتے ہو جو نادان دیتے ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

مذہبی اختلافات کی اہمیت | شائد جس طرح دو چہرے باہم اس طرح نہیں ملتے کہ ایک کی وجہ سے دوسرا نہ پہچانا جائے، اور باوجود دو ہی آنکھوں دو ہی کانوں، ایک ناک اور دو نتھنوں، دو ابروؤں اور ایک پیشانی کے جو ہر چہرے پر ہر شخص کے لیے ہے اور ایک ہی جگہ پر ہے، نہ کسی کی آنکھیں سر کی چندیا میں ٹھونکی گئیں، اور نہ کسی کی ناک کلوں میں جڑی گئی، نہ کسی کے لب پیشانی پر چڑھا دیے گئے، تاہم لاکھوں کی بھیڑ میں کس نے اپنے بچے کو اس لیے گم کیا کہ اس کا لخت جگر دوسرے کے لڑکے سے ممتاز نہیں ہوتا تھا؟ حتیٰ کہ بے رنگوں کے جس گروہ کو زنگدار قومیں کچھ ایک ہی شکل و صورت کی پاتی ہیں لندن کے میلوں پیرس کے جھمیلوں میں انیت کی غلطی کو میں نہیں کہتا لیکن شناخت کی غلطی سے کیا کسی نے دوسرے کی بیوی کو کبھی اپنی بیوی ٹھیرایا؟ ریوٹر نے شائد کبھی ایسی خبر نہیں پھیلائی، اور نہ ہافاس نے اس واقعہ سے دنیا میں سنسنی پیدا کی، بلاشبہ۔

فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۔ جس صورت و شکل میں خدا نے چاہا اے انسان تجھے بنا ڈالا یہ کا آیک مدہش نظارہ ہے۔ کثرت کے اس گھنے جنگل میں وحدت شیئیہ وارادہ کا یہ ہو با

تماشا ہے لیکن چہرے تو پھر بھی طول رکھتے ہیں، ان کا عرض بھی کافی ہے، اس سے بھی بڑھ کر جینا ہوئی کے لیے خیرگی کا سامان ان زبانوں میں ہے جن کی وسعت کی پیمائش بمشکل انچ دو انچ کی جا سکتی ہے، ہر منہ میں گوشت کا ایک انچی ٹکڑا ہے، سب میں وہی پٹھے ہیں وہی رگیں ہیں، وہی ریشے، وہی اعصاب لیکن باوجود اس وحدت کے کیا زید کی آواز بکر کی پکار سے مخلوط ہو سکتی ہے؟ کون بول رہا ہے پہچانا جاتا ہے، خواہ وہ سامنے ہو یا کسی دیوار کی اوٹ سے بول رہا ہو، ارادہ کی قوت اور کیسی زبردست قوت ہے جس نے ایک کو ہر ایک سے باہم جدا کر دیا ہے

وَمِنْ اٰیٰتِهِ اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ (اللہ کے پتوں میں سے ایک پتہ زبانوں اور رنگوں کا اختلاف بھی ہے)

تم نے ملکوں اور قوموں ہی کی زبانوں کو صرف جدا سمجھا لیکن جو اس سے بھی زیادہ گہرائیوں میں جاتے ہیں ان کو تو ہر ایک کی زبان، ہر زبان کی ہر آواز دوسروں کی زبان سے بالکل جدا نظر آتی ہے اور یہی حال چیزوں کے رنگوں کا ہے دو ماں جائے بھائیوں کے رنگ و روغن بھی ہر حیثیت سے ایک دوسرے کے مانند نہیں ہوتے۔

کثرت میں وحدت کی یہی وہ نمائش ہے جس نے انسان کو نشان ابہام (انگوٹھے کے نشان) کا علم عطا کیا، اور جس پر قانون کے ایک بڑے حصہ کی بنیاد قائم ہے۔

بہرحال جس طرح ایک شخص کی صورت دوسرے کی صورت سے نہیں ملتی ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے جدا ہوتی ہے، ہر شخص کے انگوٹھے کی لکیریں دوسروں کے انگوٹھوں کے نشانات سے ممتاز ہوتی ہیں، لاکھوں کروڑوں میں ممتاز ہوتی ہیں اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ باوجود انسان ہونے کے ہر انسان کی فطرت، ہر ایک کی سمجھ، ہر ایک کی طبیعت، ہر ایک کا دماغ، ہر ایک کا فہم اپنے شخصی وجود میں کوئی ایسی خصوصیت و شاکلہ ضرور رکھتا ہے جو اس کو ان لوگوں سے جدا کر دیتا ہے جن کے متعلق عام طور پر دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں کم فطرۃ

ہم خیال ہم فہم، ہم دماغ ہیں۔ ہوتا ہے، اتحاد ہوتا ہے ہزار ہا نقاط تک دو آدمیوں میں
ہوتا ہے، ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اکثر امور میں اشتراک کے یہ معنی قطعاً غلط ہیں کہ سب با
میں اشتراک ہے، تجربہ کر واپنے اپنے دوستوں کو جانچو! جن سے تمہارے دل ملے ہوئے
ان میں تولو! ساتھ دیں گے۔ بہت دور تک تمہارا ساتھ دیں گے، دیتے چلے جائیں گے لیکن
ناممکن ہے کہ بالآخر وہ اختصاصی نقطہ نہ نکل آئے جو تم کو اس سے اور اس کو تم سے جدا نہ کر
او یہیں کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِهٖ کی تفسیر مکمل ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ بھی ایک مق
جہاں ادراک وتعقل کی ساری تعلیلی لن ترانیاں "ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْ
نہ ملنے والی چٹانوں کے نیچے دب کر رہ جاتی ہیں۔

بلاشبہ متین قوت والے قادر ومقتدر نے کثرتی وحدت اور وحدتی کثرت کی
حیرت انگیز نزاکتوں میں اپنی طاقتوں کی نمائش کی ہے، قابو! اور کیسا آہنی قابو ہے
مشاہدہ ہو رہا ہے، میں تو صرف دو آدمیوں کے متعلق کلی اشتراک اور تام وحدت کا انکا
ہوں لیکن جن کی نگاہیں زیادہ تیز اور زیادہ خوردبین ہیں انہوں نے گلاب کی دو پنکھ
کو بھی باہم ہر اعتبار سے یکساں نہیں پایا۔ وحدت میں کثرت کی یہ کارفرمائیاں، انس
حیوان، نباتات، جماد، محسوس نامحسوس غیب وشہادت سب کے لیے عام ہیں کہ مقصود
کمالات کا ظہور ہے تو دو چیزوں سے ایک ہی کمال کی نمائش کس طرح ہو سکتی ہے۔ روحانی
والے اسی کی تعبیر میں کہتے ہیں کہ "تجلیات میں تکرار ناممکن ہے ورنہ خالق پر عبث کاری
عائد ہوگا۔" اور وہ جو ؎

یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

تم رندانِ مست کی زبان سے سنتے ہو کیا وہ بھی وہی نہیں کہہ رہا ہے جسے تم نے عالی مقام صوفیوں سے سُنا؟ کثرت و وحدت کی ان پیچ در پیچ گتھیوں میں الجھے ہوئے عالم میں اس کی آس باندھنی کیسی بوالفضولی ہوگی کہ سب کا خیال ایک ہو، سب کی سمجھ ایک ہو، جو ایک سوچتا ہے وہی سب سوچیں جو ایک پاتا ہے وہی سب پائیں، اور جب ایسا نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہوا نہ آئندہ ہو سکتا ہے بلکہ ایسا ہونا ناممکن ہے تو پھر ان ابلہوں کو کون سمجھائے جو اپنی تقریروں سے، تحریروں سے، شور سے، شغب سے، غل سے غپاڑے سے، ٹھٹھوں سے قہقہوں سے دیوانوں کو یہ باور کراتے پھرتے ہیں کہ ان سارے اختلافات کا ذمہ دار مذہب ہے، سو وہ بانیانِ مذہب ہیں جنہوں نے بجائے باہر کے انسان کو اندر سے، بجائے خارجی صفات، اضطراری اوصاف، وہمی اضافات، نسبی تعلقات کے آدمی کو باطنی خیالات، اندرونی جذبات ذہنی احساسات کی بنیادوں پر جانچا اور ان ہی اساسوں پر ان کو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا؟

کیسے لوگ ہیں! جن اختلافات کا ذمہ دار خود انسان تھا انہوں نے ان کی ذمہ داری انسان پر نہیں بلکہ انسان کے مذہب اور دین کے سر تھوپ دی۔ لڑتا انسان ہے لیکن احمق چلّاتے ہیں کہ انسان کا مذہب لڑ گیا۔ اختلاف آدمیوں میں ہے لیکن بے وقوف چیختے ہیں کہ یہ اختلاف آدمیوں کے مذہب میں ہے، حالانکہ میں کہہ چکا کہ "موجودہ نظامِ ہستی" کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت رکھتا ہے جو اس کو بالآخر کہیں نہ کہیں کائنات کی تمام چیزوں سے جدا کر کے ایک ایسی مخصوص و متعین چیز قرار دیتی ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ایسا کوئی نہیں فطرت کا یہ اٹل قانون ہے دنیا کی ساخت اسی قالب پر ڈھلی ہے جس کی نمائش پتے پتے، بوٹے بوٹے میں ان لوگوں کے لیے بے نقاب ہو کر ہو رہی ہے۔ جو دیکھ سکتے ہیں۔ اور جنہیں تحقیق کی بینائی بخشی گئی ہے۔

فطرت کے اسی ناقابلِ مقابلہ قانون کا ظہور جب آفاقی کائنات کی پیشانیوں سے ہوتا ہے تو وہی جو انسانی اختلافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے، وہ

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

کے ساتھ اپنے بربطوں پر ناچتے ہیں، تھرکتے ہیں، تالیاں بجاتے ہیں، مگر جہان کے ایک جز انسان کے اندر سے جب اسی اختلاف کے آثار جھلکنے لگتے ہیں تو اس وقت ان کا ہذیان قابلِ دید ہوتا ہے۔ جب انسانی اختلافات کا غلط الزام مذہب کے سر منڈھ کر یہ دین اور دین کے علمبرداروں (علیہم السلام) کے متعلق اول فول کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، سب و شتم گالیاں دشنام طرازیاں، لعنت پھٹکار، کوئی ایسی چیز رہ جاتی ہے جسے ان کا قلم نہ اگلتا ہو اور ان کے ساتھ ان کی زبان نہ بڑبڑاتی ہو؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کی عمیق ترین گہرائیوں سے ایک بڑی کوڑی لائے، جب مذہبی اختلافات کا افسانہ سنا سنا کر مذہب سے باغی بنانے کے لیے آدمی کی توجہ باطن سے ہٹا کر ظاہر کی طرف یہ پھیرتے ہیں، ان میں کوئی رنگ کا شگوفہ چھوڑتا ہے، کوئی زبان کا جھنڈا کھڑا کرتا ہے، کوئی ان فرضی لکیروں اور وہمی دائروں کا بھجن گاتا ہے جنھیں سب دیکھنا چاہتے ہیں لیکن کسی نے نہیں دیکھا۔ کوئی نسب کے شجروں کو بانسوں میں باندھ کر ہوا میں اڑاتا ہے، اور وہ مسکین بیچارا انسان جس کی ساری پونجی اندھی بوکھلاہٹ میں سب کچھ کھو بیٹھتا ہے لیکن جس کے لیے کھوتا ہے اسے بھی نہیں پاتا کہ وہ اختلاف سے بھاگا تھا، اسے انسان کے شخصی و فطری اختلافات و ذہنی سے مذہب کا اختلاف باور کرایا گیا تھا لیکن باطن کو چھوڑ کر جب وہ ظاہر کی عمق سے سطح پر آیا تو یہاں بھی سب کچھ تھا جس کی مذمت باطن میں کی گئی تھی۔ رنگ کا اسکول ہو، یا زبان کا، نسل و خون کا اسکول ہو یا ملک اور وطن کا، کہاں اختلافات کی وہ قسمیں نہیں ہیں جن کا خواہ مخواہ الزام مذہب اور مذہب والوں کے عماموں میں باندھا گیا ہے

حقوق زوجین

(۵)

قرآن مجید چونکہ ایک اصولی کتاب ہے اس لیے ان جزئی مسائل کو جو ازدواجی معاملات کی تفصیلات سے تعلق رکھتے ہیں اس تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے لیکن چند ایسے وسیع اصول بیان کر دیے گئے ہیں جو تقریباً تمام جزئیات پر حاوی ہیں اور قانون سازی میں بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ پس قانون کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے قواعد و اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔

(۱) وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ (۲: ۲۷) وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا (۲: ۲۷) وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ (۵: ۱)

ان آیات میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہل کتاب کی عورتیں اس کے لیے حلال ہیں۔ مگر مسلمان عورت نہ مشرک کے نکاح میں آ سکتی ہے نہ اہل کتاب کے۔

۲- وَلَا تَنكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ ...... وَلَا تُنكِحُوا الْمُشْرِكِينَ (۲: ۲۷) وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ (۲۴: ۴) فَانكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ (۴: ۴)

ان آیات سے یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کو خود اپنا نکاح کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اور اس میں کسی کو مداخلت کا حق نہیں لیکن عورت کے نکاح میں اس کے اولیاء اور عزیز و قریب مردوں کی رائے کا دخل بھی ہے اور وہ اپنے نکاح کے معاملہ میں بالکل آزاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حدیث نبوی الایم احق بنفسها من ولیها اور لا تنکح البکر حتی تستاذن کی رو سے نکاح کے لیے عورت کی رضا ضروری ہے، اور کسی کو اس پر جبر کرنے کا حق حاصل نہیں، مگر چونکہ عورت کے نکاح کا مسئلہ خاندان کے مفاد سے ایک گہرا تعلق رکھتا ہے اس لیے قرآن مجید نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ شادی کے معاملہ میں تنہا عورت کی خواہش کافی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار مردوں کی رائے کو بھی اس میں دخل ہے۔

(۳) فَمَا اسْتَمْتَعْتُم بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (۴: ۴) وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ

وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ (۴ : ۲۱)، فَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ .... فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ (۲ : ۲۳۱)۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر اُس تمتع کا عوض ہے جو مرد اپنی بیوی کی مقاربت حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا مقاربت کے بعد ہی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور کسی صورت میں وہ ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ عورت یا تو اپنی خوشی سے معاف کر دے (فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا) یا خلع کے معاوضہ میں چھوڑ دے (فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ)۔

(۴) وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا۔ (۴ : ۳)۔

یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ شریعت میں مہر کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے لہٰذا قانون کے ذریعہ سے اس کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

(۵) اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ (۴ : ۶)۔

اس آیت کی رو سے نفقہ مرد پر عورت کا واجبی حق ہے اور یہ ان حقوق زوجیت کا معاوضہ ہے جو رشتہ نکاح سے مرد کو عورت پر حاصل ہوتے ہیں۔ عورت کا یہ حق کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتا الا یہ کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو جائے یا نشوز کی مرتکب ہو۔

(۶) وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (۲ : ۳۱)۔

یہاں نفقہ کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی تعیین میں مرد کی استطاعت کا لحاظ کیا جائیگا مالدار مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق نفقہ ہے اور غریب مرد پر اس کی استطاعت کے مطابق۔

(۷) وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (۴ : ۶)۔

اس آیت کی رو سے مرد کو سزا دینے کا اختیار صرف اس صورت میں دیا گیا ہے جب کہ عورت نشوز اور عدم اطاعت کی روش اختیار کرے۔ اور اس صورت میں بھی سزا کی صرف دو شکلیں مقرر کر دی گئی ہیں۔ ایک ہجر فی المضاجع یعنی ترک صحبت۔ دوسرے ضرب غیر مبرح یعنی ہلکی مار جو صرف انتہائی درجہ کے نشوز میں جائز ہے۔ اس حد سے تجاوز کرنا یعنی بغیر نشوز کے سزا دینا، یا کم درجہ کے نشوز پر انتہائی سزا دینا، یا انتہائی نشوز پر ضرب غیر مبرح کی حد سے گذر جانا ظلم میں داخل ہے۔

(۸) وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا (۴: ۶)۔

اس آیت میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ اگر میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے اور خود آپس میں صلح کر لینے کی کوئی صورت نہ پیدا ہو تو ایک شخص مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک شخص عورت کے رشتہ داروں میں سے بطور حکم مقرر کیا جائے، اور دونوں حکم مل کر ان کے جھگڑے کا تصفیہ کریں۔ وَإِنْ خِفْتُمْ اور فَابْعَثُوا کے مخاطب مسلمانوں کے اولی الامر ہیں، اس لیے حکم مقرر کرنا انہی کا کام ہے، اور اگر حکمین کوئی تصفیہ نہ کر سکیں تو آخر میں تصفیہ کا اختیار انہی کو حاصل ہے۔

(۹) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ۔ (۲: ۲۹)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ زوجین کے معاملات میں فیصلہ کرتے وقت قاضی کو سب سے زیادہ جس امر کا لحاظ کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ آیا وہ دونوں اپنے ازدواجی تعلق میں حدود اللہ قائم رہ سکیں گے یا نہیں؟ اگر ظن غالب اس امر کا ہو کہ حدود اللہ ٹوٹ جائیں گی تو پھر کوئی چیز اتنی اہمیت نہیں رکھتی کہ اس کی خاطر زوجین کے درمیان جمع کا فیصلہ کرنا جائز ہو۔ سب سے اہم اللہ تعالیٰ کی حدود کا تحفظ ہے۔ اور اس کے لیے اگر ضروری ہو تو ہر چیز قربان کر دی جا سکتی ہے۔

وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (۲: ۲۹)۔

(۱۰) وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا (۲: ۲۹)۔

اس آیت میں قانون اسلامی کے ایک دوسرے اہم قاعدہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی عورت کسی مرد کے بند نکاح میں اس طرح نہ رو کی جائے کہ اس کے لیے موجب ضرر اور وجہ حق تلفی ہو۔ معاشرت ہو تو بالمعروف ہو (وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ) اگر روکا جائے تو معروف کے ساتھ روکا جائے (فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ) جہاں اس کی کوئی امید نہ ہو، اور اس کے برعکس ضرر اور حق تلفی کا خوف ہو، وہاں تسریح باحسان پر عمل کرنا ضروری ہے، کیونکہ حسب ارشاد نبوی اسلام کے قانون میں نہ کوئی چیز ضرر پہنچانے والی ہے اور نہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ کسی کو ضرر پہنچایا جائے: لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ فِی الْاِسْلَامِ۔

(۱۱) فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ (۴: ۱۹)۔

یہ آیت اگرچہ ایک خاص موقع کے لیے نازل ہوئی ہے مگر اس کے آخری ٹکڑے میں ایک عام قاعدہ کی تعلیم دی گئی ہے، وہ یہ کہ کسی عورت کو ایسی حالت میں نہ چھوڑا جائے کہ وہ ایک شخص کے رشتہ نکاح میں بندھ کر معلق ہو جائے، یعنی نہ تو اس کو شوہر کی معیت اور معاشرت ہی نصیب ہو اور نہ کسی دوسرے شخص سے نکاح کر لینے کی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِن نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ (۲: ۲۸)۔

اس آیت میں عورتوں کی اوسط قوت برداشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یعنی چار مہینے تک وہ ضرار اور حدود اللہ سے تجاوز کے بغیر شوہر کی صحبت سے محروم رکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد دونوں میں سے کسی ایک چیز کا خوف ہے۔ اس آیت کا بھی ایک خاص محل ہے، مگر یہ اپنے محل کے علاوہ دوسرے معاملات میں بھی رہنمائی کرتی ہے۔

(۱۳) وَالَّذِينَ يَرْمُونَ أَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُن لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنفُسُهُمْ (۱: ۲۴)

اس آیت میں لعان کا قانون بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہی نہ پیش کر سکے تو اس سے چار مرتبہ قسم لی جائے گی کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے، اور پانچویں بار یہ کہلوایا جائیگا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اس کے بعد عورت زنا کی سزا سے صرف اس طرح بچ سکتی ہے کہ وہ بھی چار مرتبہ یہ قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر اس کے شوہر کی بات سچی ہو تو اس پر خدا کا غضب نازل ہو۔ اس طرح جب ملاعنت کی تکمیل ہو جائے تو زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔

(۱۴) اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ (۲: ۳۱)۔

اس آیت کے آخری فقرہ میں اس قاعدہ کی تصریح کی گئی ہے کہ عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں ہے، اور وہی اسے باندھنے اور کھولنے کا اختیار رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جہاں کہیں طلاق کا ذکر آیا ہے، مذکر کے صیغوں میں آیا ہے، اور اس فعل کو مرد ہی کی طرف نسبت دی گئی ہے مثلاً وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنْ طَلَّقَهَا۔ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ - یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شوہر بحیثیت شوہر ہونے کے طلاق دینے یا نہ دینے کا کلی اختیار رکھتا ہے، اور کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو اس کا یہ حق سلب کرتا ہو۔

لیکن اسلام میں تمام حقوق اس شرط کے ساتھ مشروط ہیں کہ ان کے استعمال میں ظلم اور حدود اللہ سے تجاوز نہ ہو۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ (۶۵: ۱) جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے وہ خود اپنے آپ کو اس کا مستحق بتاتا ہے کہ اس کا حق سلب کر لیا جائے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲: ۳۸۰) "نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا نقصان کیا جائے"۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے جو اسلامی قانون کے ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں جاری ہوتا ہے، اور مرد کا حق طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پس جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے ظلم و ضرر کی شکایت ہو تو بقاعدہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَ الرَّسُوْلِ اس کی شکایت اللہ اور رسول کے قانون پر پیش کی جائے گی اور اگر اس قانون کی نگاہ میں، اس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں (یعنی اولی الامر) کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہاء کی ایک جماعت نے بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں، اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں، اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں کہ اس کے اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔

(۱۵) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ۔ (۲ : ۲۹)

اس آیت میں طلاق کا نصاب بیان کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ دو مرتبہ کی طلاق رجعی ہے اور تیسری مرتبہ کی بائن۔

مسائل جزئیہ | ان اصولی احکام کو جس ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اب اسی ترتیب کے ساتھ ہم ان جزئی مسائل کو بیان کریں گے جو ان سے ہر ایک اصل کے تحت آتے ہیں، یہاں ہم تمام مسائل جزئیہ کا استقصار کرنا نہیں چاہتے بلکہ ان خاص مسائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں جن میں ضروریات و حالات زمانہ کے لحاظ سے ازسرنو قانون اسلامی کی تدوین و توضیح ضروری ہے۔

ارتداد احد الزوجین | موجودہ زمانہ میں ارتداد کے مسئلہ نے خاص اہمیت اختیار کر لی ہے جہاں تک مرد کے ارتداد کا تعلق ہے، اس میں کوئی پیچیدگی نہیں کیونکہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ مسلمان عورت کسی غیر مسلم کے نکاح میں نہیں رہ سکتی لیکن عورت کے ارتداد کے مسئلہ میں پیچیدگی واقع ہوگئی ہے بکثرت عورتیں صرف اس غرض کے لیے مرتد ہوگئی ہیں اور ہو رہی ہیں کہ انہیں ایسے شوہروں سے رستگاری حاصل ہو جو ظالم ہیں یا انہیں ناپسند ہیں۔ اس مسئلہ میں انگریزی عدالتیں اس ظاہر الروایہ پر

عمل کرتی ہیں جو ہدایہ وغیرہ میں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، یعنی اذا ارتد احد الزوجین وقعت الفرقۃ بغیر طلاق (جب زوجین میں کوئی مرتد ہوجائے تو فرقت بغیر طلاق[1] واقع ہوتی ہے) لیکن علماء ہند اس قسم کے ارتداد کی روک تھام کرنے کے لیے مشائخ بلخ وسمرقند اور بعض مشائخ بخارا کے فتوے پر عمل کرانا چاہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ارتداد سے عورت کا نکاح فسخ نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے مسلمان شوہر کے نکاح میں بدستور رہتی ہے اس فتوے کی بناء اس امر پر ہے کہ ایسی عورت چونکہ محض بند نکاح سے رہائی حاصل کرنے کے لیے مرتد بن جاتی ہے، اس لیے اس حیلہ کو روکنے کی یہی صورت ہے کہ نکاح پر اس کے ارتداد کا کوئی اثر تسلیم نہ کیا جائے۔ مگر اس فتوے کو قبول کرنے میں چند مشکلات ہیں جن پر شاید علماء کرام کی نظر ابھی تک نہیں پہنچی:-

اولاً، اسلام اور کفر کے معاملہ میں ملک کا قانون اور اسلامی شریعت دونوں صرف اقرار لسانی کا اعتبار کرتے ہیں۔ اور ہمارے پاس کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے ہم یہ ثابت کرسکیں کہ ایک عورت دل سے مرتد نہیں ہوئی بلکہ محض اس نیت سے مرتد ہوئی ہے کہ اپنے شوہر سے جدا ہوجائے۔

ثانیاً، جو عورت کتابی مذاہب میں سے کسی مذہب میں چلی جائے اس کے حق میں تو بدرجۂ آخر والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتٰب سے فائدہ اٹھا کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ مسلمان مرد کے نکاح میں رہ سکتی ہے، مگر جو عورت ہندو یا مجوسی ہوجائے یا کسی اور غیر کتابی مذہب میں چلی جائے، اس کو مسلمان مرد کے نکاح میں رکھنا تو قرآن مجید کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

ثالثاً۔ جو عورت اسلام کے دائرہ سے نکل کر دوسرے مذہب میں چلی گئی ہے، اس پر اسلامی قانون کس طرح نافذ ہوسکتا ہے؟ ہم ایک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ہیں۔ اور اس حکومت کی نگاہ میں مسلمان ہندو، سکھ سب یکساں ہیں۔ ہم اس سے کس طرح یہ امید کرسکتے ہیں کہ وہ کسی ایسی عورت کو جو مثلاً سکھوں یا آریوں کی جماعت میں شامل ہوچکی ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف اُسی نکاح پر قائم رہنے کے لیے مجبور

[1] مراد یہ ہے کہ وہ عورت اپنے مسلمان شوہر پر حرام ہوجاتی ہے مگر اس فرقت سے اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوسرا نکاح کرسکے۔

کر گئی جو اس سے بحالتِ اسلام، اسلامی قانون کے ماتحت کیا گیا تھا؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہمارے نزدیک ارتداد کے مسئلہ میں مشائخ بلخ و سمرقند کے فتوے سے مسلمان علما کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ درحقیقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ عورتیں مرتد کیوں ہوتی ہیں؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے دو چار ہی فی صدی ایسی ہو گی جن کے عقیدہ میں فی الواقع تغیر ہوتا ہے۔ درحقیقت جو چیز ان کو ارتداد کی طرف لے جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ ظلم و ضرر کی بہت سی حالتوں میں رائج الوقت قانون کے تحت عورتوں کے لیے دادرسی کی کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ شوہر سخت سے سخت مظالم کرتا ہے، مگر بیوی اس سے خلع حاصل نہیں کر سکتی۔ شوہر ناکارہ ہے، مجنون ہے، خطرناک یا قابل نفرت امراض میں یا سخت بیہودہ عادات میں مبتلا ہے، بیوی اس کے نام تک سے نفرت کرتی ہے، باہمی تعلقات منقطع ہیں مگر بند نکاح سے آزادی کی کوئی سبیل نہیں۔ شوہر مفقود الخبر ہے، سالہا سال سے اس کا پتہ نہیں، عورت پر زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ مگر اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت نہیں۔ اسی قسم کے حالات درحقیقت عورتوں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلام کے دامن سے نکل کر کفر کے دامن میں پناہ لیں۔ اس کی روک تھام کا یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ ادھر ادھر سے فقہی جزئیات نکال کر ان قسمت کی ماری ہوئی عورتوں کے لیے کفر کے دامن میں بھی کوئی جائے پناہ نہ رہنے دی جائے، اور ان کو ارتداد کے بجائے خودکشی پر مجبور کیا جائے، بلکہ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہم خود اپنے قانون پر ایک نظر ڈال کر دیکھیں اور ان اجتہادی احکام میں ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ترمیم و اصلاح کریں جن کی سختیوں کی وجہ سے ہماری بہنوں اور بیٹیوں کو اسلام کی آغوش سے نکل کر کفر کی گود میں جانا پڑتا ہے۔ جہاں تک اللہ اور رسول کے منصوص احکام کا تعلق ہے ان میں قطعاً کوئی ایسی تنگی نہیں جو کسی کے لیے موجب ایسی ہو کہ موجب ارتداد۔ یہ صفت صرف بعض اجتہادی احکام میں پائی جاتی

ہے اور ان احکام کو بعض دوسرے اجتہادی احکام سے بدل کر ارتداد مسلمات کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکتا ہے۔

خیار بلوغ | قرآن مجید میں اگرچہ یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ عورت کے نکاح میں اس کے اولیا کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اس قاعدہ کی جو تعبیر فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اولیا کی رائے کا دخل ہونے کے معنی یہ نہیں کہ عورت اپنی زندگی کے اس اہم معاملہ میں بے اختیار رہے۔ بخلاف اس کے حضور نے ایجاباً عورت کو یہ حق دیا ہے کہ نکاح کے معاملہ میں اس کی رضامندی حاصل کی جائے، چنانچہ ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں ابن عباس سے یہ حدیث منقول ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ میرے باپ نے میری مرضی کے خلاف میری شادی کر دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تجھ کو رد و قبول کا اختیار ہے۔ نسائی میں خنسا بنت خذام کی روایت ہے کہ ان کے باپ نے ان کا نکاح ان کی مرضی کے خلاف کر دیا تھا حضور نے ان کو بھی یہی اختیار دیا۔ دارقطنی میں حضرت جابر کی روایت ہے کہ ایسے ہی ایک مقدمہ میں حضور نے محض اس بنا پر زوجین میں تفریق کرا دی کہ نکاح لڑکی کی مرضی کے خلاف ہوا تھا۔ نسائی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک لڑکی نے حضور سے شکایت کی کہ اس کے باپ نے اس کی مرضی کے خلاف اپنے بھتیجے سے اس کا نکاح کر دیا ہے۔ حضور نے اس کو اختیار دیا کہ چاہے قبول کرے چاہے رد کر دے۔ اس پر اس نے عرض کیا۔

یارسول اللہ اجزت ماصنع ابی و انما	یارسول اللہ میرے باپ نے جو کچھ کیا اسے میں نے
اردت ان اعلم النساء ان لیس الی	منظور کر لیا میرا مقصد تو صرف عورتوں کو یہ بتانا تھا
الآباء من الامر شیء"	کہ ان کے باپ اس معاملہ میں مختار نہیں ہیں۔

مسلم، ابو داؤد، ترمذی، النسائی اور موطا میں حضور کا یہ ارشاد منقول ہے:

الایم[1] احق بنفسها من ولیھا والبکر تستأذن فی نفسھا۔ | بن بیاہی عورت اپنے ولی سے بڑھ کر اپنے نفس کے معاملہ میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہے اور باکرہ سے اس کے نفس کے معاملہ میں اذن لیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

لا تنکح الایم حتیٰ تستامر و لا تنکح البکر حتیٰ تستاذن۔ | شوہر دیدہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس سے اجازت نہ لی جائے۔ اور باکرہ کا نکاح نہ کیا جائے جب تک کہ اس کا اذن نہ لیا جائے۔

ولایت اجبار یہ تمام روایات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اصول شرع میں سے ایک اصل یہ بھی ہے کہ نکاح کے لیے عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح اس کا باپ یا اور کوئی ولی کر دے تو کیا کسی حال میں اس کا یہ حق کہ اس کے نفس کے معاملہ میں اس کی مرضی کا دخل ہو، ساقط ہو سکتا ہے؟ اس مسئلہ میں ہمارے فقہاء نے یہ فتوی دیا ہے کہ اگر نابالغہ کا نکاح اس کے باپ یا دادا کے سوا کسی اور نے کیا ہو تو لڑکی کو حق ہو گا کہ بالغ ہونے پر اسے چاہے قبول کرے، چاہے رد کر دے لیکن اگر باپ یا دادا نے کیا ہو تو اسے یہ حق نہ ہو گا، الّا یہ کہ باپ یا دادا کا سیئ الاختیار ہونا ثابت ہو جائے، مثلاً وہ فاسق ہو یا بے حیا ہو، یا اپنے معاملات میں سوء تدبیر اور ناعاقبت اندیشی کے لیے مشہور ہو۔

یہ مسئلہ کہ باپ اور دادا کو نابالغہ پر ولایت اجبار حاصل ہے اور ان کے کیے ہوئے نکاح میں لڑکی کو خیار بلوغ استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، قرآن مجید کی کسی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ محض فقہاء کے اس قیاس پر مبنی ہے کہ باپ اور دادا چونکہ لڑکی کے بدخواہ نہیں ہو سکتے

[1] لغت میں ایم ہر اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر والی نہ ہو، خواہ باکرہ ہو یا ثیبہ۔

اس لیے لڑکی کے لیے ان کا کیا ہوا نکاح لازم ہونا چاہیے چنانچہ ہدایہ میں ہے کہ فلا خیار لهما بعد بلوغهما لانهما کاملا الرای وافرا الشفقة فیلزم العقد بمباشرتهما کما اذا باشراه برضاهما بعد البلوغ۔ لیکن یہ محض ایک قیاسی رائے ہے جو خدا اور رسول کے احکام کی طرح نہ محکم ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ نقلاً و عقلاً اس پر متعدد حیثیات سے اعتراض وارد ہوتا ہے۔

اوّلاً، حدیث صحیح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ کی صاحبزادی کا نکاح کمسنی میں عمر بن ابی سلمہ سے کر دیا اور فرمایا کہ بالغ ہونے کے بعد اسے رد یا قبول کرنے کا اختیار ہے اس حدیث سے نابالغہ کے لیے خیار بلوغ مطلقاً ثابت ہوتا ہے کیونکہ حضور نے ایسی کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ چونکہ لڑکی کا باپ نہیں بلکہ ابن عم ہوں اس لیے میرا کیا ہوا نکاح اس کے لیے لازم نہیں ہے۔

ثانیاً یہ عجیب بات ہے کہ اگر لڑکی بالغ ہو تو باپ یا دادا کے مقابلہ میں اسے اپنی رائے استعمال کرنے کا حق حاصل ہو لیکن وہی لڑکی اگر نابالغ ہو تو اس کا یہ حق کلیۃً سلب کر لیا جائے، حالانکہ معاملہ نکاح کے ساتھ عورت کے تعلق کی جس اہمیت کو ملحوظ رکھکر شارع نے اس کو یہ حق دیا ہے وہ دونوں حالتوں میں یکساں ہے۔ اگر کسی کے کامل الرائے اور وافر الشفقت ہونے کی بنا پر اس کو ولایت اجبار حاصل ہو سکتی ہے، تو وہ بلوغ کی حالت میں بھی اسی طرح حاصل ہونی چاہیے جس طرح عدم بلوغ کی حالت میں اسکے لیے ثابت کی جاتی ہے لیکن جب بالغ لڑکی پر کسی کو ولایت اجبار حاصل نہیں ہے، تو نابالغ لڑکی پر کیوں حاصل ہو؟ —

ثالثاً باپ دادا کا وافر الشفقت اور کامل الرائے ہونا کوئی یقینی اور ثابت شدہ امر نہیں ہے۔ محض کثرت کو دیکھکر ایک قیاس قائم کیا گیا ہے مگر اس قیاس کے خلاف بھی کثیر واقعات دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جاتے ہیں جن سے وفور شفقت کا ثبوت کم اور کمال رائے کا ثبوت کم تر رہتا ہے۔

رابعاً، اگر یہ قیاس صحیح بھی ہو تو اس کا بہت قوی امکان ہے کہ باپ دادا نیک نیتی کے ساتھ وفور شفقت اور کمال رائے رکھتے ہوئے ایک صغیر السن لڑکی کا نکاح ایک کم سن لڑکے سے کر دیں اور

لڑکا جوان ہو کر ان کی توقعات کے خلاف نالائق نکلے۔ خصوصاً موجودہ زمانہ میں جبکہ اسلامی تربیت کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے تعلیم و تربیت کی خرابیوں سے نہایت بری سیرتیں پیدا ہو رہی ہیں اور مسلمانوں کے گرد و پیش ایسا خراب ماحول پایا جاتا ہے جس کے بہت بُرے اثرات لڑکوں کے اخلاق و عادات پر مترتب ہو رہے ہیں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم نہ قرار دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بد اخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور اس وقت باپ دادا کی ولایت اجبار خود ان کے لیے ایک مصیبت بن جاتی ہے۔

خامساً، اگر باپ دادا سیئ الاختیار ہوں تو ایک لڑکی کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ ان کے مقابلہ میں خیار بلوغ استعمال کر سکے۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو اپنے باپ یا دادا کے خلاف بدنیتی، فسق وفجور، بے حیائی، سوء تدبیر یا حماقت و بلادت کا ثبوت پیش کرنا ہوگا، اور یہ نہ صرف اس کے لیے مشکل ہے، بلکہ سخت معیوب بھی ہے۔

ان وجوہ سے فقہ کے اس جزئیہ پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، اور مصالح کا اقتضاء ہے کہ اس خالص اجتہادی مسئلے میں ترمیم کر کے صغیر و صغیرہ کو ہر حال میں خیار بلوغ دیا جائے۔

خیار بلوغ کی شرائط اس سلسلہ میں فقہاء کا ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ بھی محل نظر ہے۔ باپ دادا کے سوا دوسرے اولیاء کے باب میں فتویٰ یہ ہے کہ اگر انہوں نے صغیرہ باکرہ کا نکاح کر دیا ہو تو وہ خیار بلوغ استعمال کر سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی بلا تاخیر وہ اپنی نارضامندی کا اظہار کر دے۔ اگر اس نے فوراً اس کا اعلان نہ کیا تو اس کا خیار باطل ہو جائے گا۔ یہ شرط صرف باکرہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ ثیبہ اور نابالغ لڑکے کے لیے یہ حکم ہے کہ بالغ ہونے کے بعد

جب تک وہ اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، ان کو خیار فسخ حاصل رہے گا۔

یہ شرط جو صغیرہ نابالغہ کے لیے رکھی گئی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت ہم کو قرآن اور حدیث میں نہیں ملا۔ یہ بھی ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ خیار فسخ کو بلوغ کے ساتھ مشروط کرنے کی علت اس کے سوا کوئی نہیں کہ سن بلوغ کو پہنچ کر انسان میں برے اور بھلے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، اور وہ عقل رسا سے کام لے کر اپنے معاملات میں ذمہ دارانہ فیصلہ کر سکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بلوغ کی پہلی علامت ظاہر ہوتے ہی اس کے اندر کوئی بڑا انقلاب رونما ہو، اور آناً فاناً وہ ناقص الرائے سے کامل الرائے ہو جائے۔ اور بالفرض اگر ایسا ہوتا بھی ہو تو ثیبہ اور نابالغ لڑکے کا حال باکرہ کے حال سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ پس جب ان دونوں کے خیار بلوغ کو اس وقت تک کے لیے ممتد کیا گیا ہے جب تک کہ وہ قولاً یا فعلاً اپنی رضا کی تصریح نہ کریں، تو کوئی وجہ نہیں کہ باکرہ کو بھی سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کے لیے کافی وقت نہ دیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ بہ نسبت ایک ثیبہ اور ایک نوجوان مرد کے اس کی زیادہ مستحق ہے، کیونکہ وہ غریب تو ان دونوں سے زیادہ ناتجربہ کار ہوتی ہے۔

مہر مہر کے مسئلہ میں یہ امر مسلم ہے کہ اللہ اور رسول کے قانون میں اس کے لیے کوئی آخری حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں اس کے لیے چالیس اوقیہ کی انتہائی حد مقرر کرنی چاہی تھی، مگر ایک عورت نے ان کو ٹوک کر کہا کہ آیت وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا کی رو سے آپ کو ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس دلیل کو سن کر حضرت عمر نے فرمایا امرأة اصابت ورجل اخطأ۔ پس جہاں تک کہ تحدید کا تعلق ہے، قانون میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں لیکن احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مہر کی زیادتی میں مبالغہ کرنا اور مرد کی قوت برداشت سے زیادہ مہر باندھنا ایک ناپسندیدہ فعل ہے۔

حضور نے فرمایا:-

الزموا النساء الرجال ولا تغالوا فی المھور عورتوں کو مردوں کے پلے باندھنے کی کوشش کرو اور مہروں میں حد سے نہ بڑھو۔

ابو عمرو الاسلمی نے ایک عورت سے دو سو درہم مہر پر نکاح کیا تو آپ نے فرمایا لو کنتم تغرفون الدراہم من اودیتکم مازدتم (اگر تم کو ندی نالوں میں درہم بہتے ہوئے ملتے تب بھی شاید تم اس سے زیادہ مہر نہ باندھتے)۔

حضرت انس نے ایک عورت سے چار اوقیہ (۱۶۰ درہم) پر نکاح کیا تو حضور نے فرمایا کانما تنحتون الفضۃ من عرض ھٰذا الجبل (گویا تم اس پہاڑ سے چاندی کھود کھود کر نکال رہے ہو)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ "عورت کے مہر مقرر کرنے میں حد سے نہ بڑھو اگر یہ دنیا میں کوئی قابل عزت اور آخرت میں تقوی کی بات ہوتی تو تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو اختیار کرتے مگر آپ کی ازواج اور صاحبزادیوں میں سے تو کسی کا مہر (۱۲) اوقیہ سے زیادہ نہ تھا۔"

یہ تو محض زیادتی مہر کے متعلق ہے لیکن ہمارے ملک میں جو رواج عام ہو گیا ہے وہ اس سے بھی زیادہ قبیح ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں روپیہ کی دستاویزیں مہر مؤجل کے طور پر لکھ دی جاتی ہیں۔ مگر نہ اتنی بڑی بڑی رقموں کا ادا کرنا ان کے لکھنے والوں کی قدرت میں ہوتا ہے اور نہ لکھتے وقت وہ اس نیت سے لکھتے ہیں کہ کبھی ان کو مہر ادا کرنا ہے۔ یہ چیز کراہت کی حد سے گذر کر نکاح کے لیے موجب فساد ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ

من تزوج امرأۃ بصداق ینوی ان لا یؤدیہ فھو زانٍ ومن ادان دینا جس نے ایک مال مہر کے عوض کسی عورت سے نکاح کیا اور نیت یہ رکھی کہ وہ اس مہر کو ادا نہ کرے گا تو وہ

نیوی ان لا یقضیه فهو سارق۔ دراصل زانی ہے، اور جس نے قرض لیا اور نیت یہ رکھی کہ اس قرض کو ادا کرنا نہیں ہے وہ دراصل چور ہے۔

یہ اس قسم کے مہروں کی باطنی قباحت ہے۔ رہی ظاہری قباحت تو وہ بھی کچھ کم شدید نہیں اس قسم کے مہر باندھنے کا حقیقی مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ شوہر طلاق نہ دے سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناموافقت ہو جائے اور دونوں مل کر نہ رہ سکیں تو یہی زیادتی مہر عورت کے لیے بلائے جان ہو جاتی ہے۔ شوہر محض مہر کی نالش کے خوف سے اس کو طلاق نہیں دیتا، اور سالہا سال بلکہ ساری ساری عمر کے لیے غریب عورت معلق پڑی رہتی ہے۔ آج کل جن چیزوں نے عورتوں کو عام طور پر مبتلائے مصیبت کر رکھا ہے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہی مہر کی زیادتی ہے۔ اگر اس میں اعتدال برتا جائے تو قریب قریب ۵۰ فی صدی مشکلات رونما ہونے سے پہلے ہی حل ہو جائیں۔

ہمارے نزدیک اس کی اصلاح کے لیے اصول شرع کی خلاف ورزی سے بچتے ہوئے یہ صورت اختیار کی جا سکتی ہے کہ مہر اگر معجّل ہو تو فریقین مختار رہیں کہ بلا کسی حد و انتہا کے جتنا چاہیں مقرر کر لیں لیکن اگر وہ موجّل ہو تو لازم قرار دیا جائے کہ اس کی دستاویز باقاعدہ اسٹامپ پر لکھی جائے اور زرِ مہر پر پچاس فی صدی قیمت کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا ۵۰ فی صدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویز مہر قابل ادخالِ دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا قانون اگر بنا دیا جائے تو مہر موجل کا یہ سرتاپا عیوب سے بھرا ہوا طریقہ بآسانی مسدود ہو جائے گا۔ اُس وقت لوگ مجبور ہوں گے کہ اپنی استطاعت کے مطابق مہر مقرر کریں۔ اور فضولیات میں روپیہ صرف کرنے کے بجائے نقد یا مال و جائداد کی صورت میں نکاح کے وقت ہی مہر ادا کر دیں۔

نفقہ اس باب میں نزاع کی دو شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر نفقہ دینے کی استطاعت رکھتا ہو مگر نہ دے اور دوسری شکل یہ کہ اس میں استطاعت ہی نہ ہو۔

پہلی صورت میں یہ امر متفق علیہ ہے کہ قاضی اس کو نفقہ ادا کرنے پر ہر ممکن طریقہ سے مج
ے لیکن اگر وہ قاضی کے احکام کی تعمیل نہ کرے تو اس میں اختلاف ہے کہ ایسی صورت میں کیا
حنفیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ عورت بطور خود اپنے نفقہ کا انتظام کر
خواہ شوہر کے نام پر قرض لے کر خواہ محنت مزدوری کر کے خواہ اپنے کسی عزیز سے مدد لے کر۔
اس کے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کو بطور خود طلاق واقع کر دینے کا حق
علماء احناف نے مالکیہ کے اس فتوی کو اختیار کرنا پسند کیا ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ عورت
کا انتظام نہ کر سکتی ہو، یا اگر کر سکتی ہو تو شوہر سے علیحدہ رہنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہو جانے کا
لیکن یہ شرط کچھ درست نہیں معلوم ہوتی قرآن مجید کی رو سے نفقہ عورت کا حق ہے جس کے معا
اس پر شوہر کے حقوق زوجیت حاصل ہوتے ہیں جب کوئی شخص قصداً اس حق کو ادا کرنے سے
رہا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ عورت کو زبردستی اس کے عقد نکاح میں بندھے رہنے پر مجبور کیا
جب تک وہ کسی شخص کے نکاح میں ہے اس کی پرورش کا ذمہ دار اس کا شوہر ہے۔ ایسی حالت
خود روزی کمانے یا اپنے رشتہ داروں پر بار ڈالنے یا ایک ظالم شوہر کے نام سے حصول قرض
ممکن الحصول کوشش کرنے کی تکلیف میں ڈالنا خلاف عدل معلوم ہوتا ہے۔

دوسری صورت میں بھی حنفیہ کا مذہب یہی ہے کہ عورت کو صبر و احتساب کی تلقین کی
اور اس سے کہا جائے گا کہ قرض لے کر یا کسی عزیز سے مدد لے کر گذر کرے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ
نزدیک ایسی عورت کا نفقہ ہر اس شخص پر واجب ہے جس پر اس کی پرورش کا بار پڑتا اگر وہ
ہوتی لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام احمد حنبل کا مذہب یہ ہے کہ اگر عورت ایسے شوہر کے
زندگی بسر نہ کر سکتی ہو اور تفریق کا دعوی کرے تو تفریق کرا دی جائے گی۔ امام مالک کی رائے
کو مہینہ دو مہینہ یا کسی مناسب مدت تک مہلت دی جائے گی۔ امام شافعی صرف تین دن کی

دیتے ہیں، اور امام احمد حنبل کا فتویٰ یہ ہے کہ بلا تاخیر زوجین میں تفریق کرا دی جائے۔

اس باب میں نہ صرف قرآن مجید کا وہ قاعدہ جو وبما انفقوا من اموالھم میں بیان کیا گیا ہے۔ ائمۂ ثلاثہ کی تائید کرتا ہے، بلکہ احادیث و آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دارقطنی اور بیہقی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فیصلہ منقول ہے کہ عدم نفقہ کی صورت میں زوجین کے درمیان تفریق کرا دی جائے۔ حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ سے بھی یہی قول منقول ہے۔ تابعین میں سے سعید بن المسیب کا بھی یہی فتویٰ ہے۔ اور حضرت عمر بن عبد العزیز نے بھی تحقیق کے بعد اسی کے مطابق عمل کیا ہے۔ بخلاف اس کے حنفیہ کا استدلال اس آیت سے ہے کہ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللهُ لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا (۶۵ : ۱) لیکن اس آیت سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ نفقہ کے لیے شرعاً کوئی مقدار مقرر نہیں ہے، بلکہ نفقہ دینے والے کی حیثیت پر انحصار ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جہاں نفقہ سرے سے موجود ہی نہ ہو وہاں عورت کو بلا نفقہ گذر کرنے کے لیے مجبور کیا جائے۔ بلاشبہ یہ عزیمت کا مقام ہے کہ ایک عورت عسرت اور فاقہ کشی میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ دے۔ اسلام ایسی ہی عزیمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایک شریف خاتون کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اخلاقی تعلیم اور چیز ہے، اور شرعی حق دوسری چیز۔ نفقہ عورت کا شرعی حق ہے۔ اگر وہ برضا و رغبت اس کو چھوڑ دے اور اس کے بغیر ہی شوہر کی رفاقت کرنا پسند کرے تو نہایت قابل تعریف ہے لیکن اگر وہ اس کو نہ چھوڑنا چاہے یا نہ چھوڑ سکے تو قانون اسلامی کے عدل و انصاف میں اس امر کی گنجائش نہیں ہے کہ اس کو تکلیف اور جبر کے ساتھ عزیمت کے مقام بلند پر ٹھیرانے کی کوشش کی جائے۔

پس ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں تمام مذاہب میں سے احسن مذہب امام مالک کا ہے جو شوہر کو مناسب مدت تک مہلت دینے کے بعد تفریق کا حکم دیتے ہیں۔

ستم ناروا آیۂ کریمہ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ ..... فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا - (۴: ۶۰) کی رو سے شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ بلا کسی جائز سبب کے اپنی بیوی پر کسی قسم کی سختی کرے خواہ وہ آزار جسمانی ہو یا آزار لسانی۔ اگر وہ ایسا کرے تو عورت کو قانون کی پناہ لینے کا حق ہے اس باب میں کوئی تفصیلی حکم ہم کو نہیں مل سکا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ قانون اسلامی کے اصول میں اس کی گنجایش ہے کہ قاضی کو ایسے مظالم سے عورت کی حفاظت، اور ناقابل برداشت صورتوں میں تفریق کا اختیار دیا جاسکتا ہے۔ آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقوں میں عورتوں کے ساتھ ناروا برتاؤ کا عام رواج ہو گیا ہے، اور شوہریت کے معنی یہ سمجھے جارہے ہیں کہ وہ ظلم و جور کا غیر محدود لائسنس ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ قانون میں اس کے متعلق مناسب احکام کا اضافہ کیا جائے۔

تحکیم اس باب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو طریق کار اختیار فرمایا ہے۔ وہ ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ ثقفی الثقفی بیان کرتے ہیں کہ آپ کے پاس ایک مرد اور اس کی بیوی کا مقدمہ آیا۔ آپ نے قرآن مجید کے فرمان فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا کے مطابق حکم دیا کہ دونوں اپنی اپنی طرف سے ایک ایک حکم تجویز کریں پھر دونوں حکموں کو مخاطب کرکے فرمایا "تمہارا کام کیا ہے، جانتے ہو؟ تمہارا کام یہ ہے کہ اگر دونوں کو ملانا مناسب سمجھو تو ملا دو، اور اگر تفریق کرنا مناسب سمجھو تو تفریق کر دو۔" پھر عورت سے دریافت فرمایا کیا تو ان دونوں پنچوں کے فیصلہ پر راضی ہے۔ اس نے عرض کیا ہاں میں راضی ہوں۔ اس کے بعد مرد سے یہی سوال کیا۔ اس نے کہا اگر وہ ملادیں تو مجھے ان کا فیصلہ قبول ہے اور اگر تفریق کریں تو مجھے قبول نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا۔ لیس ذالك لك، لست ببارح حتی ترضی بمثل ما رضیت بہٖ "تجھے اس کا حق نہیں تو یہاں سے نہیں جاسکتا جب تک کہ اسی طرح تو بھی اپنی منظوری کا اقرار نہ کرے جس طرح اس عورت نے کیا ہے۔"

میاں بیوی کے ایسے خانگی جھگڑوں میں جن کا تعلق بڑے اور اہم قانونی مسائل سے نہ ہو،

تحکیم کے اس طریقے کو اختیار کرنا انسب ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق قانون میں چند ایسی دفعات کا اضافہ کیا جائے، جن میں تحکیم کے طریقہ، اور حکمین کے اختیارات اور ان کے متفقہ فیصلہ کے طریق نفاذ، اور اختلاف رائے کی صورت میں عدالت کے طریق کار کی صراحت کر دی جائے۔ (باقی)

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کوثر

(۴)

تالیف علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ جناب مولنا امین احسن صاحب اصلاحی

۴۔ نماز اور قربانی دونوں ایک دوسرے پر مشتمل ہیں یعنی نماز ایک پہلو سے قربانی ہے۔ اور قربانی ایک پہلو سے نماز ہے۔ نماز کا قربانی ہونا واضح ہے کیونکہ اوپر گذر چکا ہے کہ نماز بیعت کے وقت کی ایک تدبیر ہے۔ نیز یہ نفس کو تحمل مشقت اور ترک لذات کا خوگر بناتی ہے جو ذبح بہیمیت ہے۔ اس لیے اس کی شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں۔ البتہ قربانی کا نماز ہونا محتاج تفصیل ہے یہ بات گذر چکی ہے کہ قربانی کی حقیقت راہ الٰہی میں جان کی قربانی ہے۔ اس اعتبار سے ظاہر ہے یہ ایک دوسری صورت میں بعینہ نماز ہے۔ اُس میں زبان اور دلوں کے ذریعہ اقرار ایمان ہے۔ اس میں اسی ایمان کی تصدیق جان دے کر کی جاتی ہے۔ اسی لیے خدا کی راہ میں جان دینے کا نام شہادت ہے، نیز اس میں کمال درجہ خضوع و طاعت ہے، اس لیے نماز کی اصلی روح، اقرار توحید اور خضوع کی یہ سب سے زیادہ حامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کے تمام آداب بھی اس کے نماز ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً

(۱) قربانی خانۂ کعبہ کے پاس ہوتی ہے، جو مرکز نماز ہے۔

(۲) اس کا آغاز بسم اللہ واللہ اکبر ہے۔

(۳) قربانی اور قربانی کرنے والے کا رخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

(۴) اونٹوں کی قربانی میں قیام کی رعایت ہے جس میں قیام نماز کی جھلک پائی جاتی ہے

(۵) مینڈھوں کی قربانی میں سجدہ کی رعایت ہے، جو سجدۂ نماز سے اشبہ ہے۔

پھر آغاز نماز کی دعا جو قرآن میں وارد ہے وہ یہ ہے:۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (انعام۔ ۷۹)

میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رخ اس ذات کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

نیز:۔

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ لَا شَرِیْکَ لَهٗ۔ (انعام ۱۶۲-۱۶۳)

بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا:۔

فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (صٰفٰت۔ ۱۰۳)

جب ان دونوں نے امر الٰہی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل پچھاڑ دیا۔ یعنی ان کے ظاہر و باطن دونوں خدا کی طرف متوجہ ہوگئے، اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو سجدہ میں ڈال دیا۔

اسی طرح قربانی کے ذکر میں فرمایا:۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَکُمْ فِیْهَا خَیْرٌ فَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ (حج ۔ ۳۶)۔

اور قربانی کے اونٹوں کو ہم نے تمہارے لیے شعائر اللہ میں سے قرار دیا۔ ان میں تمہارے لیے بھلائی ہے پس ان پر درآں حالیکہ وہ صف بصف ہوں اللہ کا نام لو

یعنی جس طرح تم نمازوں میں صف بستہ کھڑے ہوتے ہو، اسی طرح وہ بھی ذبح کے وقت صف بستہ

کھڑے کئے جائیں۔

اسی طرح زکوٰۃ کے بیان ہیں، جو قربانی کے ذیل کی عبادت ہے، فرمایا:۔

وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُوْنَ۔ اور وہ زکوٰۃ دیتے ہیں، درآنحالیکہ جھکے ہوئے ہوتے ہیں

یعنے زکوٰۃ دیتے وقت ان کی ہیئت سے خشوع کا اظہار ہوتا ہے، متکبر اور طالب شہرت

اغنیا کی طرح تن کر نہیں دیتے۔

(۵) نماز اور قربانی دونوں ذکر الٰہی ہیں۔ نماز کا ذکر ہونا متعدد آیات سے واضح ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہ۔ ۱۴) اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ۔ ۱۵) اور اس نے اپنے رب کے نام کو یاد کیا پس نماز پڑھی

باقی رہا قربانی کا ذکر ہونا سو یہ بھی قرآن سے ثابت ہے۔ فرمایا۔

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ اور اللہ کے نام کو یاد کریں، ان چوپایوں پر جو

مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (حج ۳۴) اس نے ان کو بخشے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى اسی طرح ان کو تمہارے لیے مسخر کیا تاکہ تم اس

مَا هَدٰىكُمْ (حج ۳۷)۔ ہدایت پر جو اللہ نے تم کو بخشی ہے۔ اس کی بڑائی کرو۔

یعنی دین و توحید و اسلام کی ہدایت پر۔

اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح تکبیر کے ذریعہ تم نماز میں ذکر الٰہی کرتے ہیں بعینہ اسی طرح

قربانی کے وقت بھی کرتے ہیں۔

(۶) یہ دونوں (نماز اور قربانی) شکر ہیں۔ نماز کا شکر ہونا بالکل ظاہر ہے۔ یہاں تک

کہ بعض جگہ شکر ہی کے لفظ سے نماز کو تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ۔ پس مجھکو یاد رکھو، میں تم کو یاد رکھوں گا، اور
(بقرہ ۱۵۲)

پر شکر کرو، ناشکری مت کرو۔

سورہ فاتحہ نماز کی جان ہے، اور معلوم ہے کہ اس سورۃ کی بنیاد شکر پر ہے۔ اب قربانی پر غور کرو! یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا اور دنیا والوں سے بالکل مستغنی ہے۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔ وہ کھلاتا ہے لیکن کھاتا نہیں، اس نے جو نعمتیں ہم کو بخشی ہیں، ان میں سے ہم کچھ اس کی راہ میں محض اس اعتراف کے لیے قربان کرتے ہیں، کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے، سب اسی کی ملکیت اور اس کے انعام کا فیضان ہے۔ اسی وجہ سے قربانی کے وقت ہم کہتے ہیں:۔

"منک ولک"، تیری بخشی ہوئی نعمت اور تیری ہی راہ میں۔ اسی لیے فرمایا ہے:۔

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (حج۔ ۳۶) اسی طرح ہم نے ان کو مسخر کیا تاکہ تم شکر کرو۔

اور جس طرح نماز اللہ کی تمام ظاہر و باطن نعمتوں پر ایک عام شکر ہے اسی طرح قربانی بھی محض منافع دنیاوی کا شکر نہیں ہے بلکہ عموم شکر کا وہی پہلو اس میں بھی مرعی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (حج۔ ۳۷) تاکہ تم کو جو ہدایت بخشی ہے، اس پر اللہ کی بڑائی کرو۔

۷۔ یہ دونوں تقویٰ کی فرع ہیں جس سے آدمی کی امیدیں وابستہ ہیں، یا جس سے ڈرتا ہے، اس کو برابر یاد رکھتا ہے۔ اور نماز اسی ذکر کے قائم رکھنے کے لیے ہے۔ چونکہ بندہ کو خدا کی رضا مطلوب ہوتی ہے، اور اس کے غضب سے ڈرتا ہے، اس لیے وہ اس کے سامنے روتا اور گڑگڑاتا ہے۔ اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ (انعام۔ ۷۲) اور یہ کہ نماز قائم کرو، اور اس سے ڈرو، اور وہی ہے جس کے پاس تم جمع کئے جاؤ گے۔

اب قربانی کو دیکھو! اللہ تعالیٰ نے بہائم پر انسان کو جو غلبہ اور تسلط دیا ہے، اس میں ایک قسم کی آقائی اور بندگی کی نمود تھی۔ اس لیے ضروری ہوا کہ اظہار خشوع اور اقرار بندگی کے

ذریعہ اس غرور کو مٹا دیا جائے، اور بندہ کی زبان پر شکر نعمت اور اقرار عبدیت کے ایسے کلمے جاری کیے جائیں، جن سے خدا کی ملکیت اور پروردگاری اور اس کی وحدت و یکتائی کا ظہار ہو۔ غور کرو! ان تمام امور میں تقوی کی کس قدر جلوہ گری ہے! پس چونکہ وہ ان تمام حقائق کا جامع تھا، اس لیے وہی قربانی کی حقیقت قرار پایا۔ بندہ تقوی ہی کی راہ سے قرب الٰہی کے مقام شرف تک پہونچتا ہے۔ اس لیے کوئی قربانی اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک کہ اس میں تقوی نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ. (مائدہ ۲۷) اللہ صرف متقین کی قربانی قبول کرتا ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:۔

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ (بقرہ ۱۹۷) اور تقوی کا زادراہ لو، کیونکہ بہترین زادراہ تقوی ہے۔

تقوی کو زادراہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ کیونکہ یہی قرب الٰہی کی منزلوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ یہ تعریب تقرب کے لیے ہے جیسا کہ گیارہویں سبب میں ہم لکھیں گے۔ اس لیے تقوی کا زادراہ ناگزیر ہوا۔

۸۔ یہ دونوں منازل آخرت میں سے ہیں۔ کیونکہ نماز رجوع الی اللہ اور حشر میں پروردگار کے حضور ہمارے کھڑے ہونے کی تصویر ہے۔ اس لیے اس میں معاد کی ایک جھلک ہے، گویا وہ خدا کے سامنے اپنی حاضری کے دن کو یاد کر رہا ہے۔ یہ اشارہ مندرجہ ذیل آیت سے ہوتا ہے۔

إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ. (بقرہ ۴۵-۴۶) بے شک وہ (نماز) گراں ہے، مگران خوف رکھنے والوں پر جن کو گمان ہے کہ ان کو اپنے رب سے ملنا ہے اور ایک دن اُس کی طرف لوٹنا ہے۔

جن کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ ایک دن خدا کی طرف لوٹنا اور اپنے تمام اعمال و اقوال کی جوابدہی کرنی ہے، وہ تمام غفلتوں اور معاصی سے تائب ہو کر اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں، اور حشر کے دن، خدا کے حضور کھڑے ہونے کی خشیت اور پستی دنیا میں ان پر طاری ہو جاتی ہے

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ۔ (نازعات۔ ۸)	دل اس دن مضطرب ہوں گے اور نگاہیں پست ہونگی۔
قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ (مومنون ۱-۲)	ان ایمان والوں نے فلاح پائی، جو اپنی نمازوں میں سرفگندہ ہیں۔
رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (نور۔ ۳۷)	ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے نماز قائم کرنے سے اور زکوٰۃ دینے سے غافل نہیں کرتی، وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن دل اور آنکھیں الٹ جائیں گے۔

یہ آیت بھی اسی کے مشابہ ہے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰۤى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى اَرَاَيْتَ الَّذِىْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى (علق ۶ تا ۱۰)۔	بے شک انسان سرکشی کرتا ہے، اس وجہ سے کہ وہ اپنے کو مستغنی دیکھتا ہے۔ بیشک تیرے رب کی طرف پھر جانا ہے، (یعنی جس کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے

وہ کیسے بے پروا ہوتا ہے) تم نے اس کو دیکھا! جو ایک بندہ کو روکتا ہے جب کہ وہ نماز پڑھتا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ خدا حشر کے دن، جب ہم کو پکارے گا، ہم اس کی حمد پڑھتے ہوئے قبروں سے نکل کر اس کی طرف جائیں گے۔

يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ	جس دن وہ تم کو پکارے گا، تم اس کی حمد پڑھتے

وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا (اسراء ۵۲) ہوئے اس کی طرف دوڑوگے اور خیال کروگے کہ تم بہت کم ٹھیرے۔

اسی طرح نمازی نماز کی پکار کی طرف لپکتے ہیں اور صف بستہ ہو کر خدا کی حمد کرتے ہیں بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی جلوہ گر ہے۔ وہی نماز کی طرح رجوع الی اللہ ہے، جیسا کہ دوسرے اور تیسرے ... کے بیان میں ... ہو چکا ہے۔ یہاں اس پر ہم ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیں گے۔

... بہائم کو خدا نے ... سینے مسخر کیا ہے اسی طرح ہمارے اجسام کو بھی ہمارے لیے مسخر کیا ہے تا کہ ایک معین مدت تک نیز رفق اور حسن سلوک کے ساتھ، ہم ان کو اپنا مرکب بنائیں اور پھر ان کو خدا کے حوالہ کر دیں۔ انعام کے بارہ میں فرمایا ہے۔

لَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ (حج ۳۳) تمہارے لیے ایک متعین مدت تک کے لیے ان میں منفعتیں ہیں پھر ان کو خدا کے قدیم گھر کی طرف لیجانا ہے۔

یعنی جس طرح قربانی کے جانوروں کو ہم بیت اللہ کی طرف لے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے اجسام کو بھی لے جاتے ہیں چنانچہ فرمایا ہے۔

وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (حج ۲۷) اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، کہ آویں تمہارے پاس پیادہ پا اور لاغر اونٹوں پر جو آئیں گے گہرے راستوں سے۔

دیکھو! دونوں کی سمت سفر ایک ہی ہے۔ اور یہ اشتراک ہر چیز میں نمایاں ہے۔ جس طرح قربانی کے جانوروں کی ہم ... کرتے ہیں، اور ان کے لیے ایک مخصوص شعار قرار دیتے ہیں۔ بعینہ وہی معاملہ اپنے جسموں کے ساتھ کرتے ہیں، صرف اتنا فرق ہے کہ ہم جانوروں کی طرح اپنے جسموں کو ذبح نہیں کرتے، سو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جانوں کا فدیہ دیکر ان کو چھڑا لیتے ہیں، جس طرح اسمٰعیل کی

جان اُس چیز کے عوض میں چھڑائی گئی، جو ان کی قائم مقام بن کر قربان کی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے ابراہیم خلیل کا ہدیہ ایک دوسری شکل میں قبول فرمایا کہ حضرت اسمٰعیل کو اپنے گھر کی خدمت کے لئے مخصوص فرمایا، اسی طرح ہم بھی اپنے محبوبوں کو فدیہ دیکر چھڑا لیتے ہیں، لیکن وہ ہم کو واپس نہیں کر دیے جاتے، بلکہ ہماری امانت میں دیدے جاتے ہیں، تاکہ جب ضرورت پیش آئے ہم اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْهِ حَقًّا فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ وَ الْقُرْاٰنِ وَ مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِكُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (توبہ - ۱۱۱)

بیشک اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کا مال جنت کے بدلے خرید لیا ہے، وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں۔ یہ ایک سچا اور پکا عہد ہے اور توراۃ، انجیل، قرآن میں مذکور ہے جنہوں نے اللہ سے اپنے عہد کو پورا کیا ان کے لیے بازار یہاں ہے کہ اپنے اس معاملہ کی جو تم نے کیا ہے خوشخبری حاصل کرو۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔

اسلام کی بیعت کے بعد ہم خدا کے ہاتھ بک جاتے ہیں، اور اسی عہد کی تجدید کے لیے ہم اس کے آستانہ پر حاضر ہوتے ہیں، اور پھر اسود کو ہاتھ لگا کر اس کا از سر نو اقرار کرتے ہیں۔ یہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عہد کی توثیق اور ہمارے اللہ کی راہ میں قربان ہونے کا اعتراف ہے پھر حج کا اجتماع ہمارے حشر کے میدان میں کھڑے ہونے کی تصویر ہے اس پہلو سے نماز، حج اور قربانی، ان تینوں کو معنوی حیثیت سے قریبی نسبت ہے۔

۹- یہ دونوں ابواب صبر میں سے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کے

وعدہ پر پورا بھروسہ کر کے نماز کی مداومت کرتا ہے، اس کی مثال اس درخت لگانے والے کی سی ہے، جو شب و روز پودے کی نگہداشت کرتا ہے، اس کی خدمت کرتا ہے، اس کو پانی دیتا ہے، اور اس کے پھل کا منتظر ہے، اور دوسروں کی غفلت و سستی اس کی اس سرگرمی و خود فراموشی میں کوئی ضعف نہیں پیدا کرتی، لوگ اس کی امید موہوم پر ہنستے ہیں لیکن خدا کی شکر گذاری و طاعت کے جادہ مستقیم سے اس کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ باتیں غیر معمولی رسوخ عزم اور انجام کار کی کامیابی پر غیر متزلزل یقین کے بغیر نہیں پیدا ہو سکتیں۔ انہی وجوہ سے قرآن مجید نے صبر اور نماز کو متعدد آیات میں ایک ساتھ ذکر کیا ہے:۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ اور صبر و نماز کے ذریعہ مدد چاہو۔

اوپر ہم نے جن امور کی تشریح کی ہے، مندرجہ ذیل آیت میں ان کی طرف نہایت واضح اشارات ہیں:۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ	پس ان کی باتوں پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد
قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ	کی تسبیح پڑھو سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے
اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ	ڈوبنے سے پہلے اور رات کے وقتوں میں اس کی تسبیح
تَرْضٰى وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا	پڑھو، اور دن کے اطراف میں تاکہ تم خوش ہو جاؤ، اور
بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	تم نہ دیکھو اس زینت دنیا کی طرف جو ہم نے ان کی بعض
لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّ	جماعتوں کو بخشی ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ ان کا امتحان
اَبْقٰى وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ	کریں۔ تمہارے رب کی روزی زیادہ بہتر اور باقی رہنے
عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ	والی ہے۔ اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت
وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰهٰ ۱۳۰ تا ۱۳۲)	قدم رہو ہم تم سے روزی نہیں مانگتے ہم تم کو روزی دیتے

انجام کار کی کامیابی تقویٰ کے لیے ہے۔

دوسری جگہ ہے:۔

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (رعد ۔ ۲۲)	اور جو اپنے رب کی رضا کی طلب میں ثابت قدم رہے اور نماز قائم کی۔

نیز فرمایا:۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (غافر ۵۵۔۵۶)	پس ثابت قدم رہو بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے اور اپنے گناہ کی مغفرت چاہو اور صبح و شام اپنے رب کی حمد کی تسبیح پڑھو۔ بیشک جو لوگ اللہ کی آیات کے بارہ میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو جھگڑتے ہیں ان کے سینوں میں محض ایک گھمنڈ ہے جو پورا نہ ہوگا۔ پس اللہ کی پناہ ڈھونڈو۔ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ کے عہد پر قایم رہنا، اس پر پورا بھروسہ کرنا، اس کی راہ میں مصائب جھیلنا اور عاقبت کار کی کامیابی کا منتظر رہنا کتنی کٹھن راہ ہے اور اس میں ہر قدم پر صبر و ثبات کی کتنی ضرورت ہے۔

یہی حال قربانی کا ہے۔ یہ اس عظیم الشان صبر کی تعلیم پر مبنی ہے۔ جو ابراہیم خلیل نے کیا تھا۔ بڑھاپے تک خدا نے ان کو کوئی اولاد نہیں بخشی لیکن جب بخشی اور ایسی اولاد بخشی جس کے حسن و باطن اور حسن ظاہر نے ان کو اپنا گرویدہ بنالیا، تو اسی اولاد کو اپنی راہ میں قربان کرنے کا حکم دیدیا۔ کتنا کٹھن امتحان تھا! لیکن حضرت ابراہیم کے پائے ثبات کو لغزش نہیں ہوئی، بلکہ وہ خدا کے شکر گذار رہے کہ اس نے ان سے وہ چیز مانگی جو ان کو تمام دنیا میں سب سے زیادہ عزیز و محبوب تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز پر ہمارا صبر اسی طرح کا صبر ہے جس طرح ہم مصیبت کے تحمل کے وقت کرتے ہیں۔ نماز اور خدا کی جانی و مالی آزمائشوں کے وقت صبر میں جو تعلق ہے اس کو آیت ذیل بے نقاب کر دیتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۔ (بقرہ ۱۵۳-۱۵۸)	اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے، اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے ہم تم کو کسی قدر خوف، بھوک، مال جان اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے۔ اور ثابت قدموں کو بشارت دو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے کہتے ہیں:- ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے برکتیں اور رحمت ہے اور وہی لوگ راہ یاب ہیں بیشک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں، پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، کچھ مضائقہ نہیں کہ ان کا طواف کرنے اور جس نے اپنی خوشی سے نیکی کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے

آیت میں مروہ کا بھی تذکرہ ہے، اور ہم اس آیت کی تفصیل کے ذیل میں مفصل لکھ چکے ہیں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم نے قربانی کی تھی، اب غور کرو اس آیت میں

صبر، جہاد، مصائب اور مقام قربانی کا تذکرہ ایک ساتھ ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ایک جامع حقیقت نے ان سب کا رشتہ ایک ساتھ جوڑ دیا ہے۔

۱۰۔ ان دونوں میں اس امر کا اقرار و اعتراف ہے کہ ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، اور تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں۔ نماز میں یہ حقیقت بالکل ظاہر ہے، اس کی بنیاد ہی شکر اور اقرار ربوبیت پر ہے۔ غور کرنے سے یہی بات قربانی میں بھی معلوم ہوتی ہے، یہ بھی زبان حال سے گویا اسی حقیقت کا اظہار ہے، ہم قربانی کر کے گویا اقرار کرتے ہیں کہ : ہر چیز خدا کی ملکیت ہے، تمام نعمتیں اسی کی بخشی ہوئی ہیں۔ ہماری جانیں اور ہمارے مال سب اللہ کے خزانہ جود و فیض سے ہم کو نصیب ہوئے ہیں، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کو خدا کے حوالہ کریں اور اس کی طاعت و بندگی کی راہ میں ان کو استعمال کریں یہ ہم کو اسی لیے بخشے گئے ہیں کہ ہم اس کے فضل و احسان کی شکر گزاری کریں، اور جہاں اس کی مرضی ہو وہاں ان کو قربان کر دیں، اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے، اس لیے ہم صرف اسی کی بندگی کرتے ہیں اور اسی کے حضور سجدے کرتے ہیں، اور جو کچھ اس کا بخشا ہوا ہے، اسی کے دربار میں پیش کرتے ہیں، وہی پیدا کرنے والا اور وہی بخشنے والا ہے۔ اس نے ہماری زبانوں پر انا للہ و انا الیہ راجعون کا اقرار جاری کیا یعنی ہم اور ہماری تمام ملکیت خدا کے لیے ہے۔ حکومت اور احسان صرف اسی کی صفات ہیں، ہمارے لیے صرف اطاعت اور شکر گزاری ہے جس طرح ملکیت مالک کی طرف لوٹتی ہے، اسی طرح ہم کو خدا کی طرف لوٹنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے لئے کسی چیز سے یہاں تک کہ اپنے نفس سے متمتع ہونا بھی اس وقت تک جائز نہ ہوا جب تک ہم اس کا نام لے کر اس کی بخشش کا اقرار نہ کریں۔ اسی اصل عظیم کی تعلیم کے لیے اس نے ہمارے لیے قربانی کا فریضہ ٹھیرایا تاکہ خدا نے جو انعام و بہائم ہمارے لیے مسخر کیے ہیں ہم ان کو اس کے نام پر قربان کریں۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ (حج ۳۴)

اور ہر امت کے لیے ہم نے قربانی قرار دی تاکہ جو چوپائے ان کو روزی کئے ہیں، ان کو اللہ کے نام پر قربان کریں۔

كَذَٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ (ع - ۳۷)

اسی طرح خدا نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے تاکہ خدا نے تم کو جو ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی بڑائی کرو

حیوانات پر انسان کو خدا نے جو اختیار و تصرف بخشا ہے، اس میں آقائی اور بندگی کی شان پیدا ہوگئی ہے، اس لیے ان کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینا ضروری کر دیا گیا ہے اسی طرح زمین کی پیداوار میں بھی اس نے اپنا ایک حق رکھا تاکہ ہم یہ بات بھول نہ جائیں کہ یہ خدا کی بخشش سے ہم کو ملی ہے۔ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۔ اور جب پھل آئے تو ان کا پھل کھاؤ اور کاٹنے کے دن اس کا حق دو۔ چونکہ ہمارے قبضہ میں جو کچھ ہے خدا کی ملکیت ہے، اس لیے اسراف ناجائز ہوا۔ اور چونکہ حضرت ابراہیم نے خدا کی ملکیت کی سب سے بڑی شہادت دی کہ اپنی جان اور اپنے محبوب لخت جگر کو اس کی راہ میں پیش کر دیا۔ اس لیے قربانی کے بیان کے لیے انہی کا بہترین نمونہ مثال قرار دیا گیا کہ خدا کی امانت خدا کے حوالہ کرنے کی اس سے بڑھ کر مثال نہیں تھی۔

۱۱۔ یہ دونوں تقرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے۔ نماز کی سب سے زیادہ نمایاں حقیقت توجہ الی اللہ ہے، جو شخص نماز میں ہے وہ گویا اپنے رب کے حضور کھڑا ہے اور اس سے مناجات و گفتگو کر رہا ہے، وہ دائیں بائیں کسی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس لیے نماز نہ صرف ذریعہ تقرب بلکہ عین تقرب ہے۔ یہ آیت اس کی دلیل ہے۔ واسجد واقترب (اور سجدہ کر اور قریب ہو جاؤ) اس لیے نماز راس العبادات قرار پائی۔ میرے خیال میں صلوٰۃ کا اصلی مفہوم قربت قریبہ، کسی شئے کی

طرف بڑھنا اور اس میں داخل ہو جانا ہے، اسی لیے گھوڑ دوڑ کے اس گھوڑے کو جو اگلے گھوڑے کے بعد ہو مصلی کہتے ہیں۔ جو شخص آگ کے پاس نہایت قریب ہو کر تاپ رہا ہو اس کو صالی کہتے ہیں۔ یہی لفظ اس کے لیے بھی استعمال کیا جائے گا، جو آگ میں گھس جائے۔

بعینہ یہی حقیقت قربانی میں بھی مضمر ہے۔ قربانی کرنے والا اپنی قربانی ایسی جگہ لاتا ہے، جو اس کے خیال میں خدا کی طرف سے اس عبادت کیلیے مخصوص اور مقدس ہوتی ہے اسی وجہ سے قربانی کے لیے ایک مخصوص و متعین جگہ قرار پائی۔ یہود کے یہاں بیت المقدس کے سوا کسی دوسری جگہ قربانی جائز نہیں، لیکن مسلمانوں کے لیے جس طرح تمام زمین کو مسجد ہونے کا شرف حاصل ہوا اسی طرح قربانی بھی ان کے لیے ہر جگہ جائز ہوئی تاہم جس طرح مسجد کی نماز کو فضیلت حاصل ہے اسی طرح قربان گاہ پر قربانی کرنا افضل ہے۔ حضرت ابراہیم کی قربانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ متعین فرمائی تھی، اور یہی جگہ ہمارے لیے بھی مخصوص ہوئی چنانچہ جس طرح ہم انکی مسجد کیلیے کھنچے جاتے ہیں، اسی طرح اپنے قربانی کے جانوروں کو بھی ان کی قربان گاہ پر لے جاتے ہیں۔ ان باتوں کا مقصد ہمارے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرنا ہے کہ ہماری حیثیت غلاموں اور چاکروں کی ہے جو لبیک کہتے ہوئے آقا کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں، اور اس کی خوشنودی اور اپنی بندگی کے اقرار کے لیے اپنی قربانیاں اس کے حضور میں پیش کرتے ہیں پس جس حقیقت کو پیش نظر رکھکر صلوٰۃ کو صلوٰۃ کہا گیا اسی حقیقت کی رعایت سے قربانی کے لیے قربانی کا لفظ اختیار کیا گیا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔

سمنوا ضحایا کم فانہا مطایا کم۔ اپنی قربانیوں کو فربہ کرو، کیونکہ وہ تمہاری سواریاں ہیں اس میں بھی اس حقیقت کی جھلک موجود ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اونٹ کی قربانی اس امت کے مخصوصات میں سے ہے۔ (دیکھو فصل ثانی)۔

۱۲ نماز اور قربانی عبادت کے تمام طریقوں میں سب سے زیادہ قدیم اور فطرت انسانی میں

سب سے زیادہ رائج ہیں۔ سجدہ رکوع اور نذر اظہار بندگی کے وہ ہر دلعزیز ذرائع ہیں جو ہر
وملت میں عام اس سے کہ وہ ایک خدا کی پرستار رہی ہو یا متعدد دیوتاؤں کی اس نے کسی
یا بت کو پوجا ہو یا کسی انسان کو معبود بنایا ہو عام رہے ہیں۔ بلاشبہ مہذب اور وحشی قوموں
برحق اور گمراہ جماعتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے، اور یہ فرق ان کی نمازوں اور قربانیوں پر
بدرجہ اتم نمایاں رہتا ہے تاہم نماز اور قربانی کی مقبول، محبوب عبادت کسی نہ کسی شکل
خواہ وہ کتنی ہی مسخ شدہ اور بگڑی ہوئی ہو ہر جماعت میں پائی گئی ہے جس طرح معبود
ایک عام مفہوم میں باہم اگر متفق ہونے کے باوجود خود معبود کے بارے میں ان کے آرا رو
نے الگ الگ راہیں اختیار کریں، اسی طرح ان عبادتوں کے اشکال وصور بھی ہر ایک
یہاں مختلف سانچوں میں ڈھل گئے لیکن ایک مشترک حقیقت پر اتفاق باقی رہا۔ باقی عبا
کے بارے میں تم کو یہ اتفاق رائے نظر نہیں آئے گا۔

پہلے سب کی تفصیلات کے ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایمان و اسلام تمام کائنات
ہیں اور نماز و قربانی انہی دونوں کی صورتیں ہیں۔ اب مذکورہ بالا حقیقت کے ظاہر ہو جا
کے بعد تم پر یہ راز بھی کھل جائے گا کہ دین و عبادت کی راہ میں سب ایک ہی نقطے سے چلے تھے
لیکن اوہام و ظنون اور اغراض و اہواء نے خلط مبحث کر کے ان کو بے شمار راہوں پر ڈا
پس یہ اختلاف جو آج نظر آ رہا ہے، افراط و تفریط اور افساد و اختلاط کا نتیجہ ہے حقیقۃ
اختلاف نہیں ہے۔

تفسیر سورۃ النصر

از جناب مولنا عبدالقدیر صدیقی

اس سورہ کا نام سورۃ النصر ہے۔ اس میں تین آیتیں ہیں۔ یہ سورۃ مدینۂ منورہ میں اتری ہے۔ قریش اور دیگر قبائل عرب کا قاعدہ تھا کہ ماہ ہائے ذی القعدہ۔ ذی الحجہ محرم اور ماہ رجب میں امن و صلح رہتی۔ حج کرنے والوں کو کوئی نہ روکتا نہ ستاتا۔ ان مہینوں کو اشہر حُرُم کہتے تھے۔ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حج کا ارادہ کیا تو کفار نے خلاف قاعدہ عرب حضرت اور آپ کے اصحاب کو حج سے مقام حدیبیہ روکا۔ اس پر سب نے آپکے ہاتھ پر آخر وقت تک جنگ کرنے کے لیے بیعت کرلی۔ بڑی گفت وشنید کے بعد صلح ٹھیری۔ شرائط صلح میں یہ بھی تھا کہ دس سال تک باہم جنگ نہ ہو۔ بنی بکر کفار قریش کے حلیف رہیں گے۔ اور بنی خزاعہ رسول خدا اور مسلمانوں کے حلیف۔ ایک دفعہ بنی بکر و بنی خزاعہ میں لڑائی ہوگئی۔ کفار قریش نے اپنے حلیفوں کی مدد کی اسلیے رسول خدا صلعم کو بھی ضرور ہوا کہ اپنے حلیفوں کی مدد فرمائیں۔ آپکے ہمراہ رکاب سعادت مدینہ منورہ سے ۱۰ ہزار سپاہی نکلے۔ راستہ میں دو ہزار سپاہی اور آکر مل گئے۔ جملہ ۱۲ ہزار کی فوج سے حضرت نے دفعۃً مکۂ شریف کا محاصرہ کرلیا فرمان رحمت نشان جاری ہوا۔ جو ابوسفیان سردار قریش کے گھر میں پناہ لے اس کو امان جو مسجد الحرام یعنی مسجد کعبۃ اللہ شریف میں آئے اس کو امان جو ہتیار ڈالدے اس کو امان۔ عربوں کا خیال تھا کہ مکہ معظمہ پر کسی باطل پرست کا قبضہ نہیں ہوسکتا۔ جب مکۂ معظمہ پر حضرت کا قبضہ ہوگیا تو حضرت کے پیغمبر ہونے میں ان کو شک وشبہہ نہ رہا۔ جوق جوق آنے لگے اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی بعض کا قول ہے کہ یہ سورت مدینہ منورہ میں قبل فتح مکہ ہی نازل ہوچکی تھی۔ اس قول کے مطابق اس سورت میں فتح مکہ کی

پیش گوئی ہے۔

اِذَا۔ جب۔ حرف شرط ہے۔ اِذَا یقینی امر پر ہوتا ہے۔ اور اِن مشکوک بات پر۔

نَصر۔ مدد۔ دشمن کے مقابل میں تائید۔ لفظ مدد میں بار بار اعانت اور اس کا دوام ملحوظ ہے۔ اعانت سے کام میں سہولت ہوتی ہے۔ تائید میں قوت مدنظر ہے۔

الفتح۔ کھولنا۔ دشمن کے قلعہ کا دروازہ کھول کر داخل ہونا۔ فتح ملک کی ہوتی ہے ظفر دشمن پر ہوتی ہے۔ ال کئی قسم پر ہے (۱) عہد خارجی یعنی مخصوص و معین۔ اس سے جو قضیہ و جملہ بنتا ہے وہ شخصیہ مخصوصہ ہوتا ہے۔ جیسے جاء الرجل۔ فلاں شخص آیا۔ (۲) لام طبیعت جیسے الرجل خیر من المرأۃ۔ یعنی مرد کی طبیعت عورت کی طبیعت سے بہتر ہے اس سے قضیہ طبیعیہ بنتا ہے۔ (۳) جنس کا ال جو کل پر صادق آتا ہے۔ اور اس سے افراد مقصود ہوتے ہیں جیسے الانسان حیوان۔ یعنی جنس انسان پر جنس حیوان صادق آتی ہے اس سے قضیہ مہملہ بنتا ہے۔ (۴) عہد ذہنی جنس میں سے کوئی ایک فرد جیسے دخل السوق۔ بازار جاؤ یہاں کوئی خاص بازار مراد نہیں ہے۔ اس سے قضیہ جزئیہ بنتا ہے۔ (۵) استغراق جمیع افراد۔ کل۔ ہر ایک۔ جیسے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ ہر شخص نقصان میں ہے۔ بجز ایمانداروں کے۔ اس سے قضیہ کلیہ بنتا ہے۔

النصر اور الفتح سے مطلق نصرت و فتح مراد ہے تو ال جنس کا ہے۔ اگر النصر اور الفتح سے فتح و نصرت مکہ مراد ہے تو ال عہد خارجی کا ہے۔

جَآءَ کہا گیا۔ حضر یا حصل نہیں کہا گیا۔ کیونکہ اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ خدا کی فتح و مدد تقادیر الہیہ سے اوقات معینہ پر پہنچتی ہے۔

رایت رؤیۃ۔ آنکھوں سے دیکھنا۔ رویا خواب دیکھنا۔ رویۃ۔ سمجھنا۔ جاننا ..... رأیاً۔ مناسب جاننا۔

الناس۔ لوگ، اس لفظ کی تحقیق سورۃ الناس میں ہو چکی ہے۔

یدخلون۔ مثل نصر داخل ہوتے ہیں۔ دخل البیت اور فی البیت دونوں درست ہیں مگر دخل الدین نہیں آتا۔ رأیت کو اگر ابصرتَ دیکھنے کے معنی میں لیں تو یدخلون حال ہوگا کیونکہ اس معنے پر اس کا ایک مفعول ہوتا ہے۔ اور اگر رأیتَ علمتَ اور جاننے کے معنے میں ہو تو یَدْخُلُوْنَ بتاویل الدخول کے دوسرا مفعول ہوگا۔

سَبِّحْ۔ پاکیزگی بیان کر۔ سبح الرجل دور ہو گیا۔ سبح القوم لوگ منتشر ہو گئے سبح اللہ تعالی۔ اللہ تعالی کی ذات مقدسہ کی تنزیہ کی۔ یعنی اللہ تعالی کا تمام صفات و عیوب مخلوقات سے دور اور پاک ہونا بیان کیا۔

حَمْد۔ شکر۔ مدح و ثنا۔ راضی ہونا۔ حق ادا کرنا۔ خدائے تعالی کی ذات مقدسہ کی تسبیح و تنزیہ کی جاتی ہے اور اس کے اسماء و صفات۔ کمالات اور انعامات پر حمد کی جاتی ہے اس لیے حمد کے ساتھ اسم رب لایا گیا ہے جو مسلسل متواتر احسانات پر دلالت کرتا ہے۔

وَاسْتَغْفِرْہُ۔ غفر۔ ڈھانکنا۔ چھپانا۔ مغفر۔ خود لوہے کی ٹوپی جو سر کو چھپاتی ہے۔ مغفرۃ گناہ کو یا خود شخص کو دامن رحمت میں چھپانا۔ مغفرۃ میں گناہ چھپایا جاتا ہے مگر رہتا ہے۔ عفو میں گناہ مٹا دیا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے گناہ کیے ہیں، ان کے گناہ مغفرت سے دامن رحمت میں چھپا دیے جاتے ہیں جن لوگوں نے گناہ کیے ہی نہیں ان کی مغفرت اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ تعالی ان کو دامن رحمت میں اس طرح چھپا لیتا ہے کہ گناہ کی رسائی ان تک ہو ہی نہیں سکتی۔ تو اگر وہ شخص پیغمبر ہو تو اس کو معصوم کہتے ہیں۔ اور ولی ہو تو اس کو محفوظ کہتے ہیں۔ پیغمبر کی عصمت کی ضرورت ہے اور ولی کی حفاظت مالک کی عنایت ہے۔ کرامت ہے۔ انبیا اور رسل کے استغفار کی متعدد صورتیں ہیں۔

(۱) امت کی جانب سے بحیثیت وکیل اور نمایندہ امت کے استغفار۔ (۲) اپنے ماقبل کی حالت جو موجودہ ترقی شدہ حالت کے لحاظ سے ایک نوع کا گناہ معلوم ہوتی ہے، اس سے استغفار۔ (۳) پیغمبر کو ترک اولی پر سرزنش کی جاتی ہے، اور وہ اسپر استغفار کرتے ہیں۔ (۴) وحی کا انتظار نہ کرکے اعتبار و اجتہاد سے کام لینے پر بھی سرزنش ہوتی ہے اور پیغمبر اس سے استغفار کرتے ہیں۔ (۵) بعض دفعہ ہجوم افکار ابر کی طرح دل پر چھا جاتے ہیں اور پیغمبر یا اولیا جن کا کام ہے تحت تقادیر الہیہ رہنا، فکر کرنے سے استغفار کرتے ہیں۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ۔

جب اللہ کی فتح و نصرت آگئی اور مکہ فتح ہوگیا۔ جس کی بظاہر کوئی امید تھی ہی نہیں۔ اور تم نے دیکھ لیا کہ لوگ اللہ کے دین میں فوج فوج، قبیلہ قبیلہ داخل ہو رہے ہیں تو تم ذات پاک پروردگار کی تنزیہ بیان کرو۔ جو ان اصنام اور بتوں کی پلیدی سے پاک ہے اپنے پروردگار کے احسانات کا عموماً اور خصوصاً فتح مکہ اور نشر اسلام کا شکر ادا کرو۔ [illegible] دعائے مغفرت کرو۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ تاب مثل تعالیٰ رجوع کیا۔ پلٹا۔ لوٹا۔ توّاب بہت رجوع کرنیوالا۔ ترجمہ بیشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحمت کے ساتھ رجوع کرنے والا ہے۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ   گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ

ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست   صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جب یہ سورت اتری تو حضرت عباس رونے لگے۔ وہ سمجھ گئے کہ فرض رسالت پورا ہو چکا اب دنیا سے حضرت کے پردہ کرنے کا وقت آگیا اور ہوا بھی یہی کہ تھوڑی مدت میں آپنے دنیائے فانی پر آخرت جاودانی کو ترجیح دی۔ لا الہ الا اللہ الحق المبین محمد رسول اللہ الصادق الامین۔

رسائل و مسائل

سُود، پردہ، طلاق اور مہر

(۲)

اشاعت گذشتہ میں مسائل مندرجۂ عنوان کے متعلق ڈاکٹر سیادت علی صاحب کے بیانات پر ایک مجموعی نظر ڈال کر صرف یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ ناکافی تحقیق اور ناکافی غور و خوض پر مبنی ہے۔ اب ہم ان میں سے ایک ایک پر جدا جدا بحث کر کے یہ بتائیں گے کہ اس کے متعلق اسلام کی حقیقی تعلیم کیا ہے اور مسلمانوں کی جن مشکلات کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں بیان کیا ہے ان کو کس طرح شریعت کے مطابق حل کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سُود

عام طور پر سود کے متعلق اسلامی قانون کے احکام کو سمجھنے میں جو غلطی واقع ہو رہی ہے اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں وہ معاشی نظام جس کو اسلام نے قائم کیا تھا، درہم برہم ہو چکا ہے، اس کے اصول و نظریات بھی دلوں سے محو ہو گئے ہیں۔ اور ہمارے گرد و پیش کی دنیا پر ایک ایسا نظام پوری طرح حاوی ہو گیا ہے جس کی بنیاد "سرمایہ داری" کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظم معیشت نہ صرف عملاً ہم پر محیط ہے بلکہ ہمارے دل و دماغ پر بھی اس کے اصول و نظریات چھا گئے ہیں۔ اس لیے جب کسی معاشی مسئلہ پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا نقطۂ نظر وہی ہوتا ہے جو سرمایہ داری کا نقطۂ نظر ہے، ہماری بحث و تحقیق کی ابتدا ہی اس طرح ہوتی ہے کہ ہم پہلے معاشیات کے سرمایہ دارانہ نظریات اور اصولوں کو مان لیتے ہیں اور اس کے بعد کسی معاشی طریقہ کے جواز و عدم جواز پر

گفتگو کرتے ہیں لیکن اگر تھوڑی سی سمجھ سے کام لیا جائے تو یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ تحقیق کا یہ طریقہ اصلاً غلط ہے۔ اسلام کا نظم معیشت اپنے نظریہ اور اپنے اصول میں سرمایہ داری کے نظم معیشت سے بالکل مختلف ہے، دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں، دونوں کی روح جدا جدا ہے، دونوں کے مناہج علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اب اگر کسی مسئلہ کے متعلق سرمایہ داری کے اصول و نظریات کو تسلیم کرکے اسلام کے معاشی احکام میں سے کسی حکم پر نظر ڈالی جائے گی تو لامحالہ یا تو وہ بالکل ہی غلط نظر آئے گا، یا اس میں ایسی ترمیم کردی جائے گی جس سے وہ اسلامی قانون کے اصول سے ہٹ کر بالکل سرمایہ داری کے قالب میں ڈھل جائیگا اور اس میں نہ اسلامی روح باقی رہے گی، نہ اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد اس سے حاصل ہوسکیں گے، اور نہ وہ اپنے جوہر میں حقیقۃً ایک اسلامی حکم ہوگا۔

یہی بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے سود کے معاملہ میں ہمارے جدید معاشی مفکرین اسلامی احکام کو سمجھنے اور ان کے اغراض و مصالح کا ادراک کرنے میں ٹھوکروں پر ٹھوکریں کھاتے چلے جارہے ہیں۔ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ اسلام کا معاشی نظام کن اصولوں پر قائم کیا گیا ہے، اس کے مقاصد کیا ہیں، اس کی روح کیا ہے، سود کو اس نے کیوں حرام قرار دیا ہے، سودی لین دین کی مختلف اشکال میں علت حرمت کیا شئے ہے، اور جن معاملات میں یہ علت پائی جاتی ہے ان کو اسلامی نظم معیشت میں کھپا دینے سے کیا قباحت واقع ہوتی ہے۔ ان تمام اساسی امور سے بیگانہ ہوکر جب وہ کلیۃً سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سود کے متعلق اسلامی قانون پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کو درحقیقت سود کی حرمت کے لیے کوئی دلیل ہی ہاتھ نہیں آتی، کیونکہ سود تو سرمایہ داری کی جان اور اس کی روح رواں ہے، اس کے بغیر سرمایہ داری کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا، اور کسی ایسے نظام معاشی کا سود سے خالی ہونا غیر ممکن ہے جس کی عمارت سرمایہ داری کے اصولوں پر قائم ہو۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ علمی اور عملی حیثیت سے یہ حضرات اسلام کے بھی پیرو ہیں، اور قصداً اس کے دائرے سے نکلنا نہیں چاہتے۔ یہ اعتقاد کی بنا

ان کو مجبور کرتی ہے کہ سود کی حرمت سے انکار نہ کریں مگر ان کا علم اور عمل ان کو مجبور کرتا ہے کہ سود کے متعلق اسلامی احکام کی بندشوں کو توڑ دیں۔ دل اور دماغ کی یہ کشمکش ایک مدت سے جاری ہے اور اب اس میں مصالحت کی آسان صورت یہ نکالی گئی ہے کہ اسلامی احکام کی تعبیر اس طرح کی جائے کہ سود ایک اسم بے مسمّٰی ہونے کی حیثیت سے تو بدستور حرام کا حرام رہے، مگر نظامِ سرمایہ داری میں اس کے جتنے مسمّٰی پائے جاتے ہیں، وہ قریب قریب سب حلال ہو جائیں۔ زیادہ سے زیادہ جس چیز کے خلاف ان کو سرمایہ داری کے اصولوں سے کوئی دلیل ہاتھ آتی ہے وہ مہاجنی سود "یوژری" ہے لیکن اس کو بھی کلیتہً مسدود کر دینے کی کوئی وجہ وہ نہیں پاتے۔ ان کے نزدیک ضرورت صرف اس کی تحدید کی ہے اور اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ سود کی فی صدی شرح ناقابل اور اٹھ اور کسی حال میں سود در سود (اضعافاً مضاعفۃً) تک نوبت نہ پہنچے!

یہ ایک دھوکہ ہے جس میں یہ حضرات بغیر سمجھے بوجھے مبتلا ہو گئے ہیں۔ بیک وقت دو مخالف سمتوں میں سفر کرنے والی کشتیوں پر سوار ہونا، کسی مردِ عاقل کا کام نہیں ہو سکتا۔ اگر بے خبری کی وجہ سے اس نے ایسا کیا بھی ہو تو ہوشمندی کا اقتضا یہ ہے کہ جونہی اس کو اپنی اس غلطی پر تنبہ ہو، وہ اپنے لیے دونوں کشتیوں میں سے ایک کو پسند کر کے دوسری کشتی سے فوراً پاؤں کھینچ لے۔ سود کے حلال و حرام ہونے کی بحث اور اس کے حدود کی تعیین تو بعد کی چیز ہے۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ آپ اسلامی نظمِ معیشت اور سرمایہ دارانہ نظمِ معیشت کے اصول اور روحی فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں اور قرآن و حدیث کے احکام پر غور کر کے ان اصول و قواعد سے باخبر ہو جائیں جن پر اسلام نے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان ایک متوسط نظمِ معیشت قائم کیا ہے۔ اس تحقیق سے آپ پر خود بخود منکشف ہو جائیگا کہ اسلام جس ڈھنگ پر انسان کے معاشی معاملات کی تنظیم کرتا ہے اس میں صرف یہی نہیں کہ سود کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ وہ سرے سے اس نظریہ اور اس ذہنیت اور ان معاشی

حالات ہی کا استیصال کر دیتا ہے جن کی وجہ سے سودی معاملات کی مختلف صورتیں وجود میں آتی ہیں اس کے بعد آپ کے لیے ناگزیر ہوگا کہ دو راہوں میں سے ایک راہ انتخاب کرلیں ایک راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصول معاشیات کو رد کرکے سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے اصولوں پر ایمان لے آئیں اس صورت میں آپ کو اسلام کے اصول اور احکام میں ترمیم کرنے کی زحمت ہی نہ اٹھانی پڑے گی۔ بلکہ آپ کے لیے سیدھا اور صاف راستہ یہ ہوگا کہ اس کے اتباع سے انکار کر دیں۔ دوسری راہ یہ ہے کہ آپ اسلام کے اصول معاشی کو تو صحیح سمجھیں اور سود کو اس کی تمام صورتوں کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرت حرام جانیں، مگر سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے گھر جانے کے باعث اپنے آپ کو اس حرام چیز سے محفوظ رکھنے میں قاصر پائیں اس صورت میں آپ سود کھانا اور کھلانا چاہیں تو کھائیے اور کھلائیے کیونکہ ہر گناہ کرنے کا آپ کو اختیار حاصل ہے۔ مگر ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ جرأت آپ کبھی نہیں کرسکتے کہ سود کو حلال کرکے کھائیں یا کھلائیں، اور اپنے ضمیر پر سے گناہ کے بار کو ہلکا کرنے کے لیے اس چیز کو پاک کرنے کی کوشش کریں جس کو خدا اور اس کے رسول نے ناپاک قرار دیا ہے۔ ایک شخص حق رکھتا ہے کہ علانیہ اسلام کے قانون کو رد کرکے کسی دوسرے قانون کی پیروی اختیار کرلے اور بدرجۂ آخر یہ حق بھی اس کو حاصل ہے کہ اسلامی قانون کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ماتحت ایک گنہگار بندہ بن کر رہنا پسند کرے، یا نامساعد حالات میں مجبوراً ایسا بن جائے۔ لیکن کسی حال میں یہ حق تو کسی کو بھی نہیں پہنچتا کہ اسلامی قانون کو جس غیر اسلامی قانون سے چاہے بدل دے اور پھر دعویٰ کرے کہ یہ بدلا ہوا قانون ہی دراصل اسلام کا قانون ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم ان مباحث کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

نظامِ سرمایہ داری نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد جس نظریہ پر قائم ہے وہ صاف اور سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا تنہا مالک ہے، اس کی کمائی میں کسی کا کوئی حق نہیں ہے، اس کو پورا اختیار ہے کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے، اور وہ حق رکھتا ہے کہ جس قدر وسائلِ ثروت اس کے قابو میں آئیں ان کو روک رکھے اور اپنی ذات کے لیے کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر ان کو صرف کرنے سے انکار کر دے۔ یہ نظریہ اس خود غرضی سے شروع ہوتا ہے جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، اور آخرکار اس انتہائی خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کی تمام ان صفات کو دبا دیتی ہے جن کا وجود انسانی جماعت کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ اگر اخلاقی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تقسیمِ ثروت کا توازن بگڑ جائے، وسائلِ ثروت رفتہ رفتہ سمٹ کر ایک زیادہ خوش قسمت یا زیادہ ہوشیار طبقہ کے پاس جمع ہو جائیں اور سوسائٹی عملاً دو طبقوں میں تقسیم ہو جائے، ایک مالدار، دوسرا نادار۔ مالدار طبقہ تمام وسائلِ ثروت پر قابض و متصرف ہو کر ان کو محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے، اور اپنی دولت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو جس طرح چاہے قربان کر دے۔ رہا نادار طبقہ تو اس کے لیے وسائلِ ثروت میں سے حصہ پانے کا کوئی موقع نہ ہو الّا یہ کہ وہ سرمایہ دار کے مفاد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے زندگی بسر کرنے کا کم سے کم سامان حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظمِ معیشت ایک طرف ساہوکار، کارخانہ دار، اور زمیندار پیدا کرے گا اور دوسری طرف مزدور، کسان اور قرضدار۔ ایسے نظام کی عین فطرت اس کی مقتضی ہے کہ سوسائٹی سے ہمدردی، اور امدادِ باہمی کی اسپرٹ مفقود ہو۔ ہر شخص بالکلیہ اپنے ذاتی وسائل پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ کوئی کسی کا یار و مددگار نہ ہو۔ محتاج کے لیے معیشت کا دائرہ تنگ ہوتا جائے۔ سوسائٹی کا ہر فرد بقائے حیات کے لیے دوسرے افراد کے مقابلہ میں معاندانہ جد و جہد کرے، زیادہ

زیادہ وسائل ثروت پر قابو پانے کی کوشش کرے، اپنے مفاد کے لیے اُن کو روک رکھے، اور صرف ازدیادِ ثروت کے لیے انہیں استعمال کرے۔ پھر جو لوگ اس جد و جہد میں ناکام ہوں یا اس میں حصہ لینے کی قوت نہ رکھتے ہوں ان کے لیے دنیا میں کوئی سہارا نہ ہو۔ وہ بھیک بھی مانگیں تو ان کو بہ آسانی نہ مل سکے۔ کسی دل میں ان کے لیے رحم نہ ہو، کوئی ہاتھ ان کی مدد کے لیے نہ بڑھے۔ یا تو وہ خودکشی کرکے زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کریں، یا پھر جرائم اور بے حیائی کے ذلیل طریقوں سے پیٹ پالنے پر مجبور ہوں۔

سرمایہ داری کے اس نظام میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کا میلان روپیہ جمع کرنے کی طرف ہو اور وہ اس کو صرف پیدا آور اغراض کے لیے استعمال کرنے کی سعی کریں۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں قائم کی جائیں، بنک کھولے جائیں، پراویڈنٹ فنڈ قائم ہوں، انشورنس کمپنیاں بنائی جائیں۔ امداد باہمی کی جمعیتیں تیار کی جائیں اور ان تمام مختلف معاشی تدبیروں میں ایک ہی روح کام کرے، یعنی روپے سے روپیہ پیدا کرنا، خواہ وہ تجارتی لین دین کے ذریعہ سے ہو، یا سود کے ذریعہ سے۔ سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے سود اور تجارتی لین دین کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ اس لیے نظامِ سرمایہ داری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف خلط ملط ہو جاتے ہیں، بلکہ کاروبار کی ساخت میں ان کی حیثیت تانے بانے کی سی ہوتی ہے۔ تجارت کے لیے سود اور سود کے لیے تجارت لازم و ملزوم ہیں اور ان میں سے کسی کو دوسرے کے بغیر فروغ نہیں ہو سکتا۔ اگر سود نہ ہو تو سرمایہ داری کا تار و پود بکھر جائے۔

نظامِ اشتراکی سرمایہ داری کے عین مقابل ایک دوسرا نظامِ معیشت ہے جس کو اشتراکی نظام کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ تمام وسائلِ ثروت سوسائٹی کے درمیان مشترک ہیں، اس لیے افراد کو فرداً فرداً ان پر مالکانہ قبضہ کرنے اور اپنے حسبِ منشاء ان میں تصرف کرنے، اور ان کے منافع

تنہا متمتع ہونے کا حق نہیں ہے اشخاص کو جو کچھ ملے گا وہ محض ان خدمات کا معاوضہ ہوگا جو سوسائٹی کے مشترک مفاد کے لیے وہ انجام دیں گے۔ سوسائٹی ان کے لیے ضروریات زندگی فراہم کرے گی اور وہ اس کے بدلہ میں کام کریں گے۔

یہ نظریہ ایک دوسرے ڈھنگ پر معیشت کی تنظیم کرتا ہے جو بنیادی طور پر نظام سرمایہ داری سے مختلف ہے۔ اس تنظیم میں سرے سے ملکیت شخصی ہی کا وجود نہیں پھر کہاں اس کی گنجائش کہ کوئی زر جمع کرے اور اس کو بطور خود کاروبار میں لگائے۔ یہاں چونکہ نقطۂ نظر اور اصول میں اختلاف ہو گیا ہے اس لیے مناہج بھی بدل گئے ہیں۔ نظام سرمایہ داری کا کارخانہ بنکنگ انشورنس اشتراکی سرمایہ اور ایسے ہی دوسرے اداروں کے بغیر نہیں چل سکتا لیکن اشتراکیت کی ساخت اور اس کے معاشی معاملات میں نہ ان اداروں کی گنجائش ہے، نہ ضرورت۔ سرمایہ داری کے مزاج سے سود کو جتنی گہری مناسبت ہے، اشتراکیت کے مزاج سے اس کو اتنی ہی زیادہ شدید ناموافقت ہے۔ اشتراکیت اس چیز کی بنیاد ہی مسمار کر دیتی ہے جس کی بناء پر ایک شخص سود لیتا اور دوسرا شخص سود دیتا ہے۔ اس کے اصول کسی شکل اور کسی حیثیت میں بھی سود کو جائز نہیں رکھتے اور جو شخص ان اصولوں پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے ممکن نہیں کہ بیک وقت اشتراکی بھی ہو اور سودی لین دین بھی کرے۔

اسلام کا معاشی نظام | اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی ہے مگر اس کے اصول و نظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت کے مشترک مفاد کی خدمت کے لیے آمادہ کرنے والی اور بحیثیت ضرورت اس پر مجبور کرنے والی ہو، بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خود غرضانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے جس سے وہ اپنے شخصی مفاد کے لیے جماعت کے خلاف عملاً جنگ کرنے لگتے ہیں اور سرمایہ داری کا نظام اس جنگ میں ان کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ یہاں تک کہ تقسیم ثروت کا

توازن بالکل بگڑ جاتا ہے۔ ایک طرف چند افراد پوری جماعت کے وسائل ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں، اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ جاتا ہے۔ ابتدا میں سرمایہ داروں کی دولت اپنے شاندار مظاہر سے تمدن میں ایک نظر فریب چمک دمک ضرور پیدا کر دیتی ہے، مگر دولت کی غیر متوازن تقسیم کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ معاشی دنیا کے جسم میں دوران خون بند ہو جائے۔ جسم کے اکثر حصے قلتِ خون کی وجہ سے سوکھ کر تباہ ہوں، اور اعضاءِ رئیسہ کو خون کا غیر معمولی اجتماع تباہ کر دے۔

اشتراکیت اس خرابی کا علاج کرنا چاہتی ہے، مگر وہ ایک صحیح مقصد کے لیے غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصد تقسیم ثروت میں توازن قائم کرنا ہے اور یہ بلاشبہ صحیح مقصد ہے مگر اس کے لیے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو درحقیقت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا، نہ صرف معیشت کے لیے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لیے مہلک ہے، کیونکہ یہ چیز معاشی کاروبار اور نظام تمدن سے اس کی روح رواں، اس کی اصلی قوتِ محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدن و معیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی و عمل کرنے پر ابھارتی ہے، وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ وہ اپنے دل اور دماغ اور دست و بازو کی تمام طاقتیں اس کام میں خرچ کر دیتا ہے جس سے اس کو خود اپنے مفاد کے لیے ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر سرے سے دلچسپی ہی باقی نہ رہے، اور اس کو معلوم ہو کہ اس کے لیے فوائد و منافع کی جو حد مقرر کر دی گئی ہے اس سے بڑھ کر وہ اپنی جد و جہد سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکے گا، تو اس کے قوائے فکر و عمل ٹھٹھر کر

رہ جائیں گے، اور وہ محض ایک مزدور کی طرح کام کرے گا جس کو اپنے کام سے بقدر اجرت ہی دی جاتی ہے یہ تو اشتراکی نظام کا باطنی پہلو ہے، اس کا خارجی اور عملی پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار افراد کا خاتمہ کر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کو وجود میں لاتا ہے یعنی اشتراکی حکومت۔ یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی اس اقلِ قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح افراد سے خدمت لیتا ہے اور ایک مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسباب حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس کے پاس نہ ہمدردی ہے، نہ قدر و اعتراف۔ وہ انسانوں سے انسانوں کی طرح کام نہیں لیتا بلکہ مشین کے کل پرزوں کی طرح کام لیتا ہے، اور ان سے فکر و رائے اور عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کے بغیر نظام اشتراکی نہ قائم ہو سکتا ہے۔ نہ قائم رہ سکتا ہے کیونکہ افراد کی عین فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے۔ اگر ان کو دائماً استبداد کے آہنی شکنجہ میں جکڑ کر نہ رکھا جائے تو وہ اشتراکی نظم کو دیکھتے دیکھتے منتشر کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج روس کی سوویٹ گورنمنٹ دنیا کی حکومتوں میں سب سے زیادہ مستبد اور جابر ہے۔ اس کا یہ جبر و استبداد کچھ اس وجہ سے نہیں کہ محض بخت و اتفاق نے اسٹالین جیسے ڈکٹیٹر کو پیدا کر دیا ہے، بلکہ درحقیقت اشتراکیت کا مزاج ہی ایک شدید ترین ڈکٹیٹرشپ کا مقتضی ہے۔

اسلام ان دو متضاد معاشی نظاموں کے درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے جس کا اصل الاصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے پورے شخصی حقوق دیے جائیں، اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی نہ بگڑنے دیا جائے۔ ایک طرف وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق دیتا ہے، اپنے مال میں تصرف کرنے کے اختیارات دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ ان سب حقوق اور اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ ایسی اخلاقی پابندیاں، اور ظاہر کی راہ سے کچھ ایسی قانونی پابندیاں عائد کر دیتا

ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ وسائل ثروت کا غیر معمولی اجتماع نہ ہو سکے ثروت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش کرتے رہیں، اور گردش ایسی ہو کہ جماعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ مل سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے معیشت کی تنظیم ایک نئے ڈھنگ پر کی ہے جو اپنی روح اور اپنے اصولوں اور اپنے طریق کار کے اعتبار سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے مختلف

آئیے اب ایک تفصیلی نظر انسانی معیشت کی اس الٰہی تنظیم پر بھی ڈال لیجئے۔

اسلام کے اصول معیشت | اسلام کا معاشی نظریہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ معاشی زندگی میں ہر ہر فرد کا شخصی مفاد اور تمام افراد کا اجتماعی مفاد ایک دوسرے کے ساتھ گہرا ربط رکھتا ہے اس لیے دونوں میں مزاحمت کے بجائے موافقت اور معاونت ہونی چاہیے فرد اگر اجتماعی مفاد کے خلاف جدوجہد کر کے جماعت کی دولت اپنے پاس سمیٹ لے، اور اس کو جمع رکھنے یا خرچ کرنے میں محض اپنے ذاتی مفاد کو ملحوظ رکھے تو یہ صرف جماعت ہی کے لیے نقصان دہ نہیں ہے بلکہ مآل کار میں اس کے نقصانات خود اس شخص کی اپنی ذات کی طرف بھی عود کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر اجتماعی مفاد کے لیے افراد کے شخصی مفاد کو قربان کیا جائے تو اس میں صرف افراد ہی کا نقصان نہیں بلکہ مآل کار میں جماعت کا بھی نقصان ہے۔ پس فرد کی بہتری اس میں ہے کہ جماعت خوش حال ہو، اور جماعت کی بہتری اس میں ہے کہ افراد خوش حال ہوں، اور دونوں کی خوشحالی اس پر موقوف ہے کہ افراد میں تعاون اور ہمدردی کا صحیح تناسب قائم ہو ہر شخص اپنے ذاتی فائدے کے لیے جد وجہد کرے، مگر اس طرح کہ اس میں دوسروں کا نقصان نہ ہو ہر شخص جتنا کما سکے کمائے مگر اس کی کمائی میں دوسروں کا بھی حق ہو ہر شخص دولت سے خود بھی نفع حاصل کرے اور دوسروں کو نفع پہنچائے بھی۔ منافع کی اس تقسیم اور دولت کی اس گردش کو جاری رکھنے کے لیے محض افراد کے باطن میں چند اخلاقی اوصاف پیدا کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ جماعت کا قانون بھی ایسا ہونا چاہیے جو مال کے اکتساب اور خرچ دونوں کی

صحیح تنظیم کر دے۔ اس کے ماتحت کسی کو مضرت رساں طریقوں سے دولت کمانے کا حق نہ ہو، اور جو دولت جائز ذرائع سے کمائی جائے وہ بھی ایک جگہ سمٹ کر نہ رہ جائے، بلکہ صرف ہو اور زیادہ سے زیادہ گردش کرے۔

اس نظریہ پر جس نظم معیشت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کا مقصد نہ تو یہ ہے کہ چند افراد کروڑپتی بن جائیں اور باقی تمام لوگ فاقے کریں، اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی کروڑپتی نہ بن سکے اور جبراً سب کو ان کے فطری تفاوت کے باوجود ایک حال میں کر دیا جائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے بین بین اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد کی معاشی ضروریات پوری ہوں۔ اگر ہر شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی فطری حد کے اندر رہ کر اکتساب مال کی کوشش کرے، اور پھر اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں کفایت شعاری اور رادادِ باہمی کو ملحوظ رکھے تو سوسائٹی میں وہ معاشی ناہمواری پیدا نہیں ہو سکتی جو سرمایہ داری کے نظام میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس قسم کا طرز معیشت کسی کو کروڑپتی ہونے سے نہیں روکتا، مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کروڑپتی کی دولت اس کے ہزاروں ابنائے نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو۔ دوسری طرف یہ طرز معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتا ہے، اگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جن کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت اور قابلیت کے مطابق اکتساب مال نہ کر سکتا ہو۔

اسلامی نظم معیشت کے ارکان یہ ہے اسلام کا معاشی نظریہ۔ اب دیکھیے کہ اس نظریہ کے مطابق اسلام نے جو نظم معیشت قائم کیا ہے اس کے اخلاقی اور قانونی ارکان کیا ہیں:-

(۱) اکتساب مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق۔ یہ تفریق اس قاعدۂ کلیہ پر مبنی ہے کہ دولت کمانے کے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا

اشخاص کے نقصان پر ہو، اور ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد و منافع کا مبادلہ اشخاص متعلقہ کے درمیان باہمی رضامندی سے ہو۔ قرآن مجید میں اس قاعدۂ کلیہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ عُدْوَانًا وَظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيهِ نَارًا (۴:۵)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو، بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو، اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے حال پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کرکے ظلم کیساتھ ایسا کریگا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے۔

اس آیت میں لین دین کے لیے جواز کی دو شرطیں بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو۔ دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہ ہو۔ اس معنی میں وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ کا فقرہ نہایت بلیغ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے فائدہ کے لیے دوسرے کا نقصان کرتا ہے وہ گویا اس کا خون بہاتا ہے اور مآل کار میں خود اپنی تباہی کا راستہ کھولتا ہے۔ چوری، رشوت، قمار، دغا و فریب، سود، اور بہت سے بیع کے طریقوں میں عدم جواز کے یہ دونوں اسباب پائے جاتے ہیں، اور اگر بعض میں تراضی کے وہم کی گنجائش بھی ہے تو لا تقتلوا انفسکم کی دوسری اہم شرط مفقود ہے۔

(۲) جائز طریقوں سے جو دولت کمائی جائے اس کو جمع نہ کیا جائے، کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے، اور تقسیم دولت میں توازن برقرار نہیں رہتا۔ دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرنے والا نہ صرف خود بدترین اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ پوری جماعت کے خلاف ایک شدید جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ آخر کار خود اس کے لیے بھی برا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید بخل اور قارونیت کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ

جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ

مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ (۳: ۱۸۰) گمان نہ کریں کہ بخل ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے لیے بُرا ہے۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۹: ۵)۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر دیدو۔

یہ چیز سرمایہ داری کی بنیاد پر ضرب لگاتی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ جب سرمایہ داری کا دروازہ ہی بند کرنا مقصود ہے تو سود جو بخل اور جمع مال کا ثمرہ ہے، اسلام کے نظم معیشت میں کیسے بار پاسکتا ہے۔

(۳) جمع کرنے کے بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر خرچ کرنے سے اس کا یہ مقصد نہیں کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے، یعنی آپ کے پاس آپ کی اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے اس کو نیک اور مفید کاموں میں خرچ کردیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (۲: ۲۱۹) اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴: ۶) احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور ناداروں مسکینوں اور قرابتدار پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور اپنے لونڈی غلاموں پر۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۱) اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔

اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار سمجھتا ہے

کہ خرچ کرنے سے مفلس ہو جاؤں گا اور جمع کرنے سے مالدار بنوں گا۔ اسلام کہتا ہے خرچ کرنے سے برکت ہوگی تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ اور بڑھے گی۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا۔ (۲: ۲۶۸)

شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرم ناک بات کا حکم دیتا ہے مگر اللہ تم سے اپنی بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو خرچ کر دیا وہ کھو یا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمہاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲: ۲۷۰)

تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ لِیُوَفِّیَھُمْ اُجُوْرَھُمْ وَیَزِیْدَھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ (۳۵: ۳۰)۔

اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے اللہ ان کے بدل ان کو پورے پورے دیگا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ عنایت کرے گا۔

(باقی)

کتب علمیہ

سلسلہ تصنیف میں یہ ایک بیکل تماشا ہے کہ جو خاموشی کے ساتھ اردو زبان کی خدمت انجام دے رہا ہے اور جہاں اب تک مذاق عام یہ تھا کہ فن کی بات وہ عربی، فارسی اور انگریزی کتب اور ان کے تراجم لکھتے ہیں طلباء کے لیے درسی کتب کا بھی انتظام کیا گیا ہے یہ بڑی سہولت ہے کہ لوگوں کو بھی حسب فرمائش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جو مصنفین و مؤلفین حیدرآباد میں اپنی تصنیفات کی اشاعت اور ان کی فروخت کا معقول انتظام چاہتے ہیں وہ مہتمم کتب خانہ سے ذریعہ خط و کتابت جملہ امور کا تصفیہ فرما سکتے ہیں جو نادر و کمیاب اور مشہور و نامور شعراء و مصنفین کی تصانیف آپ کو کتب خانہ سے مل سکتی ہیں آج ہی ایک کارڈ لکھ کر

فہرست مفت **الک خواجہ بہاء الدین حسن مالک کتب خانہ علمیہ چار مینار حیدرآباد دکن** طلب فرمائے

قواعد

رسالہ **ترجمان القرآن** بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ طلب کر سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات وصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمت دیا جائے گا۔ جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے پتہ بدلنے کی اطلاع دفتر کو دے دینی چاہیے ورنہ پرچہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہو گی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ جو نمبر رجسٹر ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

شائع کرنے کے مضامین و قطعات طلب رسالہ تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی) (مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا مخزن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

الجہاد فی الاسلام

تالیف

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مختصر فہرست مضامین حسب ذیل ہے۔

اسلامی جہاد کی حقیقت۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظام تمدن میں روح جہاد کا کیا مرتبہ ہے۔

مدافعانہ جنگ۔ وہ اغراض جن کے لیے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔

مصلحانہ جنگ۔ اسلامی جنگ کے اصول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا مکمل جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں۔

اشاعت اسلام اور تلوار۔ دعوت و تبلیغ کے متعلق اسلامی تعلیم کی تشریح اور اس کی تحقیق کہ اسلام میں تلوار کا کیا حصہ ہے۔

قوانین جنگ۔ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہ ہائے جنگ اور ان میں اسلام کی اصلاحات۔

جنگ دوسرے مذاہب میں۔ جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بدھ مذہب، یہودیت اور عیسائیت کی تعلیم کی تشریح اور اسلام سے ان کا مقابلہ۔

جنگ اور تہذیب جدید۔ بین الاقوامی قانون جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون جنگ سے اس کا مقابلہ۔

ضخامت [illegible] صفحات، قیمت [illegible] ملنے کا پتہ

دفتر ترجمان القرآن [illegible]

فہرست مضامین

ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۴ھ جلد ۷ عدد ۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت میں ہمارے مضمون "حقوق الزوجین" کا سلسلہ ختم ہو رہا ہے۔ اس مضمون کو عنقریب ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا جائیگا، اور ہندوستان کے علماء، مدیران جرائد، ارکان مجالس تشریعی اور دوسرے اہل الرائے حضرات کے پاس بھیج کران سے استدعا کی جائے گی کہ جن امور کی طرف اس مضمون میں توجہ دلائی گئی ہے ان پر غور وخوض کر کے اپنی رائے کا اظہار کریں اس وقت حسن اتفاق سے مسلمانوں کو اپنی سوسائٹی کے مفاسد میں سے ایک مفسدہ کی طرف توجہ ہوگئی ہے، اور وہ اصلاح حال کے لیے سعی کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔ یہ ایسا موقع ہے جس سے فائدہ اٹھا کر کم ازکم ایک خرابی کا تو پورا پورا استیصال کیا جا سکتا ہے، اگر اس وقت ایک ناقص تدبیر کامیاب ہو کر ہمارے ارباب حل وعقد مطمئن ہوگئے، تو پھر برسوں کے لیے ان کا جوش عمل سرد ہو جائے گا، اور امید نہیں کہ کم ازکم اس قرن میں اصلاح کا کوئی دوسرا موقع بہم پہنچ سکے مسلمانان ہند کی نیند اور بیداری کا جو حال ہم مدتوں سے دیکھ رہے ہیں، اس سے ہم کو یہی سبق ملتا ہے کہ ان کی بیداری دو طویل خوابوں کے درمیان محض ایک کروٹ کی حد تک ہوا کرتی ہے۔ اگر کسی کو کچھ کام کرنا ہو تو بس اسی کروٹ کے دوران میں کر لے جس نے اس تھوڑے سے وقت کو کھو دیا، کچھ عجب نہیں کہ اسے پھر صور اسرافیل ہی کا انتظار کرنا پڑے۔

ہم کو اس مجلس مشاورت کے فیصلے کا انتظار تھا جو مراد آباد میں جمعیت علماء ہند کی جانب سے منعقد کی جانے والی تھی۔ اب اس کا نتیجہ بھی شائع ہو گیا۔ مسلسل اور پیہم سعی اور دو روزہ غور وخوض کے بعد علماء ہند کی مرکزی جمعیت نے بہت سے اکابر اہل علم واہل رائے کی مدد سے جو مسودۂ قانون مرتب کیا ہے اس کا ما حصل بس اتنا ہے کہ مسلمان عورتوں کو چند مسائل میں فقہ مالکی کے مطابق فسخ نکاح کا دعوی کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

اور بعض دوسرے مسائل میں فقہ حنفی کے مطابق فیصلہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دو تین صدیوں کے مسلسل اخلاقی، دینی اور تمدنی انحطاط، اور ایک غیر مسلم حکومت کے استیلا کی بدولت اسلامی تمدن و تہذیب کے ضعف اور اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اضمحلال اور اسلامی قوانین کے عدم انفاذ سے جو خرابیاں ہماری معاشرت میں پیدا ہو گئی ہیں، ان کی کما حقہ تحقیق و تفتیش کرنے اور موجودہ حالات میں قانون سازی کے جو محدود ذرائع ہم کو حاصل ہیں ان سے تا بحد امکان فائدہ اٹھا کر اصلاح احوال کی تدبیریں معلوم کرنے کے لیے اگر صرف "دو روزہ غور و خوض" ہی کو کافی سمجھا جاتا ہے، اور اسی کا نام "مسلسل پیہم سعی" ہے تو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے ارباب حل و عقد کے ذہن میں سرے سے ان ذمہ داریوں کا ہی کوئی صحیح تصور موجود نہیں ہے جو اولی الامر ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔

جمعیت کے مسودہ میں تجویز کیا گیا ہے کہ حسب ذیل مسائل کا فیصلہ فقہ مالکی کے مطابق کیا جائے:

(۱) شوہر کا مفقود الخبر ہونا۔

(۲) اس کا جنون یا جذام یا برص میں مبتلا ہونا جب کہ یہ امراض سخت قسم کے ہوں۔

(۳) اس کا نفقہ نہ دینا یا دینے پر قادر نہ ہونا۔

(۴) اس کا ناقابل برداشت ظلم کرنا۔

(۵) اس کی مفقود الخبری یا طویل قید یا تعنت کی وجہ سے عورت کی عصمت خطرے میں ہونا۔

ان مختصر دفعات میں فقہ مالکی کے احکام کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ عدالتوں کے پاس مالکی فقہ کی تفصیلات معلوم کرنے کا کیا ذریعہ ہے؟ مسلمان حکام میں سے کتنے ایسے ہیں جو مالکی مذہب کے مبسوطات پر نظر رکھتے ہیں یا ان کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں؟ وکلا، جن کا کام فریقین کے مقدمہ کو قانونی صورت میں پیش کرنا ہے اور جن میں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی سب شامل ہیں، مالکیہ کے احکام معلوم کرنے کا کونسا ذریعہ رکھتے ہیں؟ ان سب کو چھوڑیے، ہندوستان کے علماء میں سے کتنے ایسے ملیں گے جن کو مذہب مالکی کے جزئیات پر عبور حاصل ہے؟ ایسی صورت میں

کیا اس مختصر دفعہ کا نتیجہ یہ نہ ہوگا کہ احکام سے ناواقفیت اور ان کی غلط تعبیرات، اور غلط الفاظ سے پھر ایک غلط قانون بن جائیگا اور پھر ساٹھ ستر سال کے تلخ تجربات کے بعد ایک دوسرا مسودہ قانون مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی جائیگی۔

اختصار پسندی کی انتہا یہ ہے کہ "طویل قید" کو بنائے فسخ نکاح قرار دیا جاتا ہے، مگر اس کی تشریح نہیں کی جاتی کہ طویل قید سے مراد کیا ہے؟ حبس دوام یا دس سال یا پانچ سال یا کچھ اور؟ خود مالکی مذہب کے احکام میں بھی اس کی کوئی تشریح ہماری نظر سے نہیں گذری، بلکہ مالکی مذہب میں تو سرے سے "طویل قید" کو وجہ فسخ ہی قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اگر وجہ فسخ محض عصمت کا خطرے میں ہونا قرار دیا جائے تو ایک عورت چھ مہینے یا تین مہینے کی قید پر یہ دعوی کرسکتی ہے کہ میری عصمت خطرے میں ہے، لہذا نکاح فسخ کیا جائے؟

نمبر ۴ میں "ناقابل برداشت ظلم" کے الفاظ بالکل مبہم ہیں اور ان کی کوئی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ شوہر کی بعض عادات ایسی ہوتی ہیں جو عورت کے لیے ناقابل برداشت روحانی عذاب بن جاتی ہیں، مثلاً کثرت شراب نوشی، قماربازی، زناکاری وغیرہ۔ یہ چیزیں عام اصطلاح کی رو سے "ظلم" کی تعریف میں نہیں آتیں، اس لیے ان کی تصریح اس دفعہ میں ہونی چاہیے تھی یا ان کو ایک الگ دفعہ میں داخل کرنا چاہیے تھا۔ قدیم فقہ میں ان کو موجبات تفریق میں اس لیے شمار نہیں کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی تعزیرات کی رو سے جرائم مستلزم سزا تھے، مگر آج کل کی تعزیرات میں ان افعال کی روک تھام کے لیے کوئی انتظام نہیں ہے، اور ان کا شیوع عام ہے، اس لیے ان کو موجبات تفریق میں داخل ہونا چاہیے۔

خطرناک امراض میں سے صرف جذام، برص اور جنون کو لیا گیا ہے اور ان کے سوا دوسرے تمام خطرناک امراض کو چھوڑ دیا گیا ہے، حالانکہ وہ نفرت انگیز اور ضرر رساں ہونے میں کسی طرح ان تینوں بیماریوں سے کم نہیں ہیں۔ اس کی وجہ اگر محض یہ ہے کہ فقہ مالکی میں دوسرے امراض کی تصریح نہیں ہے تو ہم اس کو تقلید جامد کہیں گے، اس کا نام تفقہ نہیں ہے۔ اگر یہ تینوں امراض بذات خود وجہ فسخ ہیں تو اس کے لیے کوئی نص قطعی ہونی چاہیے، اور اگر ان کے وجہ فسخ ہونے کی علت موجب ضرر شدید ہونا ہے، تو جن جن امراض میں یہ علت پائی جائے ان سب کو اس فہرست میں شامل ہونا چاہیے۔ آخر دق، سل، آتشک، سوزاک، دمہ، ہپنس، ابنہ، عذیوط اور بعض دوسرے امراض کس حیثیت سے جذام اور

برس کے مقابلہ میں کم خطرناک اور موجب اذیت روحانی وجسمانی ہونے میں کم تر سمجھے جا سکتے ہیں ؟

حسب ذیل مسائل کے متعلق تجویز کیا گیا ہے کہ ان کا فیصلہ فقہ حنفی کے مطابق کیا جائے۔

(۱) خیار بلوغ۔

(۲) نکاح فاسد منعقد ہونا یا بعد میں کسی وجہ سے فاسد ہو جانا۔

(۳) شوہر کا عنین یا مجبوب ہونا۔

(۴) کوئی اور وجہ جو بروئے فقہ حنفی فسخ نکاح کے لیے کافی ہو۔

ان دفعات کے اختصار کو دیکھ کر اور بھی زیادہ حیرت ہوتی ہے۔ ایک جدید مسودۂ قانون مرتب کرنے کی ضرورت ہی اس وجہ سے پیش آئی تھی کہ انگریزی عدالتوں میں جو محمڈن لا رائج ہے اس میں مفسدات نکاح اور وجوہ فسخ نکاح کی پوری اور صحیح تفصیل موجود نہیں ہے ایسی حالت میں فقرہ نمبر (۲) اور فقرہ نمبر (۴) سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟ نتیجہ پھر بھی وہی ہوگا کہ محمڈن لا کی کتابوں اور عدالتہائے عالیہ کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جائیگا اور وکلا اپنے اپنے منشاء کے مطابق حضرات علماء سے بالکل متضاد فتوے حاصل کرکے عدالتوں میں قانون اسلام کا مذاق اڑواتے رہیں گے۔

اس مسودے کی ترتیب میں جو روش اختیار کی گئی ہے اس کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء دین کو یا تو ان ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہے جو مسلمانوں کے اولی الامر ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں، یا وہ ان کو جاننے کے باوجود انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم بار بار کہہ چکے ہیں اولی الامر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ فقہ کی قدیم کتابوں سے جزئیات نقل کر دیا کریں، بلکہ ان کا اصلی کام یہ ہے کہ شریعت کے اصول کو سمجھ کر اور احکام خدا و رسول کے مقاصد و مصالح پر نظر رکھ کر اپنے زمانے کی ضرورتوں کے مطابق پچھلے قوانین میں ترمیم و اصلاح کرتے رہیں، اور حسب ضرورت نئے قوانین بھی وضع کریں۔ سوسائٹی کی حالت ہر زمانے میں یکساں نہیں رہتی، اخلاقی، دینی، اجتماعی، معاشی اور سیاسی حالات میں ہمیشہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے اور

ان تغیرات سے نئی نئی قانونی ضرورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اگر قانون تغیرات کے ساتھ ساتھ حرکت نہ کرے اور نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا نہ کرسکے، تو بہت جلدی وہ زائد المیعاد ہو جائیگا۔ اسی غرض کے لیے شارع نے اولی الامر کو قانون سازی کے اختیارات دیے ہیں تاکہ زمانے کے متغیر حالات میں اسلامی جماعت کو اصول شریعت کا پابند رکھنے اور ان کی اجتماعی و انفرادی زندگی کو مقاصد شریعت کے مطابق منظم کرنے کے لیے جیسے جیسے قوانین کی ضرورت ہو، ان کو وہ باہمی مشورے سے وضع کرتے رہیں۔ ابتدائے اسلام کے اولی الامر نے ان اختیارات سے فائدہ اٹھایا اور اپنے زمانے میں جن قوانین کی ضرورت محسوس کی، ان کو اپنے اجتہاد سے کام لے کر وضع کیا۔ وہ اس کے لیے مکلف نہ تھے اور نہ ان کے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ تھا کہ ہزار برس بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے، اور اسلامی تہذیب کا سارا نظام مضمحل ہو جانے اور ایک نئے تمدن کے چھا جانے سے مسلم سوسائٹی کی کیا حالت ہوگی، اور اس حالت میں مقاصد شریعت کے مطابق مسلمانوں کے معاملات کی تنظیم اور ان کے دین و اخلاق کی حفاظت کیلئے کن قانونی تدابیر کی ضرورت ہوگی۔ ایسے حالات کے لیے قوانین بنانا ان کا کام نہ تھا، نہ وہ بنا سکتے تھے۔ یہ کام اس زمانے کے اولی الامر کا ہے اور انہی پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر اس وقت نا کافی قوانین کی وجہ سے مسلمانوں کے معاملات خراب ہوں، اور ان میں اخلاقی مفاسد پھیلیں اور ان کے درمیان ظلم و جور کی اشاعت ہو، تو اس پر بارہ سو برس پہلے کے اولی الامر خدا کے سامنے جواب دہ نہ ہونگے، بلکہ اسی زمانے کے اولی الامر ذمہ دار ہونگے۔

قوانین فقہی میں اصلاح و ترمیم اور جدید قانون سازی کی ضرورت اتنی بیّن ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب سے دو سو برس پہلے تک جو تمدنی حالت دنیا میں تھی، اس میں ایک مفقود الخبر شخص کی جستجو کرنا بہت مشکل تھا اور برسوں و برس کی تلاش بھی کافی نہ تھی، مگر آج ریل، تار، اخبارات اور بین الاقوامی تعلقات کی آسانیوں نے حالات بالکل بدل دیے ہیں۔ اب چند ہفتوں میں اس امر کا ظن غالب حاصل ہو سکتا ہے کہ مفقود یا تو مر گیا ہے یا شرارت سے اس نے اپنی شخصیت کو قصداً چھپا دیا ہے۔

قدیم فقہی کتابوں میں مفقود دار الشرک اور مفقود دار الاسلام کے احکام الگ الگ بیان کیے گئے ہیں، اگر

اس پرانی بین الاقوامی تقسیم کے مطابق قانون نافذ کیا جائے تو مسلمانوں کو سخت دقتیں پیش آئیں گی لا محالہ ہم کو دنیا
نعقود الخبر کی حد تک قانون کی تعبیر اس طرح کرنی پڑے گی کہ ہر وہ شخص معقود دارالاسلام کے حکم میں ہے جو مہندیا
میں کہیں ہو، خواہ وہ امریکہ، جاپان اور جرمنی میں ہو، یا ٹرکی مصر اور عراق میں۔

فقہائے متقدمین نے لعان سے انکار کرنے والے مرد کے لیے حد قذف یا حبس کی سزا تجویز کی تھی اسی طرح لعان سے انکار کرنے والی عورت کے لیے وہ حد زنا یا حبس تجویز کرتے تھے۔ مگر آج ہندوستان میں یہ ممکن نہیں لا محالہ ہم کو فریقین کے حقوق کی حفاظت کے لیے دوسری قانونی تدبیریں تجویز کرنی پڑینگی جنکو موجودہ حالات میں روبعمل لایا جاسکتا ہو۔

قدیم زمانے میں عام طور پر مسلم سوسائٹی اور خصوصاً مسلمان عورتوں کا معیار اخلاق بہت بلند تھا۔ اسلامی تعلیمات ان کے رگ و پے میں راسخ تھیں اسلامی حکومت موجود تھی۔ اسلام کے تعزیری اور اصلاحی قوانین نافذ تھے۔ اخلاق عامہ کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات تھے۔ اُس زمانے کے فقہا، ان حالات کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے جو اس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت، مغربی تمدن، غیر مسلم اکثریت، جدید علوم اور ادبیات کی اشاعت اور طریق تربیت کی خرابیوں سے پیدا ہوگئے ہیں۔ اُنہوں نے فسخ و تفریق کے لیے جو قوانین بنائے تھے وہ اُس زمانہ کی اجتماعی حالت کے لیے مناسب ہو سکتے تھے مگر آج مسلمانوں کی معاشرت کو مقاصد شریعت کے مطابق پاکیزگی کے کم سے کم معیار پر قائم رکھنے کے لیے بھی وہ قوانین کافی نہیں ہیں۔ اس زمانے کے اولی الامر کا فرض یہ ہے کہ وہ اس وقت کی مسلم سوسائٹی کے حالات کو دیکھیں جو خرابیاں عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں ان کے اسباب کی تحقیق کریں، اور ان کی اصلاح کے لیے ایسی قانونی تدبیریں اختیار کریں جو موجودہ طرز حکومت کے ماتحت اختیار کی جاسکتی ہیں۔ ان حالات کیلیے جزئی قوانین وضع کرنا ۱۲ اسو برس پہلے کے فقہار کا فرض نہ تھا، وہ علیم بالغیب نہ تھے کہ ان پر قیامت تک کے تغیرات احوال روشن ہوتے نہ وہ خداوند علیم و حکیم کی سی بصیرت رکھتے تھے کہ قرآنی احکام کی طرح جامع احکام وضع کرسکتے۔ اگر اس زمانے کے ہندوستانی اولی الامر صرف اُنہی جزئیات پر انحصار کریں گے جو ہزار بارہ سو برس پہلے کے فقہا وضع کر گئے ہیں تو وہ اپنے فرض سے ہرگز سبکدوش نہ ہوسکیں گے۔

عموماً ہمارے علماء اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ خدا و رسول کے احکام اور ائمہ مجتہدین کے اجتہادات میں فرق نہیں کرتے

وہ ان دونوں کے مجموعے کا نام "شریعت" رکھتے ہیں، اور اس مجموعی "شریعت" کو دائمی، اور ناقابل بحث وتنقید اور ناقابل ترمیم و اضافہ قرار دیتے ہیں۔ جہاں کسی نے فقہی مسائل پر تنقید کی، یا ان میں حذف و اضافہ کی ضرورت ظاہر کی، اور انہوں نے یہ کہکر ان کا منہ بند کر دیا کہ "شریعت" ایک دائمی قانون ہے، اس میں قیامت تک نہ ترمیم ہو سکتی ہے، نہ کوئی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ دراصل شریعت کا اطلاق صرف قرآن مجید کے احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل پر ہوتا ہے۔ یہی چیز دائمی ہے اور بلاشبہ اس میں ترمیم و اصلاح کی قیامت تک ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ الٰہی علم و بصیرت پر مبنی ہے، اور زمان و مکان کے جملہ تغیرات میں یکساں قابل عمل ہے لیکن اس شریعت کے اصول سے جو اجتہادی احکام ائمہ سلف نے مستنبط کئے ہیں وہ شریعت نہیں ہیں، بلکہ اصطلاحی زبان میں "قوانین" ہیں، ان کے متعلق یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں کہ وہ بھی شریعت کی طرح دائمی اور ناقابل حذف و اضافہ ہیں۔ یہ گمان کرنے کے لیے کوئی بنیاد اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ معاذ اللہ ائمہ مجتہدین کو علم کے اعتبار سے خدا یا رسول خدا کا ہم پلہ سمجھا جائے، اور جب یہ غلط ہے تو ان کے وضع کیے ہوئے قوانین کو تنقید سے بالاتر قرار دینا اور ان پر اضافہ کو غیر ممکن سمجھنا بھی غلط ہے۔

علمائے کرام سو برس سے اسی غلطی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ تغیر پذیر زمانے کی ہر ضرورت کے موقع پر جب کبھی مسلمانوں نے اجتہادی احکام میں ترمیم و اضافہ کی درخواست کی، علماء نے ان کو یہی کہہ کر خاموش کر دیا کہ یہ اللہ کی دائمی شریعت ہے، اول اول مسلمان "شریعت" کا نام سن کر دم بخود رہ گئے، مگر تلخ حقائق کی یہ وسیع دنیا جو حجروں اور خانقاہوں سے باہر آباد ہے، اپنے نت نئے مطالبات سے کب تک باز رہ سکتی تھی، رفتہ رفتہ مسلمانوں میں یہ غلط خیال پیدا ہو گیا کہ وہ قانون جو اپنی نمایاں کوتاہیوں کے باوجود اپنے نمایندوں کی زبان سے غیر تغیر پذیر ہونے کا دعویٰ کر رہا ہے اسی کا نام شریعت ہے، چنانچہ وہ پوری شریعت کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے پر آمادہ ہو گئے، کیونکہ احکام خدا و رسول اور اجتہادات ائمہ کے درمیان اصولی فرق و امتیاز سے وہ بیگانہ تھے، اور علماء نے ان کو اور بھی زیادہ بیگانہ کر دیا تھا۔ ترکی میں یہ ہو چکا، ایران میں ہو رہا ہے، افغانستان بھی عنقریب اسی راستہ پر جاتا نظر آتا ہے۔ اب اگر ہماری قومی کشتی کے کھیون ہاروں کا یہی حال ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں تو ہندوستان کا بھی خدا ہی حافظ ہے۔

مقالات

حقوق الزوجین

(۶)

عیوب میں خیار فسخ | عیوب زوجین کے مسئلہ میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ عورت اور مرد کے کسی عیب کی بنا پر دوسرے فریق کو خیار فسخ نہیں ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے ولا یتخیر احد الزوجین بعیب الاخر ولو فاحشا کجنون و جذام و برص و رتق و قرن (یعنی میاں اور بیوی میں سے کسی کو بھی دوسرے کے کسی عیب پر فسخ نکاح کا اختیار نہیں، خواہ وہ عیب کیسا ہی سخت ہو، مثلاً جنون، جذام، برص، رتق اور قرن) صحابہ میں سے حضرت علی اور ابن مسعودؓ اور ائمہ مجتہدین میں سے عطاء، نخعی، عمر ابن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، اوزاعی، ثوری، ابو حنیفہ اور ابو یوسف رضی اللہ عنہم کا یہی مذہب ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ تمام ایسے عیوب جو مانع تعلقات زن و شوہر ہوں، ان میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے، مثلاً جنون، جذام، برص، گندہ دہنی، امراض خبیثہ اور شرمگاہ کے ایسے عوارض جو مانع قربت ہوں۔ یہ امام مالک کا مذہب ہے، چنانچہ ابن جزی نے القوانین میں عیوب مذکورۂ بالا کی تفصیل بیان کرنے کے بعد تصریح کی ہے کہ اذا کان فی احد الزوجین احد العیوب کان للاخر الخیار فی البقاء معہ والفراق۔

امام شافعی کے نزدیک جنون، جذام اور برص میں عورت اور مرد دونوں کو خیار فسخ ہے

مگر قروح سیالہ فرج مثلاً آتشک وغیرہ، اور گندہ دہنی اور خارشت میں خیار نہیں ہے۔ البتہ اگر عورت امام نہانی کے ایسے امراض میں مبتلا ہو جو مانع مباشرت ہوں یا مرد عنین یا مقطوع الذکر ہو تو اس صورت میں فریق ثانی کو خیار فسخ ہے۔

امام محمدؒ کے نزدیک شوہر کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ نہیں ہے۔ مگر عورت کو شوہر کے جنون اور جذام اور برص میں خیار فسخ ہے۔

ان تمام مذاہب میں سے دوسرا مذہب قرآن مجید کی تعلیم سے اقرب ہے۔ قرآن کی رو سے عورت اور مرد کے ازدواجی تعلق میں دو چیزوں کو مقصدی اہمیت حاصل ہے۔ ایک تحفظ اخلاق دوسرے زوجین کی باہمی مودت و رحمت۔ یہ دونوں مقصد ایسے عیوب میں فوت ہو جاتے ہیں جن سے زوجین طبعاً ایک دوسرے سے نفرت کرنے پر مجبور ہوں، یا ایک دوسرے کی طبیعی خواہشات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔ پھر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، یہ بات اسلامی قانون ازدواج کے اہم میں سے ہے کہ ازدواجی تعلق زوجین کے لیے مضرت اور حدود اللہ سے تجاوز کا موجب نہ ہونا چاہیے۔ یہ قاعدہ بھی ان عیوب میں خیار فسخ نہ رکھنے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تمام امراض جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ضرر پہنچانے والے ہیں اور ان سے اس امر کا بھی خوف ہے کہ زوجین میں سے کوئی ایک نفرت کی وجہ سے یا اپنی طبعی خواہشات پوری نہ ہونے کی وجہ سے حدود اللہ کو توڑ دیگا اس لئے ضروری ہے کہ ان تمام عیوب میں زوجین کے لیے خیار فسخ رکھا جائے۔

یہ تو اُس صورت میں ہے جبکہ نکاح سے پہلے زوجین کو ایک دوسرے کے حال کی خبر نہ ہو ا بعد میں علم ہوتے ہی اس پر نارضامندی کا اظہار کر دیں۔ رہی یہ صورت کہ زوجین کو نکاح سے پہلے ایک دوسرے کا حال معلوم تھا اور انہوں نے جان بوجھ کر نکاح کر لیا، یا ان کو معلوم تو نہ تھا، مگر علم ہونے پر انہوں نے خیار فسخ استعمال نہ کیا، یا نکاح کے بعد عیب پیدا ہوا، تو ان تمام صورتوں میں مرد کے

پاس تو ایک چارۂ کار ایسا موجود ہے جس سے وہ ہر وقت کام لے سکتا ہے، یعنی طلاق۔ اور اس کے علاوہ دوسرا چارۂ کار بھی اس کے پاس موجود ہے، یعنی دوسری شادی کر لینا مگر عورت کے لیے بعض صورتوں میں فقہاء نے کوئی چارۂ کار تجویز نہیں کیا ہے اور بعض صورتوں میں کسی نے اس کی خلاصی کی تدبیر نکالی ہے اور کسی نے نہیں نکالی۔ اس باب میں جو خرابیاں ہیں۔ اُن کو ہم علیحدہ علیحدہ بیان کر کے ان پر بحث کریں گے

عنین و مجبوب وغیرہ اگر شوہر مجبوب (مقطوع الذکر) ہو تو اس بات پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عورت کو تفریق کا دعوٰی کرنے کا حق ہے، اور تحقیق حال کے بعد فی الفور تفریق کرا دی جائیگی۔

اگر شوہر نامرد ہو اور عورت تفریق کا مطالبہ کرے، تو حضرت عمرؓ کے فیصلہ کی بنا پر اسے ایک سال تک علاج کی مہلت دیجائیگی۔ اس کے بعد بھی اگر وہ قادر نہ ہو تو تفریق کرا دیجائیگی لیکن اسکے ساتھ فقہاء نے حسب ذیل شرطیں لگائی ہیں

(۱) عورت کو پہلے سے اس کے عنین کا علم نہ ہو۔ اگر اس کو علم تھا اور اس نے برضا و رغبت اس سے نکاح کیا تو اسے تفریق کے مطالبہ کا حق نہیں۔

(۲) اگر عورت کو پہلے علم نہ تھا، مگر بعد میں علم ہونے کے بعد اس نے اس کے نکاح میں رہنے پر رضامندی کی تصریح کر دی تب بھی اس کو مطالبۂ تفریق کا حق باقی نہیں رہا۔

(۳) مرد ایک مرتبہ بھی مباشرت پر قادر نہ ہوا ہو۔ اگر اس نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تب بھی عورت تفریق کا حق نہیں رکھتی۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں شرطیں درست نہیں ہیں۔ اگر کسی عورت نے قصداً اپنی حماقت سے کسی شخص کو عنین جانتے ہوئے اس سے نکاح کر لیا، تو اس کی یہ سزا معقول اور مناسب نہیں ہے کہ اس کو تمام عمر ایک نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ اس کے مفاسد اس قدر بین ہیں کہ بیان کی حاجت نہیں۔ ایسی نادان عورت کے لیے بس اسی قدر سزا کافی ہے کہ اسے مہر سے محروم کر کے تفریق کرا دی جائے۔

اگر عورت کو نکاح کے بعد شوہر کے نامرد ہونے کا علم ہوا اور اس نے ابتدائً ا
ساتھ رہنے پر اپنی رضامندی کی تصریح کردی، تو یہ کوئی ایسا قصور نہیں ہے جس کی بنا پر ا
تمام عمر مصیبت کی زندگی گذارنے پر مجبور کیا جائے۔ ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتدا میں ان
تکلیفوں کا اندازہ نہیں کرسکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی
طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہے، میں اسی طرح اس کے ساتھ زند
بسر کرلوں گی۔ مگر بعد میں اس کو وہ ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں جن کا اسے پہلے
نہ تھا، اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو
کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار د
زبان کپڑ لی جائے اور اس سے کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو
کر مرجا، یا آبرو باختہ بن کر زندگی گذار؟ جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، یہ بات قرآن
تعلیم کے خلاف ہے، اور اس سے ایسے نقصانات پیدا ہونے کا امکان ہے جو اس عو
کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں گے بلکہ سوسائٹی میں پھیلیں گے اور نسلوں تک منتقل ہو
اتنے بڑے نقصان کو گوارا کرنے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ایک شخص کے نقصان کو گوارا
درآں حالیکہ حقیقۃً تفریق میں اس کا کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی
اس غلطی کی اس عورت کو دی جاسکتی ہے تو وہ بس یہی ہے کہ اسے کل یا جزو مہر سے محروم کر

تیسری شرط بھی ہمارے خیال میں بہت سخت ہے۔ نکاح سے شریعت کا جو مقص
وہ اس قسم کے ازدواجی تعلق سے ہرگز پورا نہیں ہوتا۔ اسلام کا قانون کسی آسمانی مخلوق
لیے نہیں ہے، بلکہ عام انسانوں کے لیے ہے۔ اور عام انسانوں میں جو عورتیں پائی جاتی
کے لیے اگر یہ ناممکن نہیں تو غایت درجہ دشوار ضرور ہے کہ ایک یا چند مرتبہ شوہر کی صحبت

متمتع ہوجانا ان کے لیے کافی ہو، اور اس کے بعد مدت العمر اس سے محروم رہ کر وہ ہنسی خوشی گذار دیں اور اپنی عصمت کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھیں۔ بالفرض اگر پچاس فی صدی عورتیں بھی اس پر قادر ہوں، تو ان بقیہ پچاس فی صدی عورتوں کا حشر ہوگا جن کے ضبط و تحمل اور پاکیزگی اخلاق کا مرتبہ اتنا بلند نہیں ہے؟ کیا ان کے مبتلائے معصیت ہونے اور سوسائٹی میں ان کی وجہ سے طرح طرح کے مفاسد پھیلنے کی ذمہ داری اُس قانون پر نہ ہوگی جس نے ان کے لیے حلال کے دروازے بند کرکے انھیں حرام کے راستوں پر چلنے کے لئے مجبور کر دیا؟ پس ہماری رائے میں عنّت کی ہر شکایت پر، خواہ وہ نکاح سے پہلے کی ہو یا بعد میں حادث ہوی ہو، عورت کو عدالت کی طرف رجوع کرنے کا حق ہونا چاہیے، اور اگر کافی علاج کے بعد جس کے لیے ایک سال کی مدت مناسب ہے، یہ شکایت دور نہ ہو تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہائے کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایک سال تک علاج کرانے کے بعد شوہر نے ایک مرتبہ بھی مباشرت کر لی، خواہ وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہو، تو عورت کا حق تفریق ہمیشہ کے لیے باطل ہوجائے گا۔ یہاں پھر بیجا شدت پائی جاتی ہے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس معاملہ میں ماہرین طب کی رائے پر اعتماد کیا جائے۔ اگر علاج کے بعد بھی ماہرین کی رائے یہ ہو کہ مریض، وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کے لیے پوری طرح اہل نہیں ہو سکا ہے تو تفریق کرا دینی چاہیے۔

فقہائے نے خصی کے لیے وہی قانون رکھا ہے جو عنین کے لیے رکھا گیا ہے، یعنی اس کو بھی علاج کے لیے ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس کے مباشرت پر قادر ہونے کی امید کی جاسکتی ہے (کمافی الهدایہ) لیکن طبی تحقیقات سے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اس معاملہ میں خصی اور مجبوب کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ مرد خواہ مقطوع الذکر ہو یا مقطوع الانثیین، دونوں صورتوں میں وظیفۂ زوجیت کے لیے وہ یکساں نااہل ہوتا ہے،

اور کوئی علاج اس کی کھوئی ہوئی اہلیت کو واپس نہیں لا سکتا۔ لہذا خصی اور مجبوب کے حق میں ا
ہی قانون ہونا چاہیئے۔

جنون | مجنون کے بارے میں حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے علاج کے لیے ایک سال کی مد
مقرر کی جائے، اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو اس کی عورت اس سے جدا کر دی جا
فقہا نے اسی فیصلہ کو لیا ہے، اور مختلف طریقوں سے جزئیات میں اس حکم کو جاری کیا ہے۔ ا
ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ حکم صرف اس مجنون کے لیے ہے جو نکاح سے قبل مجنون تھا او
کے بعد ہم بستری پر قادر نہ ہوا۔ اس لحاظ سے گویا وہ عنین ہے اور اسی لیے اس کو ایک سال
مہلت دی جاتی ہے۔ امام محمد رحمۃ اللہ کی رائے میں جنون اگر حادث ہو تو اس کو علاج کے
ایک سال کی مہلت دی جائے گی۔ اور اگر مطبق ہو تو وہ مجبوب کے حکم میں ہے۔ بلا تاجیل تفریق کرا
جائے گی۔ امام مالک رضی اللہ عنہ کے نزدیک حادث اور مطبق دونوں میں ایک سال کی مہلہ
بغرض علاج دی جائے گی۔ اور اگر اس مدت میں وہ درست نہ ہو تو تفریق کرا دی جائے گی لیکن
اس کے ساتھ فقہائے مالکیہ حسب ذیل شرطیں لگاتے ہیں:۔

(۱) اگر نکاح سے پہلے وہ مجنون تھا اور عورت نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا ت
تفریق کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔

(۲) اگر نکاح کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ مجنون ہے اور اس نے بصراحت اس کے س
رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی تب بھی تفریق کا حق باقی نہ رہا

(۳) اگر جنون نکاح کے بعد پیدا ہوا ہو تو عورت صرف اس صورت میں تفریق کا م
کر سکتی ہے کہ جنون پیدا ہونے کے بعد اس نے اس کے ساتھ رہنے پر رضامندی کی تصر
نہ کی ہو۔ اور اپنے اختیار و رضامندی سے اس کو مباشرت یا دواعی مباشرت کا موقع نہ دیا

یہ شرطیں اسی نوعیت کی ہیں جن کا ذکر عنین کے باب میں گذر چکا ہے اور ان پر بھی ہم کو وہی اعتراض ہے۔ شریعت تمدن اور اخلاق کے مقاصد ایسی صورت میں کبھی پورے نہیں ہوسکتے کہ کسی عورت کو ایک پاگل شخص کے ساتھ زبردستی باندھ رکھا جائے۔ اگر اس نے جان بوجھ کر اس سے نکاح کیا تو اس کے لیے یہ سزا کافی ہے کہ اس کو مہر سے محروم کردیا جائے۔ اگر نکاح ہوجانے کے بعد اسے جنون کا علم ہوا اور اس نے ابتداءً اس پاگل کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ارادہ ظاہر کردیا لیکن بعد میں اس کے لیے روحانی وجسمانی تکلیفیں ناقابل برداشت ہوگئیں تو درحقیقت اس نے کوئی ایسا جرم ہی نہیں کیا جس کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ تمام عمر وہ ایک پاگل کے ساتھ رنج، تکلیف اور خطرات سے بھری ہوئی زندگی گذارنے پر مجبور کی جائے۔ اگر نکاح کے بعد جنون پیدا ہوا اور ابتدائی حالت جنون میں عورت نے وفاداری اور رفاقت کے شریفانہ جذبات کی بنا پر اس کو چھوڑنا پسند نہ کیا اور حتی الامکان اس کی خدمت کی، اور سابق کا سا تعلق زن وشوہری اس کے ساتھ رکھنا گوارا کرلیا تو اس سے یہ کیوں لازم آجائے کہ جب اس کا پاگل پن اس بیچاری کے لیے ناقابل برداشت ہوچکا ہو اس وقت بھی اس کو رہائی دلانے سے انکار کردیا جائے؟ کیا یہ قید لگانے سے قانون کا منشا یہ ہے کہ جونہی کسی عورت کے شوہر میں آثار جنون پیدا ہوں وہ فوراً اس کی تمام پچھلی محبتیں اور رفاقتیں فراموش کرکے اس کے ساتھ بے وفائی اختیار کرلے اور اس کو چھوڑ کر چلی جائے، اس خوف سے کہ اگر بعد میں اس جنون نے مستقل ناقابل برداشت صورت اختیار کرلی تو اس وقت کی وفاداری و رفاقت بلائے جان ثابت ہوگی اور اس کا بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا؟

اس قسم کی شرطیں عائد کرنے میں عورتوں کے ساتھ بہت سختی کی گئی ہے۔ عورت اگر بیمار ہے یا جنون میں مبتلا ہو یا کسی نفرت انگیز یا مضرت رساں مرض میں مبتلا ہو تو مرد اسے

طلاق دے سکتا ہے۔ یا دوسری شادی کرکے اپنی زندگی خوشگوار طریقہ سے بسر کرسکتا ہے لیکن مردان حالات میں سے کسی حالت میں مبتلا ہو تو عورت : تو اسے طلاق دے سکتی ہے، نہ اس کی موجودگی میں دوسری شادی کرسکتی ہے۔ اس کے لیے بجز تفریق کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ اب اگر اس ایک چارۂ کار پر بھی ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے اکثر و بیشتر حالات میں اس کے لیے مخلصی کی کوئی صورت باقی ہی نہ رہے تو یہ اس عدل اور توازن کے خلاف ہوگا جو اسلامی قانون کی خصوصیات میں سے ہے۔ ایسے تمام معاملات میں قرآن مجید کی وہ آیات ہمارے لیے دلیل راہ ہونی چاہئیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ نکاح میں معاشرت بالمعروف ہونی چاہیے، عورت کو مرد کے نکاح میں رکھا جائے تو اس طرح کہ اس میں ضرار اور تعدی نہ ہو، اور حدود اللہ ٹوٹنے کا خوف نہ ہو۔ اگر کسی ازدواجی تعلق میں یہ لازمی شرطیں پوری نہ ہوں تو تسریح باحسان کے قاعدہ پر عمل ہونا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک پاگل، یا آتشک زدہ، یا جذامی، یا مبروص شوہر کے ساتھ بجبر و اکراہ بندھے رہنے سے بڑھ کر کسی عورت کے لیے ضرار اور تعدی کی کوئی دوسری صورت بھی ہوسکتی ہے؟ اور کون نہیں سمجھ سکتا کہ جو عورت اس حالت میں بجبر رکھی گئی ہو اس کے لیے حدود اللہ سے تجاوز کرنے کے کس قدر مواقع عملی زندگی میں پیدا ہوسکتے ہیں، اور ان مواقع سے بچنا ایک اوسط درجہ کی عورت کے لیے کس قدر دشوار ہے؟

مفقود الخبر مفقود الخبر کے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح حکم نہیں ہے۔ احادیث میں بھی کوئی معتبر حکم نہیں۔ دارقطنی نے اپنی سنن میں ایک حدیث نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:-

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرأۃ المفقود امرأتہ حتی یاتیھا البیان۔ حضور نے فرمایا کہ مفقود کی بیوی اسی کی بیوی ہے جب تک کہ اس کا حال معلوم نہ ہو جائے۔

لیکن یہ حدیث سوار بن مصعب اور محمد بن شرجیل ہمدانی کے واسطہ سے پہنچی ہے جو

مجروح ہیں۔ ابن شرحبیل کے متعلق ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ انہ یروی عن المغیرۃ مناکیر اباطیل۔ اور سوار بن مصعب کے متعلق ابن القطان نے لکھا ہے کہ وہ متروکین میں ابن شرحبیل سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یہ حدیث ضعیف ناقابل احتجاج ہے۔ علاوہ بریں مفقود کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ جیسے اکابر صحابہ کی آراء میں جو اختلاف ہوا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ان حضرات میں سے کسی کو اس حدیث کا علم نہ تھا، اور نہ ان کے عہد میں کسی صحابی کو اس کی خبر تھی، کیونکہ اگر صحابہ میں سے کوئی بھی اس حدیث سے واقف ہوتا تو وہ ان حضرات کے سامنے اسے پیش کر کے اختلاف کو ختم کر دیتا۔ محمدؐ بن شرحبیل اس حدیث کو مغیرہ بن شعبہ سے روایت کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد کی نہایت نمایاں شخصیتوں میں سے ہیں اور گورنری کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ کیونکر ممکن ہے کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہوتی اور وہ حضرت عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کو اس کے خلاف فیصلہ کرنے دیتے۔ ان وجوہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مفقود کے بارے میں کوئی حکم منصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق کلیتہً اہل علم کے اجتہاد سے ہے۔

صحابہ اور تابعین اور ائمۂ مجتہدین کی آراء اس مسئلہ میں مختلف ہیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ، اور حضرت ابن عباس کی رائے یہ ہے کہ مفقود کی بیوی کو چار سال تک انتظار کا حکم دیا جائے۔ یہی رائے سعید بن المسیب، زہری، نخعی، عطاءؒ، مکحولؒ، اور شعبی کی ہے۔ امام مالک نے بھی اسی مذہب کو اختیار کیا ہے اور امام احمد کا میلان بھی اسی کی طرف ہے۔

دوسری جانب حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ ہیں جن کی رائے یہ ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو اس وقت تک صبر کرنا چاہیے جب تک کہ وہ واپس نہ آئے یا اس کی موت کی تحقیق نہ ہو جائے۔

سفیان ثوری، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے [ا]
کے لیے حنفیہ یہ قاعدہ تجویز کرتے ہیں کہ جب تک شخص مفقود کے ہم عمر لوگ اس کی بستی یا اس
ملک میں زندہ ہوں اس وقت تک اس کی بیوی انتظار کرے۔ بعض بزرگوں نے انسان
زیادہ سے زیادہ عمر کا اعتبار کیا ہے۔ یعنی ایک انسان زیادہ سے زیادہ جس عمر تک پہنچ سکتا
ہے اس عمر تک مفقود کے پہنچنے کا انتظار کیا جائے مثلاً اگر کوئی شخص ۳۰ سال کی عمر میں مفقود
اس کی بیوی کو بقول بعض ۹۰ سال اور بقول بعض ۷۰ سال اور بقول بعض ۶۰ سال اور بقول بعض ۵۰
یا کم سے کم ۴۰ سال انتظار کرنا پڑے گا، کیونکہ بعض کے نزدیک انسان کی عمر طبعی ۱۲۰
ہے اور بعض ۱۰۰ یا ۹۰ یا ۸۰ یا ۷۰ قرار دیتے ہیں۔

اس مسئلہ میں جب ہم قرآن مجید کے اصولی احکام کی طرف رجوع کرتے ہیں تو حضرت عمرؓ
اور ان کے متبعین کا مذہب ہم کو صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہی اسلامی قانون کی روح او
کے عدل اور اس کے توازن اور اس کی فطرت سے کمال مطابقت رکھتا ہے۔ قرآن میں ہم دیکھتے
ہیں کہ چار بیویوں کی اجازت دینے کے ساتھ یہ حکم دیا گیا ہے کہ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ
فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ۔ (ایک بیوی کی طرف بالکل اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دو
بیوی کو معلق چھوڑ دو) اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کسی عورت کو معلق چھوڑ دینا پسند نہیں
کرتا۔ اور جب وہ شوہر کی موجودگی میں اس کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے مفقود ہونے کی
میں کیونکر پسند کر سکتا ہے۔ دوسری جگہ شوہروں کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں
ایلاء کرو تو زیادہ سے زیادہ چار مہینے تک ایسا کر سکتے ہو اس کے بعد تم کو طلاق دینا ہو
یہاں پھر اسلامی قانون کی اسپرٹ یہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی صحبت
اتنی مدت تک محروم نہ رکھی جائے کہ اس کے لیے موجب ضرر ہو یا حدود اللہ سے تجاوز کا

بن جائے۔ پھر وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا فرمایا گیا جس کا منشا صاف طور پر یہ ہے کہ رشتۂ ازدواج میں ضرار نہ ہونا چاہیے، اور یہ ظاہر ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو مدت العمر انتظار کا حکم دینے میں انتہا درجہ کا ضرار ہے۔ اس کے ساتھ وہ آیت بھی قابل غور ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ اگر حدود اللہ کے ٹوٹنے کا خوف ہو تو خلع میں کچھ مضایقہ نہیں یہاں حدود اللہ کی حفاظت کو رشتۂ ازدواج کے قیام پر مقدم رکھا گیا ہے، اور اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جس عورت کا شوہر برسوں سے مفقود ہو اس کے لیے حدود اللہ پر قائم رہنا نہایت مشکل ہے۔ ان تمام احکام کے اصول اور ان کے مصالح اور ان کی حکمت پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ مفقود الخبر کی بیوی کو ایک غیر معلوم مدت تک انتظار کا حکم دینا اور اس کو معلق رکھ چھوڑنا درست نہیں ہے۔

مذہب مالکی کے احکام | علما احناف نے انہی وجوہ سے مفقود الخبر کے مسئلہ میں مذہب مالکی کے حکم کے مطابق فتویٰ دینا پسند کیا ہے۔ لہٰذا اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ اس باب میں مالکیہ کے تفصیلی احکام کیا ہیں۔

مذہب مالکی کے لحاظ سے فقدان زوج کی تین صورتیں ہیں، اور ہر ایک کے احکام جدا جدا ہیں۔

(۱) مفقود نے اپنے پیچھے اتنا مال نہ چھوڑا ہو کہ اس کی بیوی گذر بسر کر سکے۔ اس صورت میں حاکم اس کو انتظار کا حکم نہیں دیگا بلکہ تحقیق حال کے بعد بلا انتظار اس کو باختیار خود طلاق دیدے گا یا اسے اجازت دے گا کہ اپنے اوپر طلاق وارد کرے[۱]۔ شافعی اور حنبلی مذاہب بھی اس مسئلہ

[۱] تطلیق کے لیے حاکم کے بطور خود طلاق دینے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ عورت کو خود اپنے اوپر طلاق وارد کرنے کی اجازت دے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ سے فرمایا تھا کہ انت املک بنفسک ان شئت اقمت مع زوجک وان شئت فارقتیہ۔ (یعنی تجھے اپنے نفس کا اختیار ہے خواہ اپنے شوہر کے ساتھ رہے یا اس سے جدا ہو جائے

ہیں مالکی مذہب کی تائید کرتے ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک عدم نفقہ بجائے خود تفریق کے لیے کا
وجہ ہے۔

(۲) مفقود نے مال تو چھوڑا ہے، مگر عورت جوان ہے اور اس کو کسی طویل مدت کے لیے معلق
رکھ چھوڑنے میں اس کے مبتلائے معصیت ہوجانے کا خوف ہے۔ ایسی صورت میں حاکم اس ک
ایک سال یا چھ مہینے یا جس قدر مدت مناسب سمجھے، انتظار کرنے کا حکم دیگا۔ اس باب میں حنبلی مذ
بھی مالکی مذہب کا ہم نوا ہے۔ بلکہ بعض شدید صورتوں میں حنابلہ اور مالکیہ نے بلا انتظار بھی تفریق کو
رکھا ہے نیز خوفِ معصیت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مدعیہ خود منہ پھوڑ کر کہدے کہ مجھے اس شو
کی قید نکاح سے آزاد کرو ورنہ میں زنا کروں گی۔ بلکہ یہ دیکھنا خود قاضی کا کام ہے کہ جو عو
فقدان زوج کی شکایت لے کر آئی ہے اس کی عمر کیا ہے، کس ماحول میں رہتی ہے، اور د
کرنے سے پہلے کس قدر مدت شوہر کے انتظار میں گذار چکی ہے۔ ان چیزوں پر نظر کرنے سے و
رائے قائم کرسکتا ہے کہ اس کے اخلاق کی حفاظت کے لیے اُسے مدت انتظار میں کس قدر تخفی
کرنی چاہیے۔

(۳) مفقود نفقہ بھی چھوڑ گیا ہے اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا خوف بھی نہیں
اس صورت میں پھر چار شقیں پیدا ہوتی ہیں۔

الف۔ اگر مفقود بلاد اسلام میں یا ایسے ممالک میں کھویا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے
تعلقات ہیں اور جہاں اس کا پتہ چلانا ممکن ہے، تو اس کی عورت کو چار سال تک انتظار کر
کا حکم دیا جائیگا۔

ب۔ اگر وہ میدان جنگ میں کھویا گیا ہے تو اس کی تلاش کی امکانی کوشش کرنے کے
ایک سال انتظار کیا جائے گا۔

ج۔ اگر وہ کسی اندرونی فساد کے سلسلہ میں کھو یا گیا ہے تو فساد ختم ہونے کے بعد اُس کی تلاش کے لیے امکانی کوشش کی جائے گی پھر بلا انتظار اس کی بیوی کو عدت وفات گذارنے کی اجازت دیدی جائے گی۔

د۔ اگر وہ ایسے وحشی ممالک میں کھو یا گیا ہے جن سے مہذب دنیا کے تعلقات نہیں ہیں، اور جہاں اس کے تلاش کرنے کا امکان نہیں ہے، تو اس کی بیوی کو مدت تعمیر گذرنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ مدت تعمیر کی تعیین میں اختلاف ہے بعض ۷۰ سال کہتے ہیں بعض ۹۰ سال اور بعض ۷۵ سال لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ اسی صورت میں ہوگا جب کہ وہ کافی نفقہ چھوڑ گیا ہو، اور عورت کے مبتلائے معصیت ہونے کا بھی خوف نہ ہو۔

علمار احناف عموماً اپنے فتاویٰ میں مذہب مالکی کی ان شرائط کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور فقدان زوج کی تمام صورتوں میں چار سال کی مدت انتظار کا فتویٰ دیتے ہیں۔ لیکن یہ درست نہیں ہے خصوصاً موجودہ زمانہ میں جب کہ اخلاقی حالات کو بگاڑنے کے بکثرت اسباب پیدا ہو گئے ہیں ہر فاقد الزوج عورت کے لیے چار سال کی مدت انتظار پر اصرار کرنا مصالح شرعیہ کے بالکل خلاف ہے۔ آج اسلامی سوسائٹی میں وہ زبردست اخلاقی ڈسپلن باقی نہیں رہا ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھا، غیر اسلامی قوانین کے رواج نے ان تمام بندشوں سے انسان کو آزاد کر دیا ہے جو شہوات نفس کو قابو میں رکھنے کے لیے اسلام نے قائم کی تھیں، سینما، عریان تصاویر عشقیہ ناولوں اور قصوں کے رواج عام اور عورتوں اور مردوں کے آزادانہ میل جول نے جذبات کو متحرک کرنے کے اتنے سامان پیدا کر دیے ہیں کہ کسی شخص کے لیے ضبط نفس اور پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا بہت دشوار ہو گیا ہے۔ ایسے حالات میں یہ کہاں تک مناسب ہوگا کہ ایک جوان عورت جب اپنے مفقود الخبر شوہر کی واپسی کا دو تین سال انتظار کرنے کے بعد عاجز آ کر عدالت

میں رجوع کرے تو عدالت اس کو مزید چار سال انتظار کرنے کا حکم دے۔ یہ ایسی سختی ہے جس میں
عورتوں ہی کے لیے ضرر نہیں ہے، بلکہ اس کے مضر نتائج تمام قوم میں پھیل جانے کا خوف ہے
لہذا ہماری تجویز یہ ہے کہ قانون میں مفقود الخبر کے متعلق مذہب مالکی کی تمام شرائط کو شامل کر
جائے اور اجراء احکام میں فاقد الزوج عورت کی عمر اس کے احوال اور اس مدت کا مناسب
لحاظ کیا جائے جس کو حالت انتظار میں گذارنے کے بعد اس نے عدالت کی طرف رجوع کیا ہو
حکم بصورت واپسی مفقود اس سلسلہ میں یہ سوال بھی بحث طلب ہے کہ اگر شوہر مفقود مدت انتظ
کے تمام ہونے کے بعد واپس آئے تو اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عمر کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت کے نکا
ثانی سے پہلے اس کا شوہر واپس آگیا تو وہ اسی کو ملے گی، لیکن اگر عورت نکاح کر چکی ہے آ
خواہ شوہر ثانی کے ساتھ خلوت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں شوہر اول کا اس
کوئی حق نہ رہا۔ امام مالک نے موطا میں حضرت عمر کے اسی قول سے استناد کیا ہے اور یہی مذہب
مالکی کا مفتیٰ بہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عورت ہر حال میں پہلے شوہر کو واپس ملے گی خو
دوسرے شوہر سے خلوت ہو چکی ہو اور بچے تک پیدا ہو گئے ہوں۔ مزید براں خلوت ہو چکنے کی صورت
دوسرے شوہر سے اس عورت کو مہر بھی دلایا جائے گا۔ حنفیہ نے اسی مذہب کو اختیار کیا ہے، او
کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے بھی آخر میں حضرت علی کے اس فیصلہ کی طرف رجوع کر لیا تھا۔ لیکن امام ما
کے نزدیک حضرت عمر کا رجوع ثابت نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو موطا باب عدۃ التی تفقد زوجھ
اور المغنی لابن قدامہ۔)

حضرت عثمان کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر عورت نکاح ثانی کر چکی ہو، پھر شوہر اول واپس آجائے
تو اس سے دریافت کیا جائے گا کہ تجھے بیوی چاہیے یا مہر؟ اگر اس نے مہر واپس لینے (یا معاف کرا

کو پسند کیا تو عورت شوہر ثانی کے پاس چھوڑ دی جائے گی۔ اور اگر وہ بیوی کو واپس لینے پر اصرار کرے تو عورت کو اپنے دوسرے شوہر سے جدا ہو کر عدت طلاق گذارنی ہوگی پھر وہ پہلے شوہر کے حوالہ کر دی جائے گی۔ اور دوسرے شوہر سے اس کو مہر دلایا جائے گا۔ بعض روایات میں حضرت عمرؓ سے بھی اسی طرح کا ایک قول منقول ہے لیکن امام مالک کے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک ان تینوں فیصلوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ احسن ہے۔ اس لیے کہ اگر نکاح ثانی ہو جانے کے بعد بھی شوہر اول کا حق عورت پر قائم رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص ایسی عورت سے نکاح کرنا پسند نہ کرے گا جس کے متعلق اس کو ہمیشہ یہ کھٹکا لگا ہوا ہو کہ نہ معلوم کب اس کا پہلا شوہر واپس آجائے، اور نہ صرف عورت اس سے چھن جائے، بلکہ اس کو مہر بھی دینا پڑے۔ اور بچے ہو جانے کی صورت میں اس کی اولاد الگ برباد ہو۔ اس قسم کی شرط عائد کرنے میں عورت کے لیے غایت درجہ کا ضرر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طویل اور تھکا دینے والی مدت انتظار گذار کر بھی اس کی مصیبت ختم نہ ہو، عدالت سے آزادی کا پروانہ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے پاؤں میں ایک زنجیر پڑی رہے اور اس کو ساری عمر معلق حالت ہی میں رہ کر گذارنی پڑے۔

لعان لعان کے متعلق قرآن مجید کا حکم پہلے بیان ہو چکا ہے یہاں اس کے تفصیلی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

شوہر خواہ اپنی بیوی پر بالفاظ صریح زنا کا الزام لگائے یا اولاد کے متعلق کہے کہ وہ اس کی نہیں ہے دونوں صورتوں میں لعان واجب آتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے فریقین کو مخاطب کرکے تین مرتبہ فرمایا۔ اللہ اعلم ان احد کما کاذب فہل منکما من تائب۔ "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جھوٹا ہے، پھر کیا تم میں سے

کوئی توبہ کرے گا؟" جب دونوں نے توبہ سے اعراض کیا تو آپ نے قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق پہلے شوہر سے چار قسمیں اس بات پر لیں کہ جو الزام اس نے لگایا ہے وہ صحیح ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے یہ کہلوایا کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ پھر اسی طرح چار قسمیں عورت سے لیں کہ جو الزام اس پر لگایا گیا ہے وہ غلط ہے اور پانچویں مرتبہ اس سے کہلوایا کہ اگر یہ الزام صحیح ہو تو اس پر خدا کی لعنت۔ اس کے بعد حضور نے فرمایا ذاکم التفریق بین کل متلاعنین الیٰ یوم القیمۃ۔ اذا تفرقا لا یجتمعان ابداً۔" یہ ہر لعان کرنے والے زوجین کے درمیان قیامت تک کے لیے تفریق ہے اس تفریق کے بعد وہ کبھی جمع نہیں ہو سکتے"۔ شوہر نے عرض کیا کہ جو میں نے اس کو مہر میں دیا تھا وہ واپس دلوایا جائے۔ آپ نے جواب دیا لا مال لک۔ ان کنت صدقت علیھا فبما استحللت من فرجھا وان کنت کذبت علیھا فذلک ابعد لک منھا۔ "مال تجھے نہیں مل سکتا۔ اگر تو نے سچا الزام لگایا ہے تو یہ مال اس تمتع کا معاوضہ ہے جو تو اٹھا چکا ہے۔ اور اگر تو نے اس پر جھوٹی تہمت لگائی ہے تو مال کی واپسی کا استحقاق تجھ سے اور بھی زیادہ دور ہو گیا"۔

حضور کے اس فیصلہ سے حسب ذیل احکام نکلتے ہیں:۔

(۱) لعان قاضی کے سامنے ہونا چاہئے۔ عورت اور مرد آپس میں یا اپنے رشتہ داروں کے سامنے لعان نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے لعان سے تفریق ہو سکتی ہے۔

(۲) لعان سے پہلے قاضی عورت اور مرد دونوں کو موقع دے گا کہ ان میں سے کوئی ایک قصور کا اعتراف کرلے جب دونوں اپنی اپنی بات پر اصرار کریں تب لعان کرایا جائیگا۔

(۳) فریقین کی طرف سے لعان کا فعل تمام ہونے کے بعد قاضی اعلان کریگا کہ ان کے درمیان تفریق کر دی گئی۔ جمہور کا خیال ہے کہ لعان سے خود بخود فرقت واقع ہو جاتی ہے لیکن امام ابوحنیفہ

رائے یہ ہے کہ تفریق کے لیے حکم حاکم ضروری ہے۔ تمام معتبر احادیث جو اس مسئلہ میں ہم کو پہنچی ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کی تائید کرتی ہیں کیونکہ ہر ایسے مقدمہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعان کا فعل پورا ہونے کے بعد تفریق کا فیصلہ صادر فرمایا ہے، اور محض ملاعنت کو فرقت کے لیے کافی قرار نہیں دیا ہے۔

(۴) لعان سے جو تفریق کی جاتی ہے وہ ابدی ہے۔ اس کے بعد فریقین اگر دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں تحلیل کا وہ قانون جاری نہیں ہوتا جو حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۵) لعان سے مہر ساقط نہیں ہوتا۔ خواہ شوہر کا الزام حقیقت میں صحیح ہو یا غلط، بہر صورت مہر اس کو دینا پڑے گا۔ یا اگر دے چکا ہے تو اس کو واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔

اگر عورت پر الزام لگانے کے بعد شوہر لعان کرنے سے انکار کرے تو جمہور کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں وہ حد کا نہیں بلکہ قید کا سزاوار ہوگا۔ اسی طرح اگر شوہر کے لعان کر چکنے کے بعد عورت لعان سے انکار کرے تو شافعی مالک اور احمد رحمہم اللہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو رجم کیا جائے گا، اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس کو قید کیا جائے گا۔ اس باب میں امام اعظم کا مذہب زیادہ صحیح اور مبنی بر مصلحت ہے لیکن ہندوستان کے ملکی قانون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ لعان سے انکار کرنے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے اس لیے قانون ازدواج کی تدوین جدید میں اس کے لیے مناسب شکل یہ ہوگی کہ اگر مرد لعان سے انکار کرے تو عورت کو اس پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور اگر عورت انکار کرے تو اُسے مہر سے محروم کر دیا جائے۔

تطلیقات ثلٰثہ در مجلس واحد | بیک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علماء امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اس امر میں ہے کہ

ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق بائن کے حکم میں لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے طلاق کے لیے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہوجاتی ہیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضور غصہ میں آکر کھڑے ہوگئے اور فرمایا اَیُلعَبُ بکتاب اللہ عزّ وجلّ وانا بین اظھرکم کیا اللہ عز وجل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے، حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ بعض دوسری احادیث میں تصریح ہے کہ حضور نے اس فعل کو معصیت فرمایا ہے، اور حضرت عبداللہ ابن عمر کے متعلق تو روایات میں یہاں تک آیا ہے کہ جو شخص ان کے پاس مجلس واحد میں تین طلاقیں دینے والا آتا تو وہ اس کو دُرّے لگاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اس فعل پر سزا بھی دی جا سکتی ہے۔

ہمارے زمانہ میں یہ طریقہ عام ہوگیا ہے۔ لوگ کسی فوری جذبہ کے تحت اپنی بیویوں کو تین طلاقیں دے دیتے ہیں، پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھاکر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے، اور کوئی طلاق کو مخفی رکھکر اپنی بیوی کے ساتھ بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے نقصان سے بچنے کے لیے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سد باب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تطلیقات ثلثہ درمجلس واحد پر ایسی پابندیاں عائد کردی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کرسکیں۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مطلقہ عورت کو جسے بیک وقت تین طلاقیں دی گئی ہوں، عدالت میں ہرجانہ کا دعویٰ کرنے کا حق دیا جائے، اور ہرجانہ کی مقدار کم از کم مہر کی نصف مقدار تک مقرر کی جائے۔ اس کے علاوہ اور صورتیں بھی روک تھام کی نکل سکتی ہیں جن کو ہمارے علماء اور ماہرین قانون، غور وخوض کے بعد تجویز کرسکتے ہیں۔

خاتمہ کلام | اس مضمون میں اسلامی قانون ازدواج کے مقاصد اور اصول کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، اور کتاب و سنت کی تعلیمات کو پیش نظر رکھ کر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج کل مسلمانان ہند کی ازدواجی زندگی میں مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو یہ دعویٰ نہیں کہ جو کچھ ہم نے اسلام کے قانون کو سمجھا ہے وہ بالکلیہ صحیح ہے، نہ ہم کو اس پر اصرار ہے کہ حل مشکلات کے لیے جو تجویزیں ہم نے پیش کی ہیں ان کو بعینہٖ قبول کر لیا جائے۔ انسانی رائے میں بہر حال خطا و صواب دونوں کا امکان ہے، اور کسی انسانی رائے کے متعلق یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خطا سے پاک اور وحی خداوندی کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ ہمارا مقصد اس طویل بحث و تحقیق سے صرف اس قدر تھا کہ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی قانون ازدواج کے جو اصول ہم نے سمجھے ہیں ان کو بیان کر دیں، اور پھر ان اصول سے اکابر صحابہ و ائمہ مجتہدین نے جو فروع مستنبط کئے ہیں ان پر نظر ڈال کر ایسے فروع اخذ کر لیں جو ہمارے نزدیک اس زمانے کی ضروریات کے لحاظ سے مفید اور مناسب ہیں۔ اب یہ اہل علم اور اصحاب فکر و رائے کا کام ہے کہ وسعت نظر اور تدبر فی الکتاب والسنہ سے کام لے کر ہماری ان تجاویز پر غور کریں۔ اگر اس میں کچھ خطا پائیں تو اس کی اصلاح کر دیں اور اگر کوئی چیز صواب نظر آئے تو اس کو محض اس بنا پر رد نہ کر دیں کہ لکھنے والا بدقسمتی سے چوتھی صدی کے بجائے چودھویں صدی میں پیدا ہوا ہے۔

آخر میں ہم ان مسودات قانون کے متعلق بھی مجملاً اپنی رائے ظاہر کر دینا چاہتے ہیں جو اس سلسلہ میں حیدرآباد اور برطانوی ہند کے بعض حضرات نے مرتب کئے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سب مسودے تشنہ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے غیر مکتفی ہیں۔ اس قسم کے مختصر مسودات سے ان خرابیوں کو دور نہیں کیا جا سکتا جو اینگلو محمڈن لا کے نقائص، اور غیر مسلم عدالتوں کے صد سالہ نظائر اور موجودہ عدالتی نظام کے طریق کار سے پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر چند خاص معاملات میں یہ طے کر دیا گیا کہ فقہ حنفی کے

بجائے فقہ مالکی کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ یا بعض مسائل میں جزئیات کی مختصر تشریح بھی کر دی گئی تو اس سے وہ حکام عدالت کوئی صحیح فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے جو قوانین شریعت اور فقہیہ کے جزئیات پر کوئی وسیع نظر نہیں رکھتے، اور جن کے دماغوں پر وہی اینگلو محمڈن لاکی اسپرٹ مسلط ہے ہوئی حالت کو درست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خانگی ازدواجی معاملات کے لئے ایک مفصل ضابطہ مرتب کیا جائے جیسا ہم اس سلسلۂ مضامین کے نمبر ۲ میں عرض کر چکے ہیں یہ کام آسان نہیں ہے۔ وقت اور محنت ہے، اور ایک شخص کے بس کا بھی نہیں اس کے لیے اصحاب علم و رائے کی ایک منتخب جماعت کا کافی مدت تک سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے، اور یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ وہ محض متقدمین کی کتابوں جزئیات کو لفظ بلفظ نقل کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، بلکہ قوم کے ارباب حل و عقد ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ قوانین شریعت کی ایسی تعبیر کریں جس سے شریعت کے اصلی مقاصد پورے ہوں اور قوم کے دین، اخلاق اور معاملات کی حفاظت کا ٹھیک ٹھیک ادا ہو جائے۔

بچوں کیلیے مفید کتابیں

ہمارے نبی کے صحابہ | اس کتاب میں صحابہ کرام کی زندگی کے سبق آموز واقعات نہایت سلیس زبان اور دل نشین انداز کے ساتھ درج کیے گئے ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ بزرگوں کے اخلاق، دین داری، حسن معاشرت، نیک معاملات کا حال معلوم ہوتا ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کا شوق پیدا ہوتا ہے قیمت ۲ عالی ۲ رکلدار علاوہ محصول

مسلمان بی بیاں | یہ کتاب "ہمارے نبی کے صحابہ" کی طرح صحابیہ خواتین کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان مقدس ہستیوں کی دین داری، حسن اخلاق اور خانگی زندگی میں ان کے نیک برتاؤ کے واقعات بیان کیے گئے ہیں مسلمان بچیوں کے لیے یہ کتاب شمع ہدایت ہے اور بہت سادہ زبان میں لکھی گئی ہے قیمت ۲ عالی ۲ رکلدار علاوہ محصول ڈاک

دفتر ترجمان القرآن سے طلب کیجئے۔

تنزیل و تاویل

تفسیر سورۂ کافرون

از جناب مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی

قُل یٰٓاَیُّھَا الکافِرُوْنَ ۔ الف لام عہد خارجی کا ہے۔ یعنی وہ خاص شخص یا گروہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یا جو مخاطب ہے یا جس کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے جیسے جاءَ الرَّجُل ۔ وہ خاص شخص آیا۔ یہاں الکافرون سے مراد قریش کے چند مخصوص کفار ہیں۔

الکافرون ۔ کفر یکفر مثل نصر کفرًا ۔ انکار کرنا اس کے اصلی معنی ڈھانکنا ہیں۔ رات کو کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی تاریکی میں سب کو ڈھانک لیتی ہے۔

ان صبح ان اللیل کافر لی فیک اجر مجاھد

اے شب فرقت مجھے تجھ میں ایک مجاہد کا ثواب ہے۔ کیونکہ تو کافر ہے۔

کسان کو بھی کافر کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ تخم کو زمین میں ڈھانک دیتا ہے۔ کفارہ۔ گناہ کا بدلہ جو گناہ کو ڈھانک دے۔ اس کے بعد یہ لفظ انکار اور حق پوشی کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا ہے بعض جاہل کفار نے حضرت سے کہا۔ یا محمدؐ! تم ایک سال ہمارے بتوں کی پوجا کرو۔ اور ہم تمہارے خدا کی ایک سال عبادت کریں گے۔ ان کے جواب میں یہ سورت اتری۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۔ مضارع پر لا بھی آتا ہے اور ما بھی۔ لا مستقبل کے لیے آتا ہے۔ اور ما حال کے لیے۔ ما افعل میں نہیں کرتا ہوں۔ لا افعل میں نہیں کروں گا

عبادۃ۔ عبد بمعنی اصرا انتہائی تذلل و فروتنی۔ اسی سے مشتق ہے طریق معبّد خوب روندا ہوا
اور ثوب ذو عبدۃ صاف چکنا کپڑا۔ اسی لیے انتہائی عاجزی کی جو صورت اسلام
مقرر کی گئی ہے، یعنی سجدہ غیر خدا کے لیے جائز نہیں۔

کیا تعظیم کرنا، گردن جھکانا بھی ناجائز ہے؟ نہیں۔ بزرگوں کی تعظیم تو ضروری ہے۔
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ۔ ماں باپ کے لیے ذلت و فروتنی کے بازو جھکا دے

کیا عبد فلاں کہنا یا ایسا نام رکھنا جائز ہے؟ عبد کا لفظ تین جگہ مستعمل ہوتا ہے
(۱) مخلوق جیسے عبداللہ۔ عبدالرحمن۔ عبدالقادر وغیرہ اس معنی کے لحاظ سے سوائے
خدائے تعالیٰ کے کوئی شخص کسی کا نہ مخلوق ہے نہ عبد۔

(۲) زرخرید غلام۔ فقہ کی تمام کتابیں عبد کے اس معنی سے بھری پڑی ہیں۔

(۳) مطیع فرمانبردار۔ خادم۔ حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے پہلے خطبہ میں ہے۔ کنتُ
عبدہ وخادمہ میں رسول خدا کا بندہ تھا خادم تھا۔ حضرت علی سے کسی یہودی نے چ
سوالات کیے۔ آپ نے اس کے جواب باصواب دیے۔ تو اس نے پوچھا اَنْتَ نبیٌ ام لا
کیا آپ پیغمبروں میں کوئی پیغمبر ہیں؟ آپ نے فرمایا ویحک! انا عبدٌ من عبید محمد تجھ پر افسو
ہے میں محمد کے بندوں میں سے ایک بندہ ہوں۔ یہاں عبد یا بندہ کا لفظ بمعنی مطیع و خادم ہے

قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ۔ اے محمدؐ تم کہو اے اللہ اور دین
حق کے منکرو! میں نہ پوجوں گا ان بتوں ان دیوتاؤں، ان گذشتہ لوگوں کو جن کو تم پوجتے ہو

وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا أَعْبُدُ۔ اور نہ تم اس خدائے واحد کی عبادت کرنے والے
جس کی میں عبادت کرتا ہوں۔

وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُّمْ۔ اور نہ میں پوجنے والا ہوں۔ اس طرح جس طرح کہ تمہاری پوجا ہو ق

وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو جس طرح میں عبادت کرتا ہوں۔ یعنی میرا اور تمہارا معبود بھی الگ ہے۔ اور طریقۂ عبادت بھی جدا ہے۔ پہلے کے دو ما بمعنی الذی و موصول ہیں۔ یعنی وہ جس کی عبادت کی جاتی ہے۔ اور دوسرے دو ما بمعنی مصدر ہیں۔ یعنے پوجا پوجنا۔ ہمارے مختار معنی پر ان جملوں میں پہلے جملوں کی تاکید نہیں ہے۔ بلکہ تاسیس ہے یعنے نئے اور جدا معنے ہیں۔

دین۔ بدلہ اور جزا مذہب اور دھرم۔ کما تدین تدان۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے دِنَّاهُمْ کَمَا دَانُوا ہم نے ان کو ویسا ہی بدلہ دیا جیسا انھوں نے کام کیا تھا۔

دِینِ۔ کسرۂ نون سے اس کی اصل دینی ہے۔ یا تخفیفاً حذف کیگئی اور کسرہ رکھا گیا تا کہ حذفِ یا پر دلالت کرے۔

لکم دینکم ولی دین۔ تمکو تمہارے کاموں کا بدلہ ملے گا۔ اور مجھکو میرے کاموں کا۔ یا تم اپنا باطل دھرم نہیں چھوڑتے تو میں اپنا حق مذہب کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ اس آیت کے معنی بعض لوگ ایسے کرتے ہیں جس سے نکلتا ہے، کہ تم اپنے دھرم پر رہو۔ اور ہم اپنے مذہب پر رہیں گے۔ اور پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت اجازت جنگ سے پہلے کی ہے۔ لہذا منسوخ بھلا آپ نے پہلے ایسے معنی ہی کیوں لیے جن پر منسوخیت کا دعوی کرنا پڑا۔

رسائل و مسائل

سُود، پردہ طلاق اور مہر

(۳)

اشاعت گذشتہ میں قلت گنجائش کی وجہ سے یہ مضمون ایسی جگہ ختم کر دینا پڑا جہاں سلسلۂ کلام پیمانہ ہوا تھا، لہذا قارئین کرام کی آسانی کے لیے اشاعت گذشتہ کے آخری فقرات یہاں پھر نقل کئے جاتے ہیں۔

۳۔ خرچ کرنے کا حکم | جمع کرنے کے بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اگر خرچ کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں، بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے یعنی آپ کے پاس اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے اس کو نیک اور مفید کاموں میں خرچ کر دیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲: ۲۷) اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو کہ ضرورت سے بچ رہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اور احسان کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور ناداروں مسکینوں اور قرابتی پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں

اَيْمَانُكُمْ (۴:۶)	کے ساتھ۔
وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۱۵۱)	اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔

اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ خرچ کرنے سے مفلس ہو جاؤں گا۔ اور جمع کرنے سے مالدار بنوں گا۔ اسلام کہتا ہے خرچ کرنے سے برکت ہوگی، تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ اور بڑھے گی۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۤءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ (۲:۳۷)	شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور بخل جیسی شرمناک بات کا حکم دیتا ہے، مگر اللہ تم سے بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو کچھ خرچ کر دیا وہ کھویا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمہاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (۲:۳۷)	اور تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ (۴:۳۵)	اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورے پورے اجر دیگا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ دولت کو جمع کر کے اس کو سود پر چلانے سے دولت بڑھتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں، سود سے تو دولت گھٹ جاتی ہے۔ دولت کو بڑھانے کا ذریعہ نیک کاموں میں

مال کو خرچ کرنا ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ۔ (۲ : ۲۷۶)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (۳۰ : ۴)

اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال پر اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک ہرگز نہیں بڑھتا۔ بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو۔

یہ ایک نیا نظریہ ہے جو سرمایہ داری کے نظریہ کی بالکل ضد ہے۔ خرچ کرنے سے دولت کا بڑھنا، اور خرچ کیے ہوئے مال کا ضائع نہ ہونا بلکہ اس کا پورا پورا بدل کچھ زائد فائدے کے ساتھ واپس آنا، اور سود سے دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹا گھاٹا آنا، اور زکوٰۃ و صدقات سے دولت میں کمی واقع ہونے کے بجائے اضافہ ہونا ایسے نظریات ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ اور سننے والا سمجھتا ہے کہ ان سب باتوں کا تعلق محض ثواب آخرت سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان باتوں کا تعلق ثواب آخرت سے بھی ہے۔ اور اسلام کی نگاہ میں اصلی اہمیت اسی کی ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بھی معاشی حیثیت سے یہ نظریات ایک نہایت مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ دولت کو جمع کرنے اور اس کو سود پر چلانے کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ دولت سمٹ سمٹ کر چند افراد کے پاس اکٹھی ہو جائے، جمہور کی قوت خرید روز بروز گھٹتی چلی جائے، صنعت اور تجارت اور زراعت میں کساد بازاری رونما ہو، قوم کی معاشی زندگی تباہی کے سرے پر جا پہنچے، اور آخرکار خود ان سرمایہ دار افراد کے لیے بھی اپنی جمع شدہ دولت کو افزائش دولت کے کاموں میں لگانے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ بخلاف اس کے خرچ کرنے اور زکوٰۃ و صدقات دینے کا

مآل یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد تک دولت پھیل جائے، ہر ہر شخص کو کافی قوتِ خرید حاصل ہو، صنعتیں پرورش پائیں، کھیتیاں سرسبز ہوں، تجارت کو خوب فروغ ہو، اور چاہے کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ ہو، مگر سب خوش حال و فارغ البال ہوں۔ اس مآل اندیشانہ معاشی نظریہ کی صداقت اگر دیکھنی ہو تو امریکہ کے موجودہ معاشی حالات کو دیکھیے جہاں سود ہی کی وجہ سے تقسیم ثروت کا توازن بگڑ گیا ہے، اور صنعت و تجارت کی کساد بازاری نے قوم کی معاشی زندگی کو تباہی کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ابتدائے عہد اسلامی کی حالت کو دیکھیے کہ جب اس معاشی نظریہ کو پوری شان کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا تو چند سال کے اندر قوم کی خوش حالی اس مرتبہ کو پہنچ گئی کہ لوگ زکوٰۃ کے مستحقین کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خود صاحب نصاب نہ ہو۔ ان دونوں حالتوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کس طرح سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

پھر اسلام جو ذہنیت پیدا کرتا ہے وہ بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بالکل مختلف ہے سرمایہ دار کے ذہن میں کسی طرح یہ تصور سماہی نہیں سکتا کہ ایک شخص اپنا روپیہ دوسرے کو سود کے بغیر کیسے دے۔ وہ قرض پر نہ صرف سود لیتا ہے بلکہ اپنے راس المال اور سود کی بازیافت کے لیے قرض دار کے کپڑے اور گھر کے برتن تک قرق کرا لیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حاجت مند کو صرف قرض ہی نہ دو بلکہ اگر وہ تنگ دست ہو تو اس پر تقاضے میں سختی بھی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر اس میں دینے کی استطاعت نہ ہو تو معاف کر دو۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۲۸۰/۲

اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دیدو، اور اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔

سرمایہ داری میں امداد باہمی کے معنی یہ ہیں کہ آپ انجمن امداد باہمی کو پہلے روپیہ دے کر اس کے رکن بنیئے، پھر اگر کوئی ضرورت آپ کو پیش آئے گی تو انجمن آپ کو عام بازاری شرح سود سے کچھ کم پر قرض دیدے گی۔ اگر آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے تو "امداد باہمی" سے آپ کچھ بھی امداد حاصل نہیں کر سکتے برعکس اس کے اسلام کے ذہن میں امداد باہمی کا تصور یہ ہے کہ جو لوگ ذی استطاعت ہوں وہ ضرورت کے وقت اپنے کم استطاعت بھائیوں کو نہ صرف قرض دیں بلکہ قرض ادا کرنے میں بھی حسبۃً للہ ان کی مدد کریں، چنانچہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف والغارمین بھی ہے یعنی قرضداروں کے قرض ادا کرنا۔

سرمایہ دار اگر نیک کاموں میں خرچ کرتا بھی ہے تو محض نمائش کے لیے، کیونکہ اس کم نظر کے نزدیک اس خرچ کا کم سے کم یہ معاوضہ تو اس کو حاصل ہونا چاہیے کہ اس کا نام ہو جائے، اس کو مقبولیتِ عام حاصل ہو، اس کی دھاک اور ساکھ بیٹھ جائے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ خرچ کرنے میں نمائش ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ خفیہ یا علانیہ جو کچھ بھی خرچ کرو۔ اس میں یہ مقصد پیش نظر ہی نہ رکھو کہ فوراً اس کا بدل تم کو کسی نہ کسی شکل میں مل جائے، بلکہ مآل کار پر نگاہ رکھو۔ اس دنیا سے لیکر آخرت تک جتنی دور تمہاری نظر جائے گی تم کو یہ خرچ پھلتا پھولتا اور منافع پر منافع پیدا کرتا ہی دکھائی دے گا۔ "جو شخص اپنے مال کو نمائش کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی تھی۔ اس نے اس مٹی پر بیج بویا، مگر پانی کا ایک ریلا آیا اور مٹی کو بہا لے گیا۔ اور جو شخص اپنی نیت کو درست رکھکر اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے ایک عمدہ زمین میں باغ لگایا اگر بارش ہو گئی تو وہ دگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ بھی ہوئی تو محض ہلکی سی پھوار اس کے لیے کافی ہے"۔ (سورۂ بقرہ رکوع ۳۶)۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَ — اگر صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر

اِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲: ۳۷)۔	چھپا کر دو اور غریب لوگوں تک پہنچاؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

سرمایہ دار اگر نیک کام میں صرف بھی کرتا ہے تو با دل ناخواستہ بدتر سے بدتر مال دیتا ہے اور پھر خرچ کر دیتا ہے، اس کی آدھی جان اپنی زبان کے تیروں سے نکال لیتا ہے۔ اسلام اس کے بالکل برعکس یہ سکھاتا ہے کہ اچھا مال خرچ کرو، اور خرچ کرکے احسان نہ جتاؤ، بلکہ اس کی خواہش بھی نہ رکھو کہ کوئی تمہارے سامنے احسان مندی کا اظہار کرے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔ (۲: ۳۷)۔	تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ اموال کو راہ خدا میں صرف کرو، نہ یہ کہ بدتر مال چھانٹ کر اس میں سے دینے لگو۔
لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ (۲: ۳۶)	اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر ملیامیٹ نہ کر دو۔
وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا۔ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶: ۱)	اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے لیے تم کو کھلاتے ہیں، ہم تم سے کسی جزا اور شکریہ کے خواہش مند نہیں ہیں۔

چھوڑیے اس سوال کو کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان دونوں ذہنیتوں میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خالص معاشی نقطۂ نظر ہی سے دیکھ لیجئے کہ فائدے اور نقصان کے ان دونوں نظریوں میں سے کونسا نظریہ زیادہ محکم اور دور رس نتائج کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ پھر جب کہ

منفعت و مضرت کے باب میں اسلام کا نظریہ وہ ہے جو آپ دیکھ چکے ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ اسلام کسی شکل میں بھی سودی کاروبار کو جائز رکھے؟

۴۔ زکوٰۃ اسلام کا اصل مقصد، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، یہ ہے کہ دولت کسی جگہ جمع نہ ہونے پائے۔ جماعت میں جن لوگوں کو اپنی بہتر قابلیت یا خوش قسمتی کی بنا پر ان کی ضروریات سے زیادہ دولت میسر آجائے وہ اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں، بلکہ خرچ کریں، اور ایسے مصارف میں خرچ کریں جن سے دولت کی گردش میں سوسائٹی کے کم نصیب افراد کو بھی کافی حصہ مل جائے۔ اس غرض کے لیے اسلام ایک طرف تو اپنی بلند اخلاقی تعلیم اور ترغیب و ترہیب کے نہایت موثر طریقوں سے فیاضی اور حقیقی امداد باہمی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے تاکہ لوگ خود اپنے میلان طبع ہی سے دولت جمع کرنے کو برا سمجھیں اور اسے خرچ کر دینے کی طرف راغب ہوں۔ دوسری طرف وہ ایسا قانون بناتا ہے کہ جو لوگ فیاضی کی اس تعلیم کے باوجود اپنی افتاد طبع کی وجہ سے روپیہ جوڑنے اور مال سمیٹنے کے خوگر ہوں ان کے مال میں سے بھی کم از کم ایک حصہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ضرور نکلوا لیا جائے۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے، اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کو ارکان اسلام میں شامل کیا گیا ہے، نماز کے بعد سب سے زیادہ اسی کی تاکید کی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص دولت جمع کرتا ہے، اس کی دولت اس کے لیے حلال ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ زکوٰۃ نہ ادا کرے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (۹: ۱۰۳)۔ ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لے اور اس کے ذریعہ سے ان کو پاک اور طاہر کردے۔

لفظ زکوٰۃ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مالدار آدمی کے پاس جو دولت جمع ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں ایک نجاست ہے، ایک ناپاکی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ

ں کا مالک اس میں سے ہر سال کم از کم ڈھائی فی صدی راہ خدا میں نہ خرچ کر دے۔ راہ
دا کیا ہے؟ خدا کی ذات تو بے نیاز ہے، اس کو نہ تمہارا مال پہنچتا ہے نہ وہ اس کا حاجتمند ہے
س کی راہ بس یہی ہے کہ تم خود اپنی قوم کے تنگ حال لوگوں کو خوش حال بنانے کی کوشش کرو
ور ایسے مفید کاموں کو ترقی دو جن کا فائدہ ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے:۔

نَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ — صدقات تو دراصل فقرا اور مساکین کے لیے ہیں
الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ — اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر
فِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ — مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جو اسلام میں نئے
للّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۹: ۶۰) — نئے داخل ہوئے ہوں اور لوگوں کی گردنیں بار اسیری
سے چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے کے لیے اور جہاد کی ضروریات کیلئے اور مسافروں کیلئے

یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے، یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے، یہ ان کا پراویڈنٹ
نڈ ہے، یہ ان کے بیکاروں کا سرمایۂ اعانت (ڈول) ہے، یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں،
یماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ پرورش ہے، اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمان کو فکر
فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادھا اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی
ی مدد کرو۔ کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے۔ تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی
نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گی؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہو گا؟ کوئی آفت ناگہانی
پڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آ گیا، دیوالہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے مخلصی کی
یا سبیل ہو گی؟ سفر میں پیسہ پاس نہ رہا تو کیونکر گذر بسر ہو گی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ
تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت
میں سے ڈھائی فی صدی دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرا لو۔ اس وقت تم کو

اس دولت کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ جب
تم ضرورت مند ہوگے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال
بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔

یہاں پھر سرمایہ داری اور اسلام کے اصول و مناہج میں کلی تضاد نظر آتا ہے۔ سرمایہ
داری کا اقتضاء یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ا
نالیوں کے ذریعہ سے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس تالاب میں جمع ہو جائے۔ اس
اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اول تو جمع ہی نہ ہو، اور اگر جمع ہو بھی تو اس تا
میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو پانی پہنچے اور گرد و پیش
کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔ سرمایہ داری کے نظام میں دولت کا مبادلہ مقید ہے
اور اسلام میں آزاد۔ سرمایہ داری کے تالاب سے پانی لینے کے لیے ناگزیر ہے کہ خاص
آپ کا پانی پہلے سے وہاں موجود ہو، ورنہ آپ ایک قطرۂ آب بھی وہاں سے نہیں لے سکتے
اس کے مقابلہ میں اسلام کے خزانۂ آب کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو
وہ اس میں لا کر ڈال دے اور جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ اس میں سے لے لے۔ ظاہر ہے کہ
دونوں طریقے اپنی اصل اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری پوری ضد ہیں،
ایک ہی نظم معیشت میں ان دونوں کو جمع کرنا درحقیقت اضداد کو جمع کرنا ہے جس کا تصور
کوئی عاقل نہیں کر سکتا۔

۵۔ قانون وراثت اپنی ضروریات پر خرچ کرنے اور راہ خدا میں دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد
بھی جو دولت کسی ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس کو پھیلانے کے لیے پھر ایک تدبیر اسلام نے اختیار
کی ہے، اور وہ اس کا قانون وراثت ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص مال جمع

مرجائے خواہ وہ زیادہ ہو یا کم، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے نزدیک و دور کے تمام رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ پھیلا دیا جائے۔ تقسیم وراثت کا یہ قانون جیسا اسلام میں پایا جاتا ہے کسی اور معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد بھی ایک یا چند خاص اشخاص کے پاس سمٹی رہے مگر اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تاکہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔

۶۔ غنائم جنگ اور اموال مفتوحہ کی تقسیم اس معاملہ میں بھی اسلام نے وہی مقصد پیش نظر رکھا ہے جنگ میں جو مال غنیمت فوجوں کے ہاتھ آئے اس کے متعلق یہ قانون بنایا گیا کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں، چار حصے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں، اور ایک حصہ اس غرض کے لیے رکھ لیا جائے کہ عام قومی مصالح میں صرف ہو۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ	جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت میں ہاتھ آئے اس کا
لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى	پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ	اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔

اللہ اور رسول کے حصہ سے مراد ان اجتماعی اغراض و مصالح کا حصہ ہے جن کی نگرانی اللہ اور رسول کے تحت حکم اسلامی حکومت کے سپرد کی گئی ہے۔ رسول کے رشتہ داروں کا حصہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ زکوٰۃ میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے بعد خمس میں تین طبقوں کا حصہ خصوصیت کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ ایک قوم کے یتیم بچے تاکہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو اور ان کو زندگی کی جد و جہد میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔ دوسرے مساکین جن میں بیوہ عورتیں، اپاہج، معذور، بیمار اور نادار سب شامل ہیں۔ تیسرے ابن السبیل یعنی مسافر۔ اسلام نے اپنی اخلاقی

تعلیم سے لوگوں میں مسافر نوازی کا میلان خاص طور پر پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ زکوٰۃ، صدقات اور غنائم جنگ میں بھی مسافروں کا حق رکھا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اسلامی ممالک میں تجارت، سیاحت، تعلیم اور مطالعہ و مشاہدۂ آثار و احوال کے لیے لوگوں کی نقل و حرکت میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔

جنگ کے نتیجہ میں جو اراضی اور اموال اسلامی حکومت کے ہاتھ آئیں ان کے لیے یہ قانون بنایا گیا کہ ان کو بالکلیہ حکومت کے قبضہ میں رکھا جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی	جو کچھ مال و جائداد اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں کے
فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	باشندوں سے فے میں دلوایا ہے وہ اللہ کا،
وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ	اس کے رسول اور رسول کے رشتہ داروں اور
دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ	یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے
لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ	تاکہ یہ مال صرف تمہارے دولت مندوں ہی
وَاَمْوَالِهِمْ...... وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ	کے درمیان چکر نہ لگاتا رہے...... اور
وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ..... وَالَّذِیْنَ	اس میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے
جَآءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ (۹ : ۵۹)۔	گھر بار اور جائدادوں سے بے دخل کر کے نکال

دیئے گئے ہیں.............. اور ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں ایمان لے آئے تھے...... اور ان آیندہ نسلوں کا بھی حصہ ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف ان مصارف کی توضیح کی گئی ہے جن میں اموال فے کو صرف کیا جائے گا، بلکہ صاف طور پر اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کو اسلام نے نہ صرف اموال فے کی تقسیم میں، بلکہ اپنے پورے معاشی نظام میں پیش نظر رکھا ہے یعنی کی لا یکون

دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ (مال تمہارے مالداروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے) یہ مضمون جس کو قرآن مجید نے ایک چھوٹے سے جامع فقرے میں بیان کر دیا ہے، اسلامی معاشیات کا سنگ بنیاد ہے۔

۷۔ اقتصاد کا حکم: ایک طرف اسلام نے دولت کو تمام افراد قوم میں گردش دینے اور مالداروں کے مال میں ناداروں کو حصہ دار بنانے کا انتظام کیا ہے، جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر شخص کو اپنے خرچ میں اقتصاد اور کفایت شعاری ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے تاکہ افراد اپنے معاشی وسائل سے کام لینے میں افراط یا تفریط کی روش اختیار کر کے تقسیم ثروت کے توازن کو نہ بگاڑیں۔ قرآن مجید کی جامع تعلیم اس باب میں یہ ہے کہ:-

وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ (۱۷ : ۲۹)	نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھ (کہ کھلے ہی نہیں) اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہ جائے۔
وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا۔	اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل برتتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔

اس تعلیم کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص جو کچھ خرچ کرے اپنے معاشی وسائل کی حد میں رہ کر خرچ کرے، نہ اس قدر حد سے تجاوز کر جائے کہ اس کا خرچ اس کی آمدنی سے بڑھ جائے یہاں تک کہ وہ اپنی فضول خرچیوں کے لیے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرے، دوسروں کی کمائی پر ڈاکے مارے، حقیقی ضرورت کے بغیر لوگوں سے قرض لے اور پھر یا تو ان کے قرض ارکھائے یا قرضوں کا بھگتان بھگتنے میں اپنے تمام معاشی وسائل کو صرف کر کے اپنے آپ کو خود اپنے کیے کرتوتوں سے فقراء و مساکین کے

زمرہ میں شامل کردے۔ نہ ایسا بخیل بن جائے کہ اس کے معاشی وسائل جس قدر خرچ کرنے کی اس کو اجازت دیتے ہوں، اتنا بھی نہ خرچ کرے۔ پھر اپنی حد کے اندر رہ کر خرچ کرنے کے بھی معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر وہ اچھی آمدنی رکھتا ہے تو اپنی ساری کمائی صرف اپنے عیش و آرام اور تزک و احتشام پر صرف کر دے، درآں حالیکہ اس کے عزیز، قریب، دوست، ہمسائے مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس قسم کے خود غرضانہ خرچ کو بھی اسلام فضول خرچی ہی شمار کرتا ہے۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ	اور اپنے رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین
السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ	اور مسافر کو۔ فضول خرچی نہ کر۔ فضول خرچ شیطانوں
كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ	کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا
لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا۔ (۱۷: ۳)۔	ناشکرا ہے۔

اسلام نے اس باب میں صرف اخلاقی تعلیم ہی دینے پر اکتفا نہیں کی ہے، بلکہ اس نے بخل اور فضول خرچی کی انتہائی صورتوں کو روکنے کے لیے قوانین بھی بنائے ہیں، اور ایسے تمام طریقوں کا سدباب کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ثروت کے توازن کو بگاڑنے والے ہیں۔ وہ جوئے کو حرام قرار دیتا ہے۔ شراب اور زنا سے روکتا ہے۔ لہو ولعب کی بہت سی مسرفانہ صورتوں کو جن کا لازمی نتیجہ ضیاع وقت اور ضیاع مال ہے، ممنوع قرار دیتا ہے۔ موسیقی کے فطری ذوق کو اس حد تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے جہاں انسان کا انہماک دوسری اخلاقی و روحانی خرابیاں پیدا کرنے کے ساتھ معاشی زندگی میں بھی بدنظمی پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور فی الواقع ہو جاتا ہے۔ جمال کے طبعی رجحان کو بھی وہ حدود کا پابند بناتا ہے۔ قیمتی ملبوسات، زر و جواہر کے زیورات، سونے چاندی کے ظروف، اور تصاویر اور مجسموں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام مروی ہیں ان سب میں دوسرے مصالح کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی پیش نظر ہے کہ جو دولت

تمہارے بہت سے غریب بھائیوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کر سکتی ہے، ان کو زندگی کے مایحتاج فراہم کر کے دے سکتی ہے۔ اسے محض اپنے جسم اور اپنے گھر کی تزئین اور آرائش پر صرف کر دینا جہالت نہیں، شقاوت اور بدترین خود غرضی ہے۔ غرض اخلاقی تعلیم اور قانونی احکام دونوں طریقوں سے اسلام نے انسان کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے وہ ایسی سادہ زندگی ہے کہ اس میں انسان کی ضروریات اور خواہشات کا دائرہ اتنا وسیع ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک اوسط درجہ کی آمدنی میں گذر بسر نہ کر سکتا ہو، اور اسے اپنے دائرہ سے پاؤں نکال کر دوسروں کی کمائیوں میں حصہ لڑانے کی ضرورت پیش آئے، یا اگر وہ اوسط سے زیادہ آمدنی رکھتا ہو تو اپنا تمام مال خود اپنی ذات پر خرچ کر دے، اور اپنے ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکے جو اوسط سے کم آمدنی رکھتے ہوں۔

ایک سوال | یہ ایک مرقع ہے جس میں اسلام کے پورے معاشی نظام کو آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ اب اس تصویر کو دیکھیے اور بار بار دیکھیے اور بتائیے کہ اس میں آپ سود کو کس جگہ کھپا سکتے ہیں؟ اس کی روح کو دیکھیے، اس کی ساخت کو دیکھیے، اس کے رنگ و روغن کو دیکھیے، اس کے اجزاء اور ان کے باہمی ربط و تعلق کو دیکھیے، اس میں جو معنی اور مقصد پوشیدہ ہے اس کو دیکھیے اس میں کہاں سودی لین دین کی گنجایش یا ضرورت ہے؟ کہاں ایسا رخنہ آپ کو نظر آتا ہے جس کو بھرنے کے لیے بینکنگ اور انشورنس اور پراویڈنٹ فنڈ اور سرمایہ داری کے دوسرے اجزاء کی حاجت ہو؟ کس مقام پر آپ مہاجنی اور ساہوکاری کا رنگ بھرنے اور سرمایہ داری کے خط و خال پیدا کرنے کا موقع پاتے ہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہونا چاہیے، تو اس کے بعد دوبارہ ایک غائر نظر اس تصویر پر ڈالیے اور بتائیے کہ اس میں اخلاقی، تمدنی اور معاشی نقطۂ نظر سے کہاں آپ کو نقص نظر آتا ہے؟ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ
خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔ اخلاق اور تمدن کے بلند تر مصالح کو آپ چھوڑنا چاہتے ہیں تو چھوڑ
اگر معیشت ہی انسانی زندگی میں ایک اہم چیز ہے تو خالص معاشی حیثیت سے بھی اسلام کی طرف
ہر اس شخص کو چیلنج ہے جسے علم المعیشت میں نظر بالغ اور ید طولیٰ رکھنے کا گھمنڈ ہو۔ آئے اور اس نظم معیشت
کے اصول و فروع میں کوئی خرابی دکھائے، کوئی کمزوری ثابت کرے، اس میں دلائل اور شواہد
کی قوت سے کوئی ایسی ترمیم پیش کرے جس کے بغیر یہ نظم بجائے خود ناقص ہو، یا اس سے بہتر کوئی
دوسرا نظم معیشت تجویز کرے جس میں فرد اور جماعت کے درمیان حقوق اور مفادات کا اس سے زیادہ
صحیح توازن قائم کیا گیا ہو اور انفرادی و اجتماعی فلاح و بہبود کی یکساں رعایت اس سے زیادہ
بہتر طریقے سے ملحوظ رکھی گئی ہو۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں ہو سکتا
تو کیا عقل و دانش کا یہی تقاضا ہے کہ آپ اول تو اپنی کمزوری سے اس بہترین نظم معیشت کو
چھوڑ کر دنیا کے سب سے بدتر، سب سے زیادہ غلط اور بہ اعتبار نتائج سب سے زیادہ تباہ کن
نظم معیشت کی پیروی کریں، اور پھر اس پر نادم بھی نہ ہوں، اپنے ضمیر پر گناہ کا بار بھی نہ رہنے دیں
اور اس گناہ کو صواب، اس فسق و عصیان کو طاعت قرار دینے کے لیے آیات قرآنی و احادیث
نبوی میں باطل تاویلیں کریں، اور اس شیطانی نظم معیشت کے تمام فاسد ارکان کو نے کر اسلام
کے پاک اور مطہر نظام معاشی میں پیوست کرنے کی کوشش کریں، بلالحاظ اس کے کہ اسلام کے اصول
اور اس کی روح اور اس کے مزاج سے ان چیزوں کو کتنی ہی شدید نامناسبت ہو۔ پہلے
تو آپ حکیم کے بتائے ہوئے نسخے کو پھینک دیتے ہیں، اس کی تدابیر حفظ صحت سے اعراض
انکار کرتے ہیں، جو پرہیز اس نے تجویز کیا ہے اس پر عمل نہیں کرتے پھر جب مرض بڑھتا ہے اور
موت سامنے نظر آتی ہے تو اسی حکیم سے کہتے ہیں کہ جب عطائی کے نسخوں نے مجھے بیمار ڈالا۔

اسی کے نسخوں کی توثیق کردے، جن بدپرہیزیوں نے مجھے جاں بلب کیا ہے انہی کی اجازت دے دے جس چیز کو تونے زہر کہا تھا اسی کو کہدے کہ یہ تریاق ہے! آخر اس بوالعجبی کی انتہا بھی ؟

سود کے متعلق اسلامی احکام | یہ ہماری بحث کا سلبی پہلو تھا۔ اب ہم ایجابی حیثیت سے یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ "سود" کیا شئے ہے، اس کے حدود کیا ہیں، اسلام میں اس کی ممانعت کے جو احکام وارد ہوئے ہیں وہ کن کن معاملات سے متعلق ہیں، اور اسلام اس کو مٹاکر انسان کے معاشی معاملات کو کس قاعدہ پر چلانا چاہتا ہے۔

ربوا کا مفہوم | قرآن مجید میں سود کے لیے "ربوا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مادّہ "ربو" ہے جس کے معنی ہیں زیادت، نمو، بڑھوتری، اور چڑھنے کا اعتبار ہے۔ رَبَا: بڑھا اور زیادہ ہوا۔ رَبَا فلان الرابیۃ: وہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ رَبَا فُلانٌ السویقَ: اس نے ستو پر پانی ڈالا اور ستو پھول گیا۔ ربا فی حجرہ: اس نے فلاں کی آغوش میں نشونما پایا۔ اربی الشیئَ = چیز کو بڑھایا۔ ربوۃ: بلندی۔ رابیہ: وہ زمین جو عام سطح ارض سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اس مادّے کے مشتقات آئے ہیں، سب جگہ زیادت اور علو اور نمو کا مفہوم پایا جاتا ہے، مثلاً:۔

فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ (۲۲:۱)	جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ لہلہا اٹھی اور برگ و بار لانے لگی۔
یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ	اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے
فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳:۲)۔	جھاگ جو اوپر ابھر آیا تھا اس کو سیلاب بہالے گیا۔
فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِیَةً (۶۹:۱)	اس نے ان کو پھر زیادہ سختی کے ساتھ پکڑا۔
اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّةٍ (۱۶:۱۳)	تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

وَاٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ (۲۳:۳) ہم نے مریم اور مسیح کو ایک اونچی جگہ پر پناہ دی

اسی مادے سے "رِبٰو" ہے اور اس سے مراد مال کی زیادتی، اور اس کا اصل ... بڑھ جا

چنانچہ اس معنی کی تصریح بھی خود قرآن میں کر دی گئی ہے۔

وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا ... وَاِنْ اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے

تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ (۲:۳۸) چھوڑ دو ..... اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہیں

راس المال (یعنی اصل رقم) لینے کا حق ہے

وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا۟ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ اور جو سود تم نے دیا ہے تاکہ لوگوں کے اموا

فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ (۳۰:۴) تو اللہ کے نزدیک اس سے مال نہیں بڑھتا

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اصل رقم پر جو زیادتی بھی ہو گی وہ "ربو" کہلائے

لیکن قرآن مجید نے مطلق ہر زیادتی کو حرام نہیں کیا ہے۔ زیادتی تو تجارت میں بھی ہو

قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے، اسی لیے وہ

"اَلرِّبٰوا" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملہ کی اس

نوعیت کو اسی اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا، مگر وہ "الربٰو" کو بھی ایک قسم کی بیع سمجھ

جس طرح آج کل اس کو سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے آکر بتایا کہ راس المال میں جو زیادتی

سے ہوتی ہے وہ اس زیادتی سے مختلف ہے جو "الربٰو" سے ہوا کرتی ہے۔ پہلی قسم کی زیاد

ہے اور دوسری قسم کی زیادتی حرام:-

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ سود خواروں کا یہ حشر اس لیے ہو گا کہ انہو

الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کہا کہ بیع بھی "الربٰو" کے مانند ہے، حالانکہ اللہ

(۲:۳۸) حلال اور الربٰو کو حرام کیا۔

چونکہ "الربوٰ" ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا۔ اور وہ معلوم و مشہور تھی، اس لیے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی گئی، اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے اُسے چھوڑ دو۔

جاہلیت کا ربوٰ | زمانۂ جاہلیت میں "الربوٰ" کا اطلاق جس طرز معاملہ پر ہوتا تھا۔ اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں۔

قتادہ کہتے ہیں جاہلیت کا ربوٰ یہ تھا کہ ایک شخص، ایک شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گذر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔

مجاہد کہتے ہیں جاہلیت کا ربوٰ یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں اتنا زیادہ دوں گا۔ (ابن جریر جلد سوم ص ۶۲)

ابوبکر حصاص کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت جب ایک دوسرے سے قرض لیتے تو باہم طے ہو جاتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔ (احکام القرآن جلد اول)۔

امام رازی کی تحقیق میں اہل جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معین مدت کے لیے روپیہ دیتے اور اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کے لیے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا (تفسیر کبیر جلد دوم ص ۳۵۱)

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں، انہی کو اہل عرب اپنی زبان میں "الربوٰ" کہتے تھے، اور یہی وہ چیز تھی جس کی تحریم کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا۔

بیع اور ربوٰ میں اصولی فرق | اب اس امر پر غور کیجئے کہ بیع اور ربوٰ میں اصولی فرق کیا ہے، ربوٰ کی خصوصیات کیا ہیں جن کی وجہ سے اس کی نوعیت بیع سے مختلف ہو جاتی ہے اور اسلام نے کس بنا پر اس کو منع کیا ہے۔

بیع کا اطلاق جس معاملہ پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بائع ایک شے کو فروخت کے لیے پیش کرتا ہے، مشتری اور بائع کے درمیان اس شئے کی ایک قیمت قرار پاتی ہے، اور اس قیمت کے معاوضہ میں مشتری اس شئے کو لے لیتا ہے۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو بائع نے وہ چیز خود محنت کر کے اور اپنا مال اس پر صرف کر کے پیدا کی ہے، یا وہ اس کو کسی دوسرے سے خرید کر لایا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے راس المال پر جو اس نے خریدنے یا مہیا کرنے میں صرف کیا تھا، اپنے حق المحنت کا اضافہ کرتا ہے اور یہی اس کا منافع ہے۔

اس کے مقابلہ میں ربوٰ یہ ہے کہ ایک شخص اپنا راس المال ایک دوسرے شخص کو دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے راس المال پر زائد لوں گا۔ اس معاملہ میں راس المال کے مقابل راس المال ہے، اور مہلت کے مقابلہ میں وہ زائد رقم ہے جس کی تعیین پہلے بطور ایک شرط معاملہ کے کر لی جاتی ہے۔ اسی زائد رقم کا نام سود یا ربوٰ ہے جو کسی خاص مال یا شئے کا معاوضہ نہیں بلکہ محض مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ اگر بیع میں بھی قیمت قرار پا چکی ہو، اور پھر مشتری سے یہ شرط طے کی جائے کہ ادائے قیمت میں مثلاً ایک مہینے کی دیر ہونے پر قیمت میں اتنا اضافہ کر دیا جائیگا تو یہ زیادت، سود کی تعریف میں آ جائے گی۔

پس سود کی تعریف یہ قرار پائی کہ راس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعیین کے ساتھ لی جائے وہ "سود" ہے۔ راس المال پر اضافہ، اضافہ کی تعیین مدت کے لحاظ سے کیا جانا، اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا، یہ تین اجزائے ترکیبی ہیں جن سے

سود بنتا ہے، اور ہر وہ معاملہ جس میں یہ تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں، ایک سودی معاملہ ہے۔

بیع اور سود میں اصولی فرق یہ ہے کہ:۔

(۱) بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ مبادلہ ہوتا ہے کیونکہ مشتری اس چیز سے تمتع حاصل کرتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے، اور بائع اپنی اس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا مبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لیتا ہے جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے راس المال اپنی شخصی ضروریات پر خرچ کرنے کی غرض سے لیا ہے تب تو مہلت اس کے لیے نافع نہیں بلکہ یقیناً نقصان دہ ہوگی اور اگر اس نے تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کی غرض سے لیا ہے تو مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ مال دینے والا تو بہر حال اس سے ایک مقرر مقدار لیتا ہے، خواہ اس کو اپنے کاروبار میں فائدہ ہو یا نقصان۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) بیع و شرا میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ صرف ایک ہی بار لیتا ہے لیکن سود کے معاملہ میں راس المال دینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی تمتع حاصل کیا ہو، بہر طور اس کا تمتع ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر اس تمتع کے معاوضہ میں دائن جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی تمام کمائی، اس کے

تمام وسائل ثروت، اس کے تمام مایحتاج پر محیط ہو جائے اور پھر بھی اس کا سلسلہ ختم نہ ہو۔
(۳) بیع و شرا میں شئے اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایہ میں اصل شئے جس کا منافع دیا جاتا ہے صرف نہیں ہوتی بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ کرایہ دار کو واپس دی جاتی ہے لیکن سود کے معاملہ میں مدیون راس المال لے کر صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ چیز دوبارہ حاصل کر کے سود کے اضافہ کے ساتھ واپس دینی پڑتی ہے۔
(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرفِ کمال کے اس کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی "شریک" کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے، اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع، اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔
علت تحریم: یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ ان وجوہ کے علاوہ حرمت سود کی دوسری وجوہ بھی ہیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ بخل خود غرضی شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے وہ افراد قوم کے درمیان ہمدردی و امداد باہمی کے تعلقات کو قطع کرتا ہے۔ وہ لوگوں میں روپیہ جمع کرنے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کی ترقی پر لگانے کا میلان پیدا کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی میں دولت کی آزادانہ گردش کو روکتا ہے بلکہ دولت کی گردش کا رخ الٹ کر ناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے اس کی وجہ سے جمہور کی دولت سمٹ کر ایک طبقہ کے پاس اکھٹی ہو جاتی ہے، اور یہ چیز

آخر کار پوری سوسائٹی کے لیے بربادی کی موجب ہوتی ہے، جیسا کہ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ سود کے یہ تمام اثرات ناقابل انکار ہیں، اور جب یہ ناقابل انکار ہیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جس نقشے پر انسان کی اخلاقی تربیت، تمدنی شیرازہ بندی اور معاشی تنظیم کرنا چاہتا ہے اس کے ہر ہر جزء سے سود کلی منافات رکھتا ہے، اور سودی کاروبار کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور بظاہر معصوم سے معصوم صورت بھی اس پورے نقشے کو خراب کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے اس قدر سخت الفاظ کے ساتھ سود کو بند کرنے کا حکم دیا کہ :-

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ (۲ : ۳۸)	اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا لوگوں پر باقی ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔

حرمت سود کی شدت | قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی ہیں، لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سود کو روکنے کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ آپ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائیگا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑیگی۔ بنو مغیرہ کے سود خوار عرب میں مشہور تھے۔ فتح مکہ کے بعد حضور نے ان کی تمام سودی رقمیں باطل کر دیں اور اپنے عامل مکہ کو لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔ خود حضور کے چچا حضرت عباس ایک بڑے مہاجن تھے۔ حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ساقط کیئے جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا

سود ساقط کرتا ہوں۔ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ سود لینے والے اور دینے والے اور اس کی دستاویز کے کاتب، اور اس پر گواہی دینے والے، سب پر اللہ کی لعنت!

اِن تمام احکام کا منشا یہ نہ تھا کہ محض سود کی ایک خاص قسم یعنی یوژری (مہاجنی سود) کو بند کیا جائے، اور اس کے سوا تمام اقسام کے سودوں کا دروازہ کھلا رہے، بلکہ ان سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ نظام تمدن اور سرمایہ دارانہ نظم معیشت کا کلی استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی ہو، خودغرضی کے بجائے ہمدردی اور امداد باہمی ہو، سود کے بجائے زکوٰۃ ہو، بینک کی جگہ قومی بیت المال ہو، اور وہ حالات ہی سرے سے پیش نہ آئیں جن سے مقابلہ کرنے کے لیے کوآپریٹیو سوسائٹیوں اور انشورنس کمپنیوں اور پراویڈنٹ فنڈس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اب یہ ہماری اپنی حماقت ہے، کمزوری ہے، بدقسمتی ہے کہ اسلام کا یہ اخلاقی تمدنی اور معاشی نظام بالکل درہم برہم ہوگیا، سرمایہ داری ہم پر مسلط ہوگئی، زکوٰۃ خیرات اور صدقات کی تحصیل اور صحیح مصارف میں ان کو صرف کرنے کے لیے کوئی ادارہ ہم میں باقی نہ رہا، ہمارے مالدار خودغرض اور نفس پرست ہوگئے، ہمارے ناداروں کے لیے کوئی سہارا نہ رہا، ہم نے اسلامی اخلاق کو کھودیا اور اس کی حدود کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا، شراب، جوے اور زناکاری میں ہم مبتلا ہوئے، عیش پسندی اور اسراف کی بدترین صفات ہم میں پیدا ہوگئیں، فضول خرچی کے جملہ لوازم کو ہم نے اپنی ضروریات زندگی میں داخل کرلیا، سودی قرض کے بغیر ہمارے لیے شادیاں کرنا، موٹریں خریدنا، بنگلے بنوانا، تزئین و آرائش اور عیش و عشرت کے سامان فراہم کرنا محال ہوگیا، امداد باہمی کی اسپرٹ اور عملی تنظیم یکسر مفقود ہوگئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے معاشی حالات متزلزل ہوگئے، ہم میں سے ہر شخص کی زندگی کلیۃً اپنے ہی معاشی وسائل

پر منحصر ہو گئی اور وہ مجبور ہو گیا کہ اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر سرمایہ داری کے اصولوں کی پیروی کرے بینک میں روپیہ جمع کرائے، انشورنس کمپنی میں بیمہ کرائے، کوآپریٹیو سوسائٹی کا رکن بنے اور بوقت ضرورت سرمایہ داروں سے سود پر قرض لے کے اپنی حاجت رفع کرے۔ بلاشبہ آج یہ سب کچھ ہمارے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ مگر کیا ان حالات کو پیدا کرنے کی ذمہ داری اسلام پر ہے؟ اگر نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے، اور ہم ان حالات میں صرف اس وجہ سے مبتلا ہوئے ہیں کہ جس معاشی نظام کی تعلیم اسلام نے ہم کو دی تھی اس کے ارکان میں سے ایک ایک کو ہم نے منہدم کر ڈالا ہے تو کیا یہ جائز ہو گا کہ اسلامی قانون کی خلاف ورزی کر کے جن معاشی مشکلات کو ہم نے خود اپنے لیے پیدا کیا ہے ان کا حل ہم اسلام ہی کے ایک اور قانون کی خلاف ورزی میں تلاش کریں، اور پھر اسلام ہی سے مطالبہ کریں کہ وہ اس خلاف ورزی قانون کی ہم کو اجازت دے دے؟ آخر ہم کو کس نے زکوٰۃ کی تنظیم سے روکا ہے؟ امداد باہمی کی اسلامی تعلیم پر عامل ہونے سے کون ہم کو باز رکھتا ہے؟ اسلام کے قانون وراثت پر عمل کرنے میں کون سدِ راہ ہے؟ سادگی، پرہیزگاری اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرنے میں کونسا امر مانع ہے؟ کون ہم کو مجبور کر رہا ہے کہ اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائیں اور مغربی تہذیب کے مسرفانہ لوازم کو اپنی ضروریات زندگی میں داخل کر لیں؟ کس نے ہم کو پابند کیا ہے کہ کسب معاش کے جائز ذرائع اختیار کرنے کے بجائے، سرمایہ دار بننے کی ہوس میں حرام خوری کے طریقے اختیار کریں؟ کس نے ہمارے مالداروں کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اپنے رشتہ داروں، ہمسایوں، دوستوں، اپنی قوم کی بیواؤں یتیموں، معذوروں اور محتاجوں کی مدد کرنے سے روکا اور یورپ، امریکہ اور جاپان کے کارخانہ داروں کی طرف اپنی دولت پھینکنے پر مجبور کیا ہے؟ کس نے ہمارے متوسط اور قلیل المعاش

لوگوں پر جبر کیا ہے کہ اپنی شادی اور غمی کی رسموں میں اپنی حد سے بڑھ کر خرچ کریں، امیروں کی ریس کرنے میں اپنے معاشی وسائل سے بڑھ کر شان اور ٹھاٹھ جمائیں اور اپنی فضول خرچیوں کے لیے سودی قرض لیں؟ یہ سب افعال جو ہم اپنے اختیار سے کر رہے ہیں اسلام کی نگاہ میں جرائم ہیں۔ اگر آج ہم ان جرائم سے باز آجائیں اور اسلام کے معاشی نظام کو پھر سے قائم کریں تو ہماری وہ تمام معاشی مشکلات دور ہو سکتی ہیں جو ہم کو ایک دوسرے جرم یعنی سود کھانے اور کھلانے کے جرم پر مجبور کر رہی ہیں۔ مگر جب ہم ان جرائم سے باز نہیں آتے تو اس جرم کو بھی جرم سمجھ ہی کر کیوں نہ کریں جو ان جرائم کے نتیجے کے طور پر پیدا ہوا ہے؟ جس شخص نے خود پاک اور طیب غذا کو چھوڑ کر اپنے آپ کو ایسے مقام پر پہنچا یا ہے جہاں نجاست کے سوا کچھ کھانے کو نہیں ملتا، وہ پیٹ بھر کر نجاست کھائے اور کھلائے۔ مگر وہ اس نجاست کو پاک اور طیب قرار دینے پر کیوں اصرار کرتا ہے؟

پس جیسا کہ ہم ابتدا میں لکھ آئے ہیں سود لینے یا نہ لینے کی بحث تو ایک بعد کی بحث ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو یہ طے کرنا چاہیے کہ اسلام کے معاشی نظام کی پیروی کرنی ہے یا سرمایہ داری نظام کی؟ اگر آپ پہلی صورت کو اختیار کرتے ہیں تو اس میں سودی لین دین کی ضرورت ہے نہ گنجائش۔ کیونکہ اشتراکی روس کی طرح اسلامی معیشت کا تمام کاروبار ان اداروں کی بغیر چلتا ہے جو سودی لین دین کرنے والے ہیں، اور یہ نظام ان لوگوں کو مجرم سمجھتا ہے جو سودی کاروبار کر کے اس کے نظم کو بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ برعکس اس کے اگر آپ دوسری صورت اختیار کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا سرمایہ دارانہ نظم معیشت کو اختیار کرنا بحیثیت مجموعی، اسلام کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ لہٰذا اس بغاوت کی حالت میں آپ کو اسلام کے معاشی قوانین میں سے وہ تمام قانون توڑنے پڑیں گے جو اصول سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ اب آپ کی خواہش یہ ہے کہ آپ قوانین اسلامی کی خلاف ورزی بھی کریں، نظام سرمایہ داری کی پیروی بھی کریں اور اسلام کی نظر میں گنہگار بھی نہ ہوں۔ درحقیقت یہ معنی رکھتی ہے کہ اسلام کی پیروی چھوڑ کر آپ خود اسلام کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں، اور آپ کی خواہش یہ ہے کہ وہ محض آپ کو اپنے دائرہ میں رکھنے کی خاطر اپنے اصول کو بدل کر سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے اصول اختیار کرے۔ (باقی)

ایک حدیث پر اعتراض اور اس کا جواب

جناب احمد عبدالعزیز صاحب استاذ معاشیات، ورنگل کالج، ہنمکنڈہ اپنے ایک عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"میں نے تجرید البخاری مؤلفہ علامہ حسین بن مبارک متوفی ۹۰۰ھ کے اردو ترجمہ میں جو فیروز الدین صاحب نے لاہور سے شائع کیا ہے، صفحہ (۱۰۱) پر ایک حدیث کا مطالعہ کیا ہے جو حسب ذیل ہے:-

حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے پاس ایک ہی ساعت کے اندر رات اور دن میں دورہ کر لیتے تھے اور وہ گیارہ تھیں۔ (ایک روایت میں آیا ہے کہ نو تھیں) حضرت انس سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ان سب کی طاقت رکھتے تھے۔ وہ بولے ہم تو کہا کرتے تھے کہ آپ کو تیس مردوں کی قوت دی گئی ہے۔

جناب والا سے میں توقع رکھتا ہوں کہ براہ کرم مذکورۂ بالا حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں۔ کیا یہ امر واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی ساعت کے اندر اپنی جملہ ازواج مطہرات سے مقاربت کی ہے؟ اور اگر مقاربت کی ہے تو حضرت انس کو کس طرح اس کا علم ہو گیا؟ کیا حضور نے حضرت انس سے اس مقاربت کا ذکر فرمایا؟ یا ازواج مطہرات میں سے کسی نے اس ازدواجی تعلق کا راز فاش کیا؟ یا حضرت انس کو آنحضرت کی خلوت کا ہر وقت علم ہوتا رہتا تھا؟ یا حضرت انس خود اس خلوت کا علم حاصل کرنے کی کھوج میں لگے رہتے تھے؟ آخر حضور کو اس قدر عجلت مقاربت کی کیا ضرورت درپیش تھی جب کہ آپ کی

بدیاں مقرر تھیں؟ اور کیا بوقت و اداس قدر کثرت مقاربت سے حضور کی صحت و توانائی پر کچھ بھی اثر نہ پڑتا تھا؟

براہ کرم مندرجہ بالا استفسارات کے جوابات عنایت فرما کر ممنون فرمایا جائے۔"

اس سوال کا جواب خط کے ذریعہ سے دیا جا سکتا تھا۔ مگر حال میں دیوبند کے ایک فاضل بزرگ نے اپنے ایک مضمون میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کثرت ازواج پر مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے اس حدیث سے استدلال کیا تھا، اور اس پر شمالی ہند کے بعض رسالوں میں بہت تلخ اور حد تہذیب و شرافت سے گذری ہوئی نکتہ چینی کی گئی تھی، اس لیے ہم اس سوال کو رسالے میں درج کر کے اس کا جواب دے رہے ہیں تاکہ اگر دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی اس پر کچھ شکوک ہوں تو ان کا ازالہ ہو جائے۔

یہ حدیث بخاری میں دو جگہ نقل کی گئی ہے۔ ایک کتاب الغسل میں باب اذا جامع ثم عاد ومن دار علی نسائہ فی غسل واحد۔ کے تحت۔ دوسرے کتاب النکاح میں باب من طاف علی نسائہ فی غسل واحد کے تحت پہلے باب کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدور علی نسائہ فی الساعۃ الواحدۃ من اللیل والنھار وھن احدی عشرۃ۔ قال قلت لانس أو کان یطیقہ، قال کنا نتحدث انہ اعطی قوۃ ثلاثین۔	نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات اور دن میں اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی وقت میں ہو آتے تھے، اور وہ گیارہ بیویاں تھیں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے انس سے کہا کیا آپ میں اتنی طاقت تھی؟ انس نے جواب دیا ہم آپس میں کہا کرتے تھے کہ حضور کو ۳۰ مردوں کی قوت عطا کی گئی ہے۔

دوسرے باب میں سعید بن ابی عروبہ، قتادہ کے حوالہ سے حضرت انس کی یہ حدیث بیان

کرتے ہیں کہ :-

ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم کان یطوف علی نسائہ فی اللیلۃ الواحدۃ ولہ یومئذ تسع نسوۃ -

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کے پاس ایک ہی رات میں چکر لگا لیتے تھے اور اس زمانہ میں آپ کی نو بیویاں تھیں۔

دونوں حدیثوں سے مقصود صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد مرتبہ مباشرت کرے تو ہر بار غسل کرنا لازم نہیں ہے، بلکہ سب کے لیے ایک ہی غسل کافی ہو سکتا ہے۔ رہا ازواج مطہرات کا نو یا گیارہ ہونا اور حضور کا ان سب کے پاس شب باش ہونے کی طاقت رکھنا، تو اس کا ذکر محض ضمناً آگیا ہے۔ اسی لیے امام بخاری نے دونوں جگہ ترجمۃ الباب میں غسلِ واحد لکھا ہے۔

نسائی نے بھی باب اتیان النساء قبل احداث الغسل میں حضرت انس سے اسی مضمون کی دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک میں طاف علی نسائہ فی لیلۃ بغسل واحد ہے۔ یعنی ایک رات آپ نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور صرف ایک مرتبہ غسل فرمایا۔ دوسری حدیث میں ہے کان یطوف علی نسائہ فی غسل واحد۔ یعنی آپ اپنی بیویوں کے پاس ہو آتے تھے اور پھر ایک بار غسل فرماتے تھے۔

ابوداؤد نے ایک حدیث باب فی الجنب یعود میں نقل کی ہے جس میں طاف ذات یوم علی نسائہ فی غسل واحد ہے یعنی ایک روز آپ نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور پھر ایک مرتبہ غسل کیا۔ اس کے بعد حضرت ابو رافع سے یہ حدیث نقل کی ہے:-

طاف ذات یوم علی نسائہ یغتسل عند ھذا وعند ھذہ۔ قال فقلت یا رسول اللہ الا تجعلہ غسلاً واحداً

ایک روز حضور نے اپنی بیویوں کے پاس چکر لگایا اور ہر ایک کے ہاں الگ غسل کیا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ ایک ہی غسل کیوں نہیں فرماتے۔ حضور نے

قال ھٰذا ازکی و اطیب و اطھر۔ فرمایا یہ زیادہ پاکیزہ اور صاف ستھرا طریقہ ہے۔

پھر ایک حدیث حضرت ابو سعید خدری سے نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

اذا اتی احدکم اھلہ ثم اراد ان یعاود فلیتوضأ بینھما وضوءً — جو شخص تم میں سے اپنی بیوی کے پاس جائے پھر دوبارہ مقاربت کرنا چاہے تو دونوں مقاربتوں کے درمیان وضو کرے۔

یہی حدیث ترمذی نے بھی ابواب الطہارت میں نقل کی ہے۔ ان تینوں قسم کی حدیثوں کو جمع کرنے سے مسئلہ یہ نکلتا ہے کہ اعادۂ مقاربت کی صورت میں زیادہ پاکیزہ طریقہ یہ ہے کہ ہر بار جدا گانہ غسل کیا جائے اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم وضو کر لیا جائے لیکن ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔ دو یا زائد مقاربتوں کے بعد صرف ایک مرتبہ غسل کر لینے سے بھی شرط طہارت پوری ہو جاتی ہے۔

اب شبہات کو دل میں جگہ دینے سے قبل حسب ذیل امور کو ذہن نشین کر لیجئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جو تہذیب و تمدن کے ابتدائی درجہ میں تھی۔ آپ کے سپرد اللہ تعالیٰ نے صرف یہی کام نہیں کیا تھا کہ ان کو عقائد صحیحہ کی تعلیم دیں بلکہ یہ خدمت بھی آپ کے سپرد تھی کہ ان کو انسان بنائیں، شائستہ اخلاق، پاکیزہ معاشرت، مہذب تمدن، نیک معاملات اور عمدہ آداب کی تعلیم دیں، اور ہر حیثیت سے ان کی زندگی سنوار دیں۔ یہ مقصد محض وعظ و تلقین اور قیل و قال سے پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ ۲۳ سال کی مختصر مدت حیات میں ایک پوری قوم کو وحشت کے اسفل مقام سے اٹھا کر تہذیب کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا دینا اس طرح ممکن نہ تھا کہ محض چند گنے بندھے اوقات میں ان کو بلا کر کچھ زبانی ہدایات دیدی جاتیں۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ آپ انسانیت کا ایک مکمل نمونہ بن کر اپنی پوری زندگی کو ان کے لیے سراسر ہدایت اور مجسم رہنمائی بنا دیتے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا۔ یہ آپ کا انتہائی ایثار تھا کہ آپ نے

اپنی حیات طیبہ کے ہر شعبے کو قوم کی تعلیم کے لیے پبلک کر دیا، اور اس میں کسی چیز کو بھی پرائیویٹ نہ رکھا، حتیٰ کہ ان معاملات کو بھی جنھیں ہر شخص پرائیویٹ رکھنا چاہتا ہے۔ آپ نے لوگوں کو اجازت دی کہ وہ رفتار میں گفتار میں نشست و برخاست میں سونے اور جاگنے میں خانگی معاشرت میں، عبادات اور معاملات میں، غرض ہر چیز میں آپ کے عمل کو دیکھیں، دیکھنے والوں سے سنیں، جاننے والوں سے پوچھیں، خود آپ سے دریافت کریں اور اپنی زندگی کو اس مثالی زندگی کے نمونے پر ڈھالنے کی کوشش کریں۔ آپ کی ازواج مطہرات کو بھی عام اجازت تھی کہ خلوت میں آپ کا جو کچھ طرز عمل دیکھیں اس سے عورتوں اور مردوں سب کو آگاہ کریں، تاکہ لوگوں کی صرف ظاہری زندگی ہی نہیں، باطنی اور مخفی زندگی بھی تہذیب و شائستگی اور طہارت و نفاست کے زیور سے آراستہ ہو جائے۔ اسی غرض کے لیے ازواج مطہرات نے حضور کی پرائیویٹ زندگی کے ایسے معاملات بھی لوگوں کو بتانے میں دریغ نہ کیا جن کو عام طور پر میاں اور بیوی کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور نہ کوئی گوارا کرتا ہے کہ لوگ اس کو جانیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لیے ازواج مطہرات اور افراد امت کے درمیان ماں اور بیٹوں کا رشتہ قائم کیا، اور ان کو افراد امت کے لیے حرام کر دیا، تاکہ مائیں اپنے بیٹوں سے کھل کر بات چیت کریں، اور ان کے روحانی باپ کی حرکات و سکنات میں سے ہر ہر چیز کو ان کے سامنے تقلید و تاسی کے لیے، حدود حلال و حرام کی واقفیت کے لیے، پاک اور ناپاک، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز کے لیے بیان کریں۔ پھر باوجودیکہ حضور طبعاً انتہا درجہ کے شرمیلے اور حیادار تھے، آپ نے تعلیم کے لیے حیا کے پردے کو اٹھا دیا اور ہر قسم کے معاملات میں اپنی روحانی اولاد کو، جن میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے خود ہدایات دیں، ان کو اجازت دی کہ جو کچھ چاہیں پوچھیں، اور ان کو موقع دیا کہ آپ کے طرز عمل کو دیکھ کر معلوم کریں کہ ایک پاکیزہ اور مہذب اور شائستہ زندگی کیسی ہوتی ہے۔

اسی تعلیم کا ایک شعبہ طہارت جسم و لباس بھی تھا۔ اہل عرب تو خیر وحشی تھے آج جن تو
کو تہذیب و تمدن کے آسمان پر متمکن ہونے کا دعویٰ ہے ان کا حال آپ کیا دیکھ رہے ہیں۔ ا
بعد منہ کی صفائی سے ناواقف۔ رفع حاجت کے بعد جسم کی طہارت سے نابلد، کھڑے کھڑے پیشا
کیا اور پتلون کے بٹن لگا لیے، کموڈ پر سے اٹھے اور ٹب میں اتر گئے۔ پھر تعلقات مرد و زن
ان کی ناشائستگی اور بے حیائی اور ناپاکی اس حد سے گذری ہوئی ہے کہ شرفا کی صحبت میں
ذکر بھی کیا جا سکے۔ یہ حال جب ان ترقی یافتہ قوموں کا ہے تو اُس قوم کا کیا حال ہوگا جو
کے بالکل ابتدائی درجہ میں تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے نہ صرف ا
نفوس کا تزکیہ فرمایا، بلکہ اُن کو طہارت جسم و لباس کے طریقے بھی سکھائے، ان میں پاکیزگ
نفیس ذوق پیدا کیا، ان میں نجاست اور طہارت کی تمیز پیدا کی، زندگی بسر کرنے کے گ
گھناونے ناشائستہ اور بیہودہ طریقوں کو موقوف کر کے اپنے قول اور عمل سے ان کے م
اور ان کی عورتوں کو صفائی نفاست اور نظافت کے باقاعدہ آداب کا خوگر بنایا
لیے ناگزیر تھا کہ حضور خود اپنی پرائیویٹ زندگی کو ایک حد تک ان کے سامنے بے پر
تاکہ وہ ان تمام آداب کو سیکھیں اور ان کی پیروی کریں۔ لوگ حدیث کی کتابوں میں
المومنین اور دوسرے صحابہ و صحابیات کی زبان سے، خود حضور کی زبان سے اس قسم کے مسائل پڑھتے
جز دیتے ہیں کہ یہ باتیں خلاف حیا ہیں لیکن وہ غور کریں تو ان کو معلوم ہو کہ درحقیقت
بہت بڑا ایثار تھا جو حضور نے محض اپنی امت کی خاطر گوارا فرمایا۔ جس ذات پاک کی
یہ عالم تھا کہ اس کی شریک زندگی تک کو کبھی اُسے برہنہ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا حتیٰ
کبھی تنہائی میں بھی برہنہ ہونے کو پسند نہ کیا اس نے محض اپنی امت کو شائستگی کی تعلیم
کے لیے اپنی بیویوں کو اجازت دی کہ اس کی پرائیویٹ زندگی کے مخفی سے مخفی واقعا

پبلک کر دیں اور اپنے خدامِ خاص کو موقع دیا کہ جہاں تک اندرونی حالات سے واقف ہو سکتے ہوں واقف ہوں، اور لوگوں تک ان حالات کو پہنچائیں۔ کیا یہ کوئی معمولی ایثار تھا؟ اور یہ اسی ایثار کا نتیجہ ہے کہ نہ صرف اہلِ عرب بلکہ دنیا کے کروڑہا کروڑ مسلمانوں کی پرائیویٹ زندگی، صفائی جسم اور طہارتِ لباس اور پاکیزگیِ اطوار، اور صنفی معاملات میں شائستگی و لطافت کے ایک عام ضابطہ کی پابند ہو گئی۔ ورنہ اگر ان معاملات کو محض شخصی ذوق اور تمیز پر چھوڑ دیا جاتا تو ہمارے اکثر افراد کا حال اپنی زندگی کے مخفی شعبوں میں جانوروں سے ملتا جلتا ہوتا، کیونکہ ان شعبوں کے متعلق انسان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام آج بھی دنیا میں کہیں نہیں ہے۔

یہ تو ان شبہات کا جواب ہے جو لائق مستفسر نے حضور کی پرائیویٹ زندگی کے اسرار سے حضرت انس کی واقفیت پر ظاہر کئے ہیں۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

جتنی حدیثیں ہم نے ابتدا میں نقل کی ہیں۔ ان میں سے بعض میں کَانَ یطوف یا کان یدور کے الفاظ آئے ہیں جن کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار حضور کی ازدواجی زندگی میں ایسا بھی ہوا ہے کہ آپ ایک رات میں تمام ازواج مطہرات کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔ رہی یہ بات کہ آپ نے سب کے ساتھ ہم بستری بھی فرمائی تھی تو حدیث کے الفاظ اس باب میں صریح نہیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت انس نے ایسا قیاس کیا ہوگا جو ضروری نہیں کہ صحیح ہو۔ حضرت انس جب حضور کی خدمت میں داخل ہوئے ہیں تو دس سال کے بچے تھے، اور آپ کے وصال کے وقت ابھی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ اس عمر کے ایک نوجوان کے قیاسات ان معاملات میں چنداں قابلِ اعتبار نہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان کا اصل مقصد محض ایک

فقہی مسئلہ کی تحقیق تھا، نہ کہ نفس معاملہ کی کھوج لگانا۔ پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حضور کی ازواج مطہرات میں سے ایک یعنی زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا ۳ھ میں حضور سے بیاہی گئیں اور صرف دو تین مہینے زندہ رہ کر انتقال فرما گئیں۔ دوسری بیوی حضرت سودہ ضعیف العمر تھیں اور اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دے چکی تھیں۔ ان دو کو الگ کرنے کے بعد ۴ھ میں حضور کی صرف تین بیویاں تھیں۔ ۵ھ میں ایک کا اضافہ ہوا۔ ۶ھ میں ایک کا اور اضافہ ہوا۔ ۷ھ میں مزید تین ازواج حرم نبوی میں داخل ہوئیں۔ اس طرح آخر عمر میں حضور کی صرف آٹھ بیویاں ایسی تھیں جن کے ساتھ آپ کے شب باش ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ اس سے بھی اس قیاس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے جو مجملاً ۹ یا ۱۱ ازواج کے ساتھ ہم بستر ہونے کے متعلق قائم کیا گیا ہے۔

بدرجۂ آخر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں میں ہر بیوی کے ساتھ ایک ہی رات شب باشی کی۔ اگر یہ واقعہ بھی ہو، تو ایک ایسے تندرست اور صحیح القویٰ انسان کے لیے یہ امر کچھ بھی فوق العادہ نہیں جس نے تمام عمر تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کی ہو اور اپنے جسم کی قوتوں کو خیالات فاسدہ اور افعال قبیحہ میں کبھی ضائع نہ کیا ہو۔ یہ امر اگر تعجب انگیز ہو سکتا ہے تو ان کے لیے جنہوں نے جوانی میں اپنی قوتیں ضائع کیں اور بڑھاپا آنے سے پہلے بوڑھے ہو گئے۔ حضور ایک کامل انسان تھے۔ تمام قوتیں آپ کے اندر غایت درجہ کے اعتدال پر تھیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا دماغ رکھنے والے انسان میں رجولیت کی قوت کا بھی کمال درجہ پر ہونا ایک طبی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پھر اس طاقت کی حفاظت آپ نے ایسی کی کہ ساری جوانی صرف ایک بیوی کے ساتھ گذاردی اور کبھی آپ کی پرہیزگاری میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ پچاس کے لگ بھگ عمر میں آپ

ند تعالیٰ کے حکم سے اپنے مخالفین کو چیلنج دیتے ہیں کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ۔ میں
ہمارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں، کسی نے میرے کیرکٹر میں کوئی خرابی دیکھی ہو تو بتائے۔
وہ جو حضور کی جان کے دشمن، خون کے پیاسے تھے، ان میں سے بھی کوئی یہ کہنے کی جرأت
ر سکا کہ محمدؐ! فلاں موقع پر تم سے فلاں کمزوری سرزد ہوئی تھی۔ پس ایک طرف کمال رجولیت
ساتھ اس پرہیزگاری کو دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا آخر عمر میں اتنی عورتوں کے
ساتھ شب باشی پر قادر ہونا کوئی فوق العادہ بات نہیں ہے، اور دوسری طرف اس قدر
با وجود عہد شباب میں آپ کے کمال تقویٰ کو دیکھ کر ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ حضور کس قدر
ضابط تھے اور اپنے نفس کو قابو میں رکھنے کی کتنی زبردست طاقت آپ نے پائی تھی۔

رہی وہ بات جو حضرت انس نے فرمائی ہے کہ آپ کو تیس یا چالیس مردوں کی قوت عطا
گئی تھی، تو وہ نہ حضور کا کوئی قول ہے، نہ کوئی مستند بات۔ حضرت انس خود فرماتے ہیں کہ ہم آپس
میں ایسا کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت نوجوان تھے اور اپنے ہم عمر دوستوں ہی میں
اس قسم کی گفتگو کرتے ہوں گے۔ عنفوان شباب میں عموماً لوگ رجولیت کی زیادتی کو خاص عزت
کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، پھر حضرت انس تو اُس زمانہ کی عربی سوسائٹی کے ایک نوجوان تھے جس میں
رجولیت کی زیادتی انسانیت کا ایک قابل فخر جوہر سمجھی جاتی تھی۔ اگر انہوں نے اپنے محبوب آقا میں
اس کی غیر معمولی شخصیت سے وہ بے حد مرعوب بھی تھے، اس فخر کے قابل جوہر کا ادعا کیا تو یہ ایک
بات امر فطری ہے۔ بڑے آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوا ہی کرتا ہے کہ جو لوگ ان کی غیر معمولی
شخصیتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں وہ ان کی ذات میں فوق البشری طاقتوں کے
معتقد ہو جاتے ہیں۔ مگر ایسے معتقدات اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو حجت بنا کر ان پر استدلال
عمارتیں کھڑی کی جائیں۔

حضرت انس نے تو صرف اسی قدر کہا کہ حضور کو ۳۰ یا ۴۰ مردوں کی طاقت عطا کی گئی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر بعض دوسری روایتوں میں جن کو ابونعیم اور احمد اور نسائی اور حاکم نے نقل کیا ہے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ چالیس مرد جن کی قوت حضور کو عنایت کی گئی تھی دنیا کے نہیں بلکہ جنت کے مرد ہیں، اور جنت کے ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کے برابر قوت حاصل ہوگی۔ اس طرح چالیس کو سو سے ضرب دے کر حساب لگا لیا گیا کہ حضور میں چار ہزار مردوں کی قوت تھی۔ یہ سب باتیں خوش عقیدگی پر مبنی ہیں، اور ایسے لوگوں نے کہی ہیں جو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت سے کمال درجہ متأثر ہو کر آپ کے اندر ایسی تمام فوق البشری طاقتوں کا اعتقاد رکھتے تھے جن کو نیک نیتی کے ساتھ وہ فخر کے قابل سمجھتے تھے۔ انہی باتوں کو ایک فاضل بزرگ نے، جن کے علم و فضل اور تقویٰ کا پورا پورا احترام ہمارے دل میں ہے اپنے ایک مضمون میں نقل کر دیا، اور استدلال کی عمارت اس طرح قائم کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۴ ہزار مردوں کی طاقت رکھتے تھے، اور اس طرح ۱۲ ہزار بیویاں رکھنے کے مستحق تھے، مگر آپ نے صرف گیارہ بیویوں پر قناعت فرمائی۔ یہ بات اگرچہ حسن عقیدت کے رنگ میں کہی گئی تھی، لیکن ایسی بات خواہ کسی کے قلم سے اور کسی نیت سے نکلے بہر حال ہم یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتے کہ اللہ کے نبی کی قوت باہ کا حساب لگانا مذاق سلیم پر بھی بار ہے، کجا کہ اس کو دشمنان اسلام اور متشککین اور مذبذبین کے مقابلہ میں حجت کے طور پر لایا جائے اور ان کے سامنے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کرشن اور ہندو دیوتاؤں کے رنگ میں پیش کر کے یہ امید کی جائے کہ اس قسم کی باتوں سے ان کے دلوں میں نور ایمان پیدا ہوگا۔ آنحضرت کی کثرت ازواج پر مخالفین کے اعتراضات کی تردید بہت سے قوی دلائل سے ہو سکتی تھی۔ ان سب کو چھوڑ کر یہ طرز استدلال اختیار کرنا یقیناً افسوس ناک ہے، خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ علم اور علماء کے دشمن ذرا ذرا سی لغزشوں

سب وشتم اور بدزبانی کے تیر چلانے کے لیے ہر وقت مستعد بیٹھے رہتے ہیں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے کہ دعوت اسلام میں "حکمت" کو ملحوظ رکھنا سب باتوں پر مقدم ہے۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔ مگر یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اس ہدایت کی پیروی میں ہمارے اکابر تک سے لغزشیں ہو رہی ہیں۔ اور ان کی وجہ سے علماء دین کا وقار روز بروز کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

تقریظ و انتقاد

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش

خطبات خالدہ ادیب خانم

یہ خالدہ ادیب خانم کے ان آٹھ خطبات کا اردو ترجمہ ہے جو موصوفہ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دعوت پر دہلی میں دیے تھے۔ جامعہ کے فاضل پروفیسر، ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان خطبات کو اردو کا جامہ پہنایا ہے اور چھوٹی تقطیع کے تقریباً (۳۰۰) صفحات میں اس مجموعہ کو مکتبہ جامعہ ملیہ نے شائع کیا ہے قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ قرول باغ دہلی۔

دنیائے اسلام میں اس وقت دو ملک ایسے ہیں جن کو دو مختلف حیثیتوں سے مسلمانان عالم کی پیشوائی کا مرتبہ حاصل ہے۔ ذہنی حیثیت سے مصر، اور سیاسی حیثیت سے ٹرکی۔ مصر کے ساتھ امم اسلام کے تعلقات نسبتاً زیادہ گہرے ہیں، کیونکہ اس کی زبان ہماری بین الملی زبان 'عربی ہے' اس کا لٹریچر تمام دنیا کے مسلمانوں میں پھیلتا ہے، اس کے ذہنی اثرات چین سے مراکش تک پہنچتے ہیں، اور وہی مسلمان قوموں کے درمیان ربط اور تفاہم اور واقفیت حالات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بخلاف اس کے ترکی قوم کی مجاہدانہ زندگی، اور مغربی تعدیات کے مقابلہ میں اس کی شجاعانہ مدافعت، اور ناموس ملی کے لیے اس کی قربانیوں کا سکہ تو بلاشبہ تمام عالم اسلامی پر بیٹھا ہوا ہے، اور اسی وجہ سے اس کو مسلمانوں میں سرداری اور پیشوائی کا منصب حاصل ہے لیکن زبان کی اجنبیت، اور ربط و تفاہم کے فقدان نے ٹرکی اور اکثر ممالک اسلامیہ کے درمیان ایک گہرا پردہ حائل کر دیا ہے جس کے

سبب سے ترکی قوم کے ذہنی ارتقاء اور اس کی دماغی ساخت اور اس کے تمدنی، سیاسی، مذہبی اور علمی تحولات کے متعلق ہماری واقفیت بہت محدود ہے۔ خصوصاً حال کے دس بارہ برسوں میں جو انقلابات ترکی میں رونما ہوئے ہیں۔ ان کے باطنی اسباب اور ان کی اصلی روح کو جاننے اور سمجھنے کا موقع تو ہمکو بہت ہی کم ملا ہے۔ بہت سے لوگ ترکوں سے سخت ناراض ہیں، بعض ان کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہیں۔ بعض ان کی مغربیت کو اپنی مغرب پرستی کے لیے برہان قاطع بنائے بیٹھے ہیں۔ مگر مستند معلومات کسی کے پاس بھی نہیں ہیں، اور جو تھوڑی بہت معلومات ہیں بھی تو وہ ترکی جدید کی روح کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔

اس حالت میں ہم اس کو خوش قسمتی سمجھتے ہیں کہ خود ترکی جدید کے معماروں میں سے ایک ایسی ہستی نے ہندوستان آکر ہمارے سامنے اپنی قوم کے باطن کو ظاہر کیا ہے جو انقلاب کے محض ایکٹر ہی نہ تھی، بلکہ اس انقلاب کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت تھی، اور اس کے ساتھ عالمانہ نظر، اور فلسفیانہ فہم، اور مفکرانہ تعمق بھی رکھتی تھی۔ اس کی بدولت پہلی مرتبہ ہمیں ترکی کو سمجھنے کا موقع ملا ہے۔ اس نے ترکی جدید کی روح کو ہمارے سامنے بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے صداقت اور دیانت کے ساتھ ہم کو بتایا ہے کہ جو قوم آج دنیائے اسلام کی نہ صرف سیاسی رہنمائی کر رہی ہے، بلکہ ذہنی رہنمائی کے لیے بھی کوشاں ہے، وہ درحقیقت خود اپنے باطن میں کیا ہے، کن عناصر سے اس کی تعمیر ہوئی ہے کونسی قوتیں اس میں کام کر رہی ہیں، کون سے اسباب اس کو موجودہ مقام تک کھینچ کر لائے ہیں اور اب کس رخ پر وہ جا رہی ہے۔ یہ مستند ذخیرۂ معلومات مختلف حیثیتوں سے ہمارے لیے مفید ہے۔ اس کا صرف یہی ایک فائدہ نہیں ہے کہ ترکی قوم کا حقیقی حال ہم پر روشن ہو گیا بلکہ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ترکی سے جو رہنمائی اب ہماری جدید نسلوں تک پہنچ رہی ہے اس کی روح کو ہم زیادہ بہتر طریقہ سے سمجھ سکتے ہیں اور دنیائے اسلام میں

جو انقلاب اس وقت رونما ہو رہا ہے اس کے اندرونی اسباب کو سمجھنے کا ایک اور موقع ہم کو مل جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم خالدہ ادیب خانم کے ذریعہ سے ترکی جدید کو سمجھیں ہمیں خود ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان کا دل پورا پورا مسلمان ہے، ایمان سے لبریز ہے اور ایمان بھی ایسا جس پر ہم کو رشک کرنا چاہیے، کیونکہ وہ ایک مجاہد عورت کا ایمان ہے۔ الحاد اور بے دینی کا شائبہ تک ان کے خیالات میں نہیں پایا جاتا۔ اسلام سے ان کو محبت ہے، ویسی ہی محبت جیسی ایک سچی مسلمان عورت کو ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا دل جیسا مسلمان ہے، ان کا دماغ ویسا نہیں ہے۔ انہوں نے تمام تر مغربی طرز کی تعلیم پائی ہے، مغربی علوم ہی کا مطالعہ کیا ہے، مغربی عینک ہی سے دنیا اور اسلام اور خود اپنی قوم کو دیکھا ہے اور ان کی تمام فکری اور نظری قوتیں مغربی سانچے ہی میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی چھپی ہوئی اسلامیت اور مشرقیت نے مغربیت کے اس دماغی استیلاء کی بہت کچھ مزاحمت کی ہے، اور اسی مزاحمت کا نتیجہ ہے کہ ترکی قوم کے دوسرے انقلابی لیڈروں کی بہ نسبت ان کے خیالات میں بہت کچھ اعتدال پایا جاتا ہے، لیکن یہ مزاحمت ان کو مغربیت کے غلبہ سے نہیں بچا سکی ہے۔

اسلام کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود معلوم ہوتی ہیں۔ قرآن اور سنت نبوی اور تاریخ اسلام کے مطالعہ میں انہوں نے شاید اس وقت کا دسواں حصہ بھی صرف نہیں کیا ہے جو مغربی فلسفہ اور تاریخ اور عمرانیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ان کے خیالات کی جو جھلک ہم کو ان کے خطبات میں نظر آتی ہے، اس میں حسن عقیدت تو ضرور موجود ہے۔ مگر فہم اور تدبر اور بصیرت بہت کم ہے۔

اپنے آخری خطبہ میں وہ فرماتی ہیں کہ گاندھی جی کی ذات "جدید اسلام کا ایک مکمل نمونہ ہے"۔ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو نہیں جانتا کہ اسلام کیا ہے، جدید اور قدیم کی نسبتوں سے کس قدر

بالا و برتر ہے اور اس کا مکمل نمونہ کیسا ہوتا ہے۔ اسلامی سیرت کی خصوصیات پر جس شخص کی نظر ہو، اور جس نے اس سیرت کے مکمل نمونوں کی ایک جھلک بھی دیکھی ہو، اس کی نگاہ میں گاندھی جی کی تو کیا حقیقت ہے، تاریخ عالم کے بڑے سے بڑے ہیرو بھی نہیں جچتے اور یہ کچھ قومی عصبیت کی بنا پر نہیں ناقابل انکار تاریخی حقائق کی بنا پر ہے۔ ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، علی مرتضیٰؓ، حسینؓ ابن علیؓ، احمد ابن حنبل اور عبدالقادر جیلانیؒ کی سیرتیں سامنے رکھیے اور پھر انصاف سے دیکھیے کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر تاریخ عالم کی کونسی شخصیت اس قابل ہے کہ ان سیرتوں کے مقابلہ میں لاکر رکھی جاسکے۔

عثمانی قوم کے سیاسی مزاج کی ترکیب میں ان کو ترکی قوم کی قدیم نسلی خصوصیات لیکر یونان، بائیزنطائن، روم، حتیٰ کہ افلاطون کی جمہوریت تک، سب کے اثرات نظر آتے ہیں، مگر نہیں نظر آتے تو قرآن اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے اثرات۔ حالانکہ جس چیز نے وسط ایشیا کے بدوی ترکوں کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کیا، اور ان کے اندر جہاں کشائی کے ساتھ جہانبانی کی استعداد پیدا کی، اور ان کو نوع انسانی میں ایک تخریبی قوت کے بجائے ایک تعمیری طاقت بنادیا وہ یہی تعلیم تھی۔ خالدہ خانم زیادہ سے زیادہ اسلام کا جو اثر "عثمانیت" میں دیکھ سکی ہیں وہ محض اسلامی عدل و مساوات ہے مگر اس کا حال بھی یہ ہے کہ جب سلطان سلیم اپنی رعایا میں بزور شمشیر اسلام کو پھیلانا چاہتا ہے، اور شیخ الاسلام جمالی افندی اس کو اس فعل سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے، اور سلیم جیسا قہار فرمانروا اس حکم کے آگے سر جھکا دیتا ہے، تو اس عظیم الشان واقعہ میں خالدہ خانم کو اسلامی عدل کے بجائے "عثمانی قومیت" کا احساس اور "عثمانی اصول سلطنت" کی حمایت" کا جذبہ ہی نظر آتا ہے۔ وہ نہیں سمجھتیں کہ جمالی آفندی کے فتوے میں لا اکراہ فی الدین کی روح تھی، اسلامی حق پرستی کی طاقت تھی جس نے سلیم کے سامنے اس کو فتویٰ دینے کی جرءت

دلائی اور اسلام کی عظمت تھی جس نے سلیم کو اس شرعی فتوے کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور کر دیا

خالدہ خانم ترکی کے موجودہ حکمران طبقہ کی انتہاپندی، استبدادیت، معاشرت کی جبری تنظیم، حد سے بڑھی ہوئی مغربیت، مادہ پرستانہ رجحانات، اور مذہب کے متعلق اس کی روش سے بیزار معلوم ہوتی ہیں۔ وہ "مغربیت" اور "مشرقیت" کا معتدل امتزاج چاہتی ہیں۔ "مادیت" اور "روحانیت" میں مصالحت کی خواہشمند ہیں، اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتی ہیں کہ زندگی کے ان دونوں نظریوں میں جو امتزاج اسلام نے پیدا کیا ہے وہ سب سے بہتر ہے، مگر وہ خود اسلام میں پوری بصیرت نہیں رکھتیں، اس لیے ان کو نہیں معلوم کہ اصول اسلام کے تحت امتزاج کی صحیح صورت کیا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کا خط مستقیم کہاں واقع ہے تاہم اگر ان کی ذاتی آرا سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو ان کے خطبات میں ترکی کی جدید ذہنیت اور اس کے رجحانات، اور انقلاب کے تاریخی اسباب کا ایک صاف اور صحیح بیان مل جاتا ہے اور وہی ہم کو مطلوب ہے۔

ترکی قوم اسلام میں اس وقت داخل ہوئی جب مسلمانوں کے ذہنی انحطاط کا آغاز ہو چکا تھا۔ روح جہاد اگرچہ زندہ تھی، مگر روح اجتہاد مردہ ہو چکی تھی۔ اسلام میں بصیرت رکھنے والے مفکرین اور تفقہ سے بہرۂ وافر رکھنے والے فقہا، ناپید تھے، تہذیب اسلامی نیم جان اور فکر اسلامی قریب بے جان ہو چکی تھی، شریعت میں تقلید جامد کا غلبہ تھا، تمدن میں عجمیت اور رومیت کے عناصر پیوست ہو چکے تھے، تصوف پر اشراقیت، اور تفکر پر تفلسف کا اثر غالب آگیا تھا، قرآن اور سنت سے براہ راست اکتساب علم کرنے والے مفقود تھے، علماء زیادہ تر الفاظ کے گورکھ دھندوں میں پھنسنے والے، کلام کی پیچیدگیوں میں الجھنے والے، اور متقدمین کے روندے ہوئے رستوں پر شرح و ایضاح کے چھکڑے چلانے والے تھے۔ امراء اکثر و بیشتر قیصر و کسریٰ کے

ڈھنگ پر چلنے والے تھے۔ متصوفین اور روحانی پیشوا اسلام کے دور اول کی حقیقی صوفیت سے بیگانہ، اور راہبوں، جوگیوں اور اشراقی فلسفیوں کی پیروی کرنے والے تھے علوم و فنون میں مسلمانوں کی ترقی رک گئی تھی، تحقیق و اکتشاف کی راہ میں ان کے تقدمات قریب قریب ختم ہو گئے تھے، اور عروج کے بعد زوال کے آثار تمام ممالک اسلامیہ میں پیدا ہو چکے تھے۔

اس طرح اسلامی تاریخ میں ترکوں کی ابتداہی ایک بنیادی کمزوری کے ساتھ ہوئی۔ دولت عثمانیہ کا قیام تقریباً اسی زمانہ میں ہوا ہے جب یورپ میں ذہنی ارتقا اور علمی نہضت کا آغاز ہو رہا تھا۔ اگرچہ عثمانیوں نے ابتدائی دو ڈھائی صدیوں میں یورپ کو پیہم شکستیں دے کر اسلام کی دھاک بٹھا دی تھی، لیکن اس زمانہ میں عام مسلمان قوموں کے ساتھ ساتھ ترک بھی رفتہ رفتہ تنزل کی طرف جا رہے تھے، اور ان کا مقابلہ جن مغربی قوموں سے تھا وہ تیز رفتاری کے ساتھ مادی اور ذہنی ترقی کی راہ میں گام زن تھیں۔ سترھویں صدی عیسوی میں حالات نے پلٹا کھایا فرنگیوں کی عسکری تنظیم اور مادی و معنوی قوت اس حد تک بڑھ گئی کہ انہوں نے سینٹ گوتھرڈ کے معرکہ میں پہلی مرتبہ تنزل پذیر ترکوں کو نمایاں شکست دی۔ مگر ترکوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ وہ برابر گڑھے میں گرتے رہے اور فرنگی برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اٹھارھویں صدی میں ترکوں کی اخلاقی، مذہبی، سیاسی، علمی، اور تمدنی حالت انتہائی تنزل کو پہنچ گئی اور ان پر فرنگیوں کا غلبہ پوری طرح نمایاں ہو گیا۔

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرز جدید پر عسکری تنظیم، اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی

تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبّہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لیے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ استعمال کرنا ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ افندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو "قرآن کے خلاف" عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیدا کیا۔

زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے عین مقابل برسرپیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے، اور خود ان کی ماتحت یورپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں۔ مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری، اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے، ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں، اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی، بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کرے مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں، ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے، سلطان بے دین ہو گیا ہے، اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لیے خرابی ایمان کا موجب ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ترکوں کے اہل دماغ لوگوں میں اپنی قومی پستی کا عام احساس پیدا ہو چکا تھا۔ ان لوگوں نے مغربی قوموں کی ترقی کے اسباب پر غور کیا، ان کے علوم و آداب کا مطالعہ کیا، ان کی تنظیمات پر گہری نگاہ ڈالی، اور اپنی سلطنت کے قوانین، انتظامی امور،

تعلیمی ادارات اور حربی نظام میں ایسی اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی جن سے وہ مغربی قوموں کے دوش بدوش ترقی کر سکیں۔ خالدہ خانم کے بقول یہ وہ لوگ تھے جن کے رگ وپے میں اسلامیت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے دل اور دماغ دونوں مسلمان تھے۔ ان میں اپنی کمزوری کا احساس ضرور تھا مگر مغرب کے مقابلہ میں کمتری کا احساس ہرگز نہیں تھا وہ مغرب سے مرعوب نہ تھے بلا امتیاز اس کی ہر چیز کو قبول کرنے والے نہ تھے ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ مغرب کی مفید چیزوں کو لے کر اپنی سلطنت اور اپنی قوم کی کمزوریوں کو دور کر دیں، اور زندگی کے میدان میں یورپ کے ساتھ برابر کی مسابقت کر سکیں انھوں نے سلطان عبدالمجید کے زمانہ میں نظام سلطنت کی اصلاح اور فوج کی تنظیم کیا۔ اپنی قوم کے ادبیات میں زندگی کی نئی روح پھونکی نئے مدارس اور کالج قائم کیے، اور چند سال کے اندر ایک ایسی نسل تیار کر دی جس میں اسلامی تہذیب کے تمام جوہر کے ساتھ تفکر و تدبر کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی موجود تھیں سلطان عبدالعزیز کے عزل (۱۸۷۶ء) تک اس گروہ نے بے شمار خارجی و داخلی مشکلات کے باوجود تعمیر ملت کا بہترین کام انجام دیا اور اس کے ثمرات عمر پاشا جیسے جنرل، مدحت پاشا جیسے مدبر اور نامق کمال اور عبدالحق حمید جیسے سچے مسلمان اہل فکر و ادب کی صورت میں ظاہر ہوئے۔

لیکن سلطان عبدالحمید نے آکر دفعتاً حرکت کا رخ بدل دیا۔ ۱۸۷۶ء سے لیکر ۱۹۰۹ء تک ۳۳ سال کا زمانہ جس میں ایک دوسری مشرقی قوم (جاپان) ترقی کر کے کہیں سے کہیں پہنچ گئی، اس خود غرض سلطان نے محض اپنے شخصی اقتدار کی خاطر ترکی قوم کی علمی، ذہنی، تمدنی اور سیاسی و تنظیمی ترقی کو روکنے اور اس کی روح کو مردہ کرنے میں صرف کر دیا۔ یہاں موقع نہیں کہ اس شخص کے اعمال پر کوئی تفصیلی تبصرہ کیا جا سکے۔ مختصر یہ ہے کہ اس نے تعمیر کے بہترین زمانے کو جس کی ایک ایک ساعت بیش قیمت تھی، تخریب میں کھو دیا اس نے ترکی قوم کے بہترین دماغوں کو برباد کیا، جمال الدین افغانی جیسا بے نظیر آدمی اسے ملا

اور اس کو بھی اس شخص نے ضائع کر دیا، مگر سب سے بڑا نقصان جو اس کی بدولت نہ صرف ترکی قوم بلکہ دنیائے اسلام اور خود اسلام کو پہنچا وہ یہ تھا کہ اس نے خلافت، مذہبی اقتدار اور رجعت پسند علماء و مشائخ کے اثرات کو عہد تنظیمات کے ترکی مصلحین کی اٹھائی ہوئی بنیادیں اکھیڑنے، اور ترکی قوم کے ادبی و ذہنی ارتقاء کو روکنے، اور سیاسی و تنظیمی اصلاحات کا استیصال کرنے کے لیے استعمال کیا، جس سے ترکوں کی نئی نسل میں ایک عظیم بحران پیدا ہوگیا، وہ مذہب کو مانع ترقی سمجھنے لگے، اسلامیت سے ان کے دماغ منحرف ہو گئے، تاریک خیال علماء اور مشائخ سے بجا طور پر جو نفرت ان کے دلوں میں پیدا ہوئی تھی اُس کے جوش میں اس کا رخ مذہب کی طرف پھر گیا، وہ سمجھے اور جاہل علماء و مشائخ نے ان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے، زمانہ کی رفتار کے ساتھ حرکت کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں، اس کے قوانین تغیرات احوال کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور بجز چند عقائد کے اس میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی پائیداری رکھتی ہو۔ اس ۳۲ برس کے استبداد نے، جو بدقسمتی سے مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا، ترکوں کی نئی نسلوں میں مادہ پرستی، دہریت، مغرب سے کامل مرعوبیت، مغربی تخیلات کی اندھی تقلید، اپنے ماضی سے نفرت، ہر قدیم چیز سے بیزاری اور خلافت و وحدت اسلامی سے (جس کو سلطان عبدالحمید نے اپنی اغراض کا آلہ بنایا تھا) کراہت تام پیدا کر دی، اور ان کے اندر یہ خیال راسخ کر دیا کہ دنیا میں سربلندی حاصل کرنے کے لیے تمام پچھلی بنیادوں کو ڈھا کر بالکل مغربی طرز پر ترکیت کا قصر تعمیر کرنا ضروری ہے۔

۱۹۰۸ء کے انقلاب نے سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور سلطنت عثمان اقتدار ان منحرف ذہنیت رکھنے والے جوشیلے اور مشتعل نوجوانوں کے ہاتھوں میں آگئی۔ ادیب خانم کے بقول یہ لوگ عہد تنظیمات کے اصلاح پسندوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان میں ایک

ں نہ تھا جو علمی قابلیت، تدبر و تفکر اور عالی دماغی میں وہ تنظیمات کے مدبرین کی ٹکر کا ہو۔
ن کے پیش نظر وہ بلند نصب العین تھے، نہ ان کی سیرتوں میں وہ مضبوطی تھی، نہ شائستگی
تربیت کے لحاظ سے ان کا اُن سے کوئی مقابلہ تھا نہ قومی فخر و ناز کا وہ جذبہ ان میں
ا دتھا، نہ تنقید کی وہ صلاحیت تھی کہ قدیم اور جدید کے صحیح فرق کو سمجھ سکیں۔ یہ چند ایسے
و انوں کا مجمع تھا جو اسلامی علوم میں کورے تھے، اسلامی تربیت میں ناقص تھے، مغربی علوم میں
ہ کوئی گہری نظر نہ رکھتے تھے، اپنے مذہب اپنی تہذیب، اپنے علوم و آداب، اور اپنی قدیم
اعی تنظیمات کے خلاف ان کے دل و دماغ میں تعصب کا گہرا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، مغرب کے
مات سے مرعوبیت ان کے اندر بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی تھی اور یہ اپنی ہر چیز کو مغرب کی چیز
بدل دینے کے لیے بے چین تھے جب سلطنت ان کے ہاتھوں میں آئی تو یہ بند پانی جس کو ۳۲ برس
ابیل ہنڈش نے بہت کچھ فاسد کر دیا تھا، طوفان کی شکل میں پھوٹ نکلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں
ں پر نیشنلزم اور طورانی عصبیت کا جن سوار ہوا، وحدت اسلامی کی طرف سے سرد مہری ظاہر ہونی
ع ہوئی مذہب پر نکتہ چینی کا آغاز ہوا، قدیم تہذیب کو مٹا کر مغربی تہذیب کو بالکلیہ اختیار
لینے پر زور دیا جانے لگا، ماضی سے تعلق منقطع کرنے اور مغرب سے قریب تر ہونے کے لیے
ینی رسم الخط اختیار کرنے کی تجویز پیش ہوئی، جدید نظریات کے مطابق اسلام کو ڈھالنے کے لیے
یاری علماء کا ایک گروہ اٹھا جس کا سرغنہ ضیا کوک الپ جیسا شخص تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے اتحاد اسلامی
مقابلہ میں اتحاد طورانی کی زبردست تبلیغ کی، ترکوں کو عہد اسلامی کی ترکی تاریخ اور اس کے
ہ بہادروں سے نفرت دلا کر قدیم وحشی تاتاریوں پر فخر کرنا سکھایا (جن میں چنگیز اور ہلاکو
ستیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں)، ترکی زبان کو اسلامی ادب کی خصوصیات سے پاک کرنے
نش کی، اور تمدن، معاشرت تہذیب و اطوار اور عملی زندگی کے تمام شعبوں میں مغر

کی پوری تقلید کرنے پر زور دیا۔ یہ خیالات رکھنے والا شخص، جدید انقلابی جماعت کا
مجتہد بن کر اٹھا اور اس نے کوشش شروع کی کہ اپنے متبعین کے ساتھ مل کر اسلامی تعلیم
کی ایسی تعبیر کرے جس سے چند گنے چنے عقائد اور اخلاقی اصولوں کے سوا اسلام کی ہر چیز
کو قابل تغیر ثابت کر کے مغربی سانچے میں ڈھال دیا جا سکے۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتدا ہو رہی تھی، دوسری طرف
ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی ساتویں صدی کی فضاء سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے
ان کے جمود، ان کی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے
ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا۔ وہ اب بھی کہہ رہے
تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ ان کی آنکھوں کے سامنے
الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ اور کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے
میں مشغول تھے جن کو پھینک کر زمانہ پانچ سو برس آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں
میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنائے جا رہے تھے جن کو سن کر سو برس
پہلے تک کے لوگ تو سر دھنتے تھے، مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر نہ صرف ان مفسرین و محدثین
بلکہ خود قرآن و حدیث سے منحرف ہو جاتے ہیں، وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں
وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں خواہ اس اصرار
کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک اُن قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنت
رسول میں مقرر کیے گئے ہیں۔

غرض ایک طرف علما اور مشائخ اپنی اسی روش پر قائم رہے، جو ترکی قوم کو سو برس
اندر تنظیمات کے مقام سے ہٹا کر انقلابیت کے اِس مقام تک کھینچ لائی تھی، اور دوسری

ترکی قوم کے انقلابی لیڈروں سے مسلمان ہونے کے باوجود، دماغ اور فکر وعمل کی واقعی دنیا میں اسلام سے دور اور دور تر ہوتے چلے جارہے تھے۔ اسی زمانہ میں جنگِ عظیم پیش آئی جس میں عرب اور ہندوستان کے بدقسمت مسلمانوں نے اعدائے اسلام کے ساتھ مل کر ترکوں کے گلے کاٹے پھر جنگِ عظیم کے بعد جب ترکوں نے اپنی حیات قومی کو کامل تباہی سے بچانے کے لیے جدوجہد شروع کی تو اس میں سب سے زیادہ ان کی مخالفت جنہوں نے کی وہ خلیفۂ وقت اور شیخ الاسلام تھے۔ یہ آخری ضربات انقلابی ترک کی نیم جان اسلامیت کے لیے فیصلہ کن تھیں۔ انہی کا نتیجہ ہے جو آج ہمکو ترکی جدید کی غیر معتدل تجدد پسندی کی شکل میں نظر آرہا ہے ۱۹۰۸ء میں جو انقلابی خیالات خام تھے، اور جن کو جنگ طرابلس، جنگ بلقان، جنگ عظیم اور حملہ یونان کی مشغولیتوں نے پختہ ہونے سے روک رکھا تھا وہ لوزان کانفرنس کے بعد پختگی کو پہنچ گئے اور عملی شکل اختیار کرنے لگے۔ تمدن ومعاشرت میں کامل مغربیت، زبان اور ادب اور سیاست میں انتہا درجہ کی جنسی عصبیت، الغائے خلافت کے بعد مذہب وسلطنت کی تفریق اور پھر خالدہ خانم کے بقول سلطنت کو مذہب سے آزاد کرکے مذہب کو سلطنت کا پابند بنا دینا اسلامی قانون کے بجائے سوئٹزرلینڈ کا قانون اختیار کرنا، وراثت اور طلاق وغیرہ مسائل میں قرآن کے صریح احکام تک کو بدل ڈالنا، عورتوں کو اسلامی تعلیم کے بالکل خلاف اس آزادی کی رو پر ڈال دینا جس پر جنگ عظیم کے بعد یورپ کی عورتیں چل رہی ہیں یہ سب قدرتی نتائج ہیں جاہل علما کے جمود، اور ہوا پرست صوفیا کی گمراہی، اور خلافت کے منصب سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے سلاطین کی خود غرضی، اور انقلابی لیڈروں کی قرآن وسنت رسول کے علم سے کلی جہالت کے۔ افسوس کہ اس صدی میں ترکی قوم نے ایک بھی ایسا شخص پیدا نہیں کیا جو قرآن میں بصیرت رکھنے والا اور اسلامی تعلیم کی حقیقی روح کو سمجھنے والا ہوتا، اور زمانے کے متغیر

قواعد

الترجمان القرآن بالعموم ہر قمری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینے کے آخر تک جن حضرات کے پاس نہ پہنچے وہ دوبارہ طلب کر سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایت وصول ہوگی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا جو حضرات اپنی جائے قیام بدل رہے ہوں یہ تبدیلی تحریر انہیں اپنے پتہ کی اطلاع دفتر کو بھیج دینا چاہیئے ورنہ پرچہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے خط و کتابت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور منی آرڈر نمبر خریداری اور چیز ہیں۔

اشاعت کے لیے مضامین [illegible] تمام ایڈیٹر کے نام بھیجنا چاہیئے لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بہاء الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

پرنٹر پبلشر سید ابوالاعلیٰ مودودی — مطبوعہ عظیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن

قوموں کی ہلاکت کا سبب

ایک آیت کے مفہوم کی تحقیق

از جناب مولوی ابواللیث شیر محمد صاحب ندوی

نگار ماہ اکتوبر کے تازہ پرچہ میں، زلزلہ کوئٹہ کے متعلق ایک اہم استفسار درج ہے جس کا مدیر نگار نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا ہے۔ یہ جواب کہاں تک صحیح ہے؟ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن چونکہ سائل اور مجیب دونوں کی طرف سے قرآن کی ایک آیت ضمناً معرض بحث میں آگئی ہے اور مدیر نگار نے اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے اس لیے اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اِذَا اَرَدْنَا اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيْرًا، الآیۃ" متفسر نے اس آیت پر یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر کوئٹہ کا زلزلہ اہل کوئٹہ کی بداعمالیوں کی وجہ سے آیا تھا، لیکن مدیر نگار نے آیت کے اس مفہوم سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ خدا خود بربادی چاہتا ہے اور لوگوں کی ..... وعصیان کاری کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے تو یہ نہ صرف صفات خداوندی کے خلاف ہوگا۔ بلکہ دیگر آیات قرآنی کے بھی منافی ہوگا"

یہ دیکھکر واقعی مجھے خوشی ہوئی کہ عربی سے ناواقف حضرات عموماً اس آیت میں جس غلط فہمی کا شکار ہوتے ہیں، اس غلط فہمی کا شکار مدیر نگار صاحب نہیں ہوئے لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھکر حیرت